مگر یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ یہ سلطنتیں پیدا کس زمانے میں ہوئی تھیں، شاید ہندوستان کی سلطنت نے مصری سلطنت کیلئے نمونے کا کام دیا ہوگا۔ مگر ہندوستانیوں کی مقدس تحریریں بھی اس معاملے پر کوئی روشنی نہیں ڈالتیں عله اس زمانے کے بعد سے تاریخ نے بہت سی سلطنتوں کا آغاز و انجام دیکھا ہے اور اس لئے ان کے عروج و زوال کے متعلق ہمیں محض قیاس و تخمین کی نسبت تاریخ کے ذریعے سے زیادہ معلومات حاصل ہیں۔ تمام قدیم یورپی سلطنتیں صدیاں گزر گئیں کہ فنا ہو چکی ہیں اور تقریباً تمام قدیم ایشیائی سلطنتوں کا بھی یہی حال ہو چکا ہے حال کی سلطنتوں میں بیشتر ایسی ہیں جو اس زمانے میں قائم ہوئی ہیں جسکا علم تاریخ کو حاصل ہے ان میں سے اکثر ابھی بالکل نو عمر ہیں۔ اگرچہ تمام روحانی اور جسمانی تخلیق کے مانند ان سلطنتوں کی قوت تخلیق بھی ایک خدائی راز کی طرح پوشیدہ ہے مگر جو حالات و اثرات ان سلطنتوں کے وجود میں آنے کے باعث ہوئے ہیں وہ ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

لیکن بہر نوع سلطنت کے عروج کا طریقہ محض عظیم ذہنی و تاریخی دلچسپی ہی کا مظہر عجیب نہیں ہے بلکہ سلطنت کی تمام زندگی میں اس کا اثر برابر جاری رہتا ہے اور ایک بڑی حد تک دوسری سلطنتوں کے ساتھ اس کے تعلقات کا یقین بھی اسی سے ہوتا ہے۔

اس وجہ سے قانون عامہ کے مطالعے کے لئے سلطنتوں کی مختلف النوع آفرینش پر غور کرنا اس سے زیادہ اہم ہے جس قدر کہ شخصی قانون کے لئے حصول ملکیت کی مختلف صورتوں کی جانچ کرنا اہم ہے مگر اس زمانے کے لوگوں نے سابق الذکر تحقیقات سے بالکل ہی غفلت اختیار کر رکھی ہے حالانکہ موخر الذکر پر وہ بہت ہی توجہ کے ساتھ غور و فکر کرتے ہیں۔ ہم اس میں تین مختلف گروہوں کو تمیز کر سکتے ہیں:۔

عروج سلطنت کی تین تاریخی شکلیں۔

۱- اولین تکوین سلطنت، یعنی کسی قوم و ملک میں سلطنت کی بنا اس طرح پڑے کہ وہ کسی سابق سلطنت کی قائم مقام نہ ہو۔

---

عله۔ فرانسیسی مصنف دی توک وِل کی تصنیف "جمہوریت امریکہ میں" دیکھو انگریزی ترجمہ (Democracy in America) مترجمہ (Reene) حصہ اول باب دوم "تمام قوموں میں ان کی تکوین اول کے کچھ نہ کچھ نشانات پائے جاتے ہیں اور جو حالات بوقت آفرینش ان کے ساتھ تھے اور جنھیں ان کے عروج میں حصہ ملا ہے وہ ان کی ہستی کے تمام اخیر زمانے پر موثر ہوتے ہیں۔"

۲۔ اشکال ثانوی، یعنی سلطنت اپنی اندرونی حیثیت سے کسی ایک قوم کے ذریعے سے پیدا ہو مگر پھر بھی اس کا انحصار ایسی سلطنتوں پر ہو جو پہلے سے قائم ہوں اور اب یا تو باہم ملکر ایک ہو جائیں یا کئی مختلف سلطنتوں میں منقسم ہو جائیں۔

۳۔ تحریکی تکوین سلطنت۔ یعنی سلطنت کو تحریک و ہدایت خود اندرون سلطنت سے نہ ہو بلکہ بیرون سلطنت سے ہو۔

یہاں ہم صرف نئی سلطنتوں کے بننے کا ذکر کر رہے ہیں، اسے محض نظام سلطنت کے تغیر میں خلط ملط نہ کر دینا چاہیئے۔ بودین نے اس فرق پر بہت صحیح طور پر توجہ دلائی ہے، (وہ اس دوسری صورت کو "تبدل" کہتا ہے) قدیم رومی شاہی کے جمہوریت میں مبدل ہو جانے سے کوئی نئی سلطنت نہیں پیدا ہوئی اور اسی طرح دوبارہ جمہوریت کے شکست ہو جانے اور شہنشاہی کے قائم ہو جانے سے بھی کوئی نئی سلطنت وجود میں نہیں آئی۔ حکومت کی صورت کے تغیرات سے ایک ہی سلطنت کی زندگی کے مختلف زمانے ظاہر ہوتے ہیں، اس سے مختلف سلطنتوں کا آغاز نہیں ہوتا۔

---

# دوسرا باب

## تاریخی تکوین کی صورتیں

### (۱) تکوین اولین کی صورتیں

ایک بالکل نئی سلطنت کی تکوین

جن متعدد طریقوں سے کوئی سلطنت پیدا ہو سکتی ہے ان میں سب سے زیادہ اصلی طریقہ روما کی بنیاد کے افسانے سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہاں ہر چیز نئی ہے۔ بہت سی مختلف نسلوں کے اجزا اسے نکل نکل کر لوگ عام سرداروں کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور یہ سب متحد ہو کر ایک رومی قوم بن جاتے ہیں۔ غیر مزروعہ وغیر مستاعویہ اراضی پر قبضہ کیا جاتا ہے اور یہی زمین اس ابدمدت شہر کی بنیاد ہو جاتی ہے۔ اس افسانے سے ہمیں ایک بالکل ہی نئی تکوین کا تصور حاصل ہوتا ہے ایک انبوہ کا منتظم ہو کر ایک قوم کی شکل اختیار کر لینا ملک ارضی کے حصول سے قبل نہیں ہوتا بلکہ اول ہی سے ان کا تعلق شہر کے ساتھ قائم ہو چکتا ہے۔ دونوں اجزا متفق ہو جاتے ہیں اور دیوتاؤں کی مبارک دعاؤں کے ساتھ معاً سلطنت کی بنا قائم کر دی جاتی ہے اور نئے بادشاہ کی جانب سے رعایا کو فرامین عطا ہونے سے اور رعایا کی جانب سے ان کے قبول کئے جانے سے قانوناً سلطنت قائم ہو جاتی ہے۔ بادشاہ کا تکوینی خیال اور قوم کی سیاسی مرضی سلطنت کے قانون میں اس طرح یکجا ہو جاتی ہیں گویا وہ دونوں ایک متحد فعل ہیں اور سلطنت[۱]، یا ارادہ قومی مرضی کا ایک آزادانہ فعل ہو جاتی ہے

[۱] - لیئو اپنی "تاریخ عالم" (Weltgeschichte) میں لکھتا ہے کہ روما کی بنا میں معاہدہ ایک تخصیص

اس امر میں شک کرنے کی کافی وجہ ہے کہ آیا اس قسم کا سیاسی "عمل تکوین" فی الحقیقت کبھی واقع بھی ہوا اگرچہ اُس سلطنت کے تخیل کے یہ نہایت ہی کامل طور پر موافق ہے جو ہمہ تن تکمیل ہو کر اس طرح وجود میں آجائے گویا زیوس کے سر سے اتھینے پیدا ہو گئی۔

۲۔ ایک معین مملکت کے باشندوں کی تنظیم سیاسی

ثانیاً یہ کہ مملکت اور قوم دونوں موجود ہوں مگر قوم میں اس وقت تک الصاق سیاسی کا احساس نہ پیدا ہوا ہو۔ ایسے موقع پر جو شے سلطنت کو پیدا کرنے والی ہوتی ہے وہ قوم کی تنظیم ہے۔ اس کا بھی ایک نمایاں نمونہ قدیم افسانے میں ہمیں ملتا ہے۔ اہل ایتھنز اٹیکا زمین (آؤ توآخ تھونیس (A'v Jones) کے فرزند ہیں اور اتھینی سلطنتوں کے قیام سے صدیوں پہلے وہ اُس ملک میں رہتے تھے[1] اس سلطنت کا آغاز کیاک اوپس (Cecoops) کے زمانے سے سمجھا جاسکتا ہے جس نے ان اکھڑ[2] باشندوں کو اول اول دیوتاؤں کا احترام کرنا سکھایا، خاندان کا نظم برپا کیا، زراعت اور زیتون کے درخت لگانے کو رواج دیا، لوگوں کو قبیلوں یا خانوں میں ترتیب دیا اور حکومت اور عدل کو قائم کیا۔ ایک دوسرے قصے کے بموجب یہ تمام باتیں شاہ تھیسے اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں جس نے ملک کی منتشر جماعات کو ایک سلطنت کی صورت میں جمع کیا اور ایتھنز کو حکومت کا مرکز بنایا[3]۔ بہر حال دونوں بیانوں کے موافق سلطنت کا وجود میں آنا اسی طرح ہوا کہ اس قوم کی تنظیم کی گئی جو زمین کی مالک تھی۔ ۹۳۰ء میں آئسلینڈ کی سلطنت جمہوری کا قائم ہونا اس قسم کی تکوین سلطنت کی ایک نہایت معروف تاریخی مثال ہے کہ ایک خاص ملک میں قوم کی تنظیم سے کس طرح سلطنت قائم ہو گئی۔ اول اول اس جزیرے میں صرف کثیر التعداد سرداروں (گوڈون (Goden) کی منفرد آبادیاں تھیں۔ یہ آبادیاں آزاد گوڈورڈون (Godorde) کی زیر حکومت بستیاں تھیں جنہیں

---

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ جزو ہے اور فی الحقیقت رومی وضع قانون کی قدیمی صورت لازمی معاہدے کی رواجی شکل کو یاد دلاتی ہے، بایں ہمہ رومی قانون نفس واقعہ میں دو آزاد شخصوں کے درمیان کسی قسم کا معاہدہ نہیں ہے بلکہ بحیثیت مجموعی رومی قوم کا ایک واحد فعل ہے۔

[1] مختلف جماعتوں (یا ضلعوں) [2] سے اس طرح باہم مربوط ہو کر جو سلطنت بنی ہو اسے اہل ایتھنز زیونوی کیا (Suvoikid) کہتے تھے۔ اس مبحث پر دیکھو وشر (W. Vischer) کا مفید رسالہ "قدیم یونان میں سلطنتوں اور اجتماعوں کا قائم ہونا" جو بازل (Basel) میں ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔

ان کی عبادت گاہیں اور جائدادیں (Dingstatte) داخل تھیں مگر اس زمانے میں اُلف لیوٹ (Ulfljot) کی تجویز پر سرداروں کے اتفاق سے جزیرے کی تمام آبادی کے لئے ایک عام مجلس (Alding) قائم کی گئی اور قانون سازی اور انتظام عدالت کے لئے ایک مشترک ذریعہ مہیا کیا گیا اور سب سردار (Godorde) اس کے تابع ہوئے۔ اس طرح جزیرے کی آبادی ایک سلطنت والی قوم بن گئی۔

سلطنت کلیفورنیا کی بنا ہمارے ہمعصروں کی آنکھوں کے سامنے کی بات ہے یہ تکوین ممالک متحدہ امریکہ کی حدود کے اندر بسنے والی ایک نئی قوم کے برضائے باہمی اپنے لئے ایک مملکت قائم کرلینے کی عمدہ مثال ہے۔ سونے کی طمع تمام دنیا سے ہر قسم کے لوگوں کا ایک غیر متفق انبوہ جمع کر لائی تھی۔ انھوں نے یکم ستمبر ۱۸۴۹ء کو ایک موسس مجلس کیلئے قائم مقام منتخب کیے اور ۱۳ اکتوبر کو نئی سلطنت کا مجوزہ نظام قوم کی منظوری کے لئے پیش کردیا گیا۔ تمام تاریخ میں اس سے بہتر مثال اس امکان کے ثابت کرنے کے لئے نہیں ملسکتی کہ کس طرح افراد کے آزادانہ اتفاق سے ایک سلطنت بن سکتی ہے اور پھر بھی اگر اس واقعہ کو زیادہ غور سے دیکھئے تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ یہ فیصلہ بھی تمام افراد کے معاہدے پر منحصر نہیں تھا بلکہ کثرت کی مرضی پر اس کا انحصار تھا اور یہ کہ قوم (جماعت) کا اتحاد ضرورۃً پہلے فرض کرلیا گیا تھا۔ نظام سلطنت افراد کی مرضی سے نہیں بلکہ تمام آبادی کی مشترک مرضی سے پیدا ہوا تھا۔

ممالک متحدہ امریکہ کی موجودہ تعمیر سلطنت میں بھی تمامتر یہی خصوصیت رہی ہے۔ پہلے ایک "مملکت" کی پیمائش کرکے اسے آباد کاروں کے لئے کھول دیا ابتداءً وہ امریکہ متحدہ کا ایک صوبہ سمجھی جاتی رہی اور حکومت متحدہ اس کے انتظام کا سامان کرتی رہی، جب آبادی بڑھ گئی اور نشو پاکر ایک قوم کی شکل اختیار کرنے لگی تو اسے ایک نیا نظام سلطنت عطا ہوا اور کانگریس (مؤتمر) نے اس مملکت کو ایک نئی سلطنت تسلیم کرلیا۔

۳ کسی موجودہ قوم کا کسی مملکت پر قابض ہوجانا

زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ پہلے ایک قوم بن جاتی ہے اور بعد کو ہستی سلطنت کے دوسرے لابدی جزو کے طور پر وہ زمین پر قبضہ حاصل کرتی ہے۔ اسے قبضۂ مملکت کہہ سکتے ہیں۔

پس تکوین سلطنت کی پہلی صورت ہم فتح کو قرار دے سکتے ہیں جس سے اکثر کام لیا گیا ہے یعنی سلطنت قائم کرنے میں پہلے کوئی آباد ملک فتح کرلیا جاتا ہے۔

فتح

یہودیوں کی پہلی سلطنت، ڈوریا کی یونانی سلطنتوں کا ایک معتدبہ حصہ، اور جرمانی قوموں کی سلطنتیں جو رومی صوبوں اور سلاوی زمینوں پر قائم ہوئیں وہ سب کی سب اسی طرح وجود میں آئیں، اس صورت میں مفتوحہ ملک کے باشندوں پر فاتح قوم کی فوجی قوت کا غلبہ قائم کیا جاتا ہے، جنگ جہاں ایک طرف تباہی کا ایک آلہ ہے وہاں دوسری طرف ایک مثبت طاقت یعنی سلطنتوں کے پیدا کرنے کی قدرت بھی رکھتی ہے۔ جنگ حصول غلبہ اور مردانہ اقتدار کے صفات کو ترقی دیتی ہے اور ایک فتحیاب قوم، مفتوح ملک میں ایک نئی سلطنت قائم کرنے کی خصوصیت کے ساتھ قابلیت رکھتی ہے۔

جو سلطنتیں اس طریقہ سے پیدا ہوتی ہیں انھیں ابتدائے وجود میں بہت سی اندرونی نیز بیرونی مشکلات پر غالب آنا پڑتا ہے۔ اگر مسلح مخالفت کی تجدید نہ بھی ہو تو بھی عام طور پر فاتح و مفتوح کے تمدن میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے اور یہ کشمکش اس وقت تک جاری رہتی ہے، جب تک کہ مخلوط قوم کا سیاسی اتحاد مکمّل نہو جائے۔ اپنی جدید تنظیم کردہ قوم کو اس خطرے سے بچانے کے لئے حضرت موسیٰ نے یہود کو حکم دیا تھا کہ جو ارض مقدس خدا نے انھیں عطا کی ہے، اس کے تمام باشندوں کو آگ اور تلوار سے فنا کر دیں۔ بہت سی فاتح قومیں اس خطرے میں غرق ہو گئی ہیں اور مفتوح نسل کے اعلیٰ تمدن نے دوبارہ انھیں دبا لیا ہے۔

فتح طاقت ہی کے زور سے کیوں نہو مگر تمام قوموں میں وہ ہمیشہ سیاسی حق کا منبع سمجھی جاتی رہی ہے۔ سکندر اعظم کا مقولہ آج بھی صحیح ہے کہ فاتح قانون عطا کرتا ہے اور مفتوح اسے قبول کرتا ہے۔

طاقت و حق

جہاں بیرونی قوت نئے حقوق کے پیدا کرنے اور پرانے حقوق کے تباہ کرنے پر اس قدر قوی اثر ڈالتی ہو وہاں بالیقین نظم حقوق ہنوز نامکمل حالت میں ہوگا، لیکن فتح کی صورت کیسی ہی خشن کیوں نہو پھر بھی اس میں ایک اخلاقی وقعت شامل ہے۔ جس کی اہمیت وضع قوانین میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ قدیم اور خاصکر ٹیوٹونی قومیں جنگ کو ایک بڑا بین الاقوامی مقدمۂ قانونی اور فتح کو فاتح کے حق میں خدا کا فیصلہ سمجھتی ہیں علہ

علہ بلنچلی، "مطالعات" (Studien) صفحہ ۲۰۲ "جنگ قانون بین الاقوام کے برقرار رکھنے کی وہ بدہیئت شکل ہے جو اس وقت تک جاری ہے مگر اب یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ جنگ اس

اس وجہ سے کہ فتح سے محض جسمانی غلبے کا اظہار نہیں ہوتا تھا بلکہ اس اخلاقی قوت کی بھی تصدیق ہوتی تھی جو اقتدار سیاسی کو حق بجانب ثابت کرتی ہے۔ یہ خیال سلطنت کے تخیل جدید سے، جو اسے ایک انسانی تنظیم سمجھتا ہے، خلاف نہیں ہے لیکن فی الحقیقت ہر فتح حق کا ثبوت اور ہر شکست غلطی کا نشان نہیں سمجھی جا سکتی۔ آلات جنگ کا غلبہ اب کسی حیثیت سے بنائے حق نہیں خیال کیا جا سکتا۔ مگر عظیم تاریخی ارتقا کا نتیجہ جو وقتاً فوقتاً متخاصم قوموں کے مناقشے کو طے کر دیتا ہے، وہ وسیع فوجی اور سیاسی رفتار میں زمانے اور فطرت کا فیصلہ سمجھا جاتا ہے اور چونکہ اس میں اخلاقی اجزا کا عمل بھی ہوتا ہے اس لئے اسے تاریخ عالم کے فیصلے کی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ "دنیا کی تاریخ دنیا کا دیوان عدالت ہے" بعد میں حالت جدید کا تسلیم کیا جانا خواہ عہد نامہ صلح کے ذریعہ سے ہو یا باشندوں کی اختیاری اطاعت سے ہو، ابتدائی قبضے کے قانونی نقائص کو درست کر دیتا ہے [عا]

پرامن آبادکاری

زمین پر قبضہ کرنے کی ایک دوسری اور زیادہ پرامن صورت یہ ہے کہ کوئی سیاسی جماعت کسی غیر آباد یا کم ترقی یافتہ زمین پر نئی سلطنت قائم کرنے کی غرض سے جا بسے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں بہت سی یورپی نوآبادیوں کی یہی نوعیت ہے۔ اگر آبادکاری آبائی سلطنت کی نگرانی میں عمل میں آتی ہے تو وہ تخریجی تکوین سلطنت کی ایک مثال ہے (دیکھو اسی مقالے کا باب ہ ف ۱۔) لیکن اگر آبادکار اپنا ایک منظم اجتماع قائم کر چکے ہوں (جیسا کہ نیو انگلینڈ میں آبائے زائرین (Pilgrim Fathers) نے کیا) اور خاص اپنی کوششوں اور اپنی ذمہ داری سے ایسی زمین پر جو اب تک کسی سلطنت سے متعلق نہ ہو، ایک نئی جماعت قائم کریں تو یہ اصلاً و واقعاً ایک نئی سلطنت کی بنا ہوگی۔ اگر ملک کے قدیم وحشی باشندے نوآبادی کی مملکت میں رہیں تو دونوں آبادیوں کے درمیان تعلقات کے درست کرنے کی مشکلات تقریباً ویسی ہی سخت ہوتی ہیں جیسی

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کارروائی کی صرف تمہید ہے جو انسانیت کے لئے زیادہ قرین انصاف اور زیادہ سزاوار ہے [یہ خیال سب سے پہلے مشہور جرمانی شاعر شلر نے اپنی ایک نظم میں ظاہر کیا دیکھو جرمانی فلسفی ہیگل کی تصنیف "فلسفۂ حقوق" فقرہ ۳۴۰]

[عا] بلنچلی "اقوام جدیدہ" (Moderne Volker) فقرہ ۱۰۔ فتح سے ایک جدید پرامن قانونی حالت اس وقت تک نہیں پیدا ہوتی۔ جبتک کہ مفتوح اطاعت نہ قبول کرے یا صلح کا معاہدہ نہ ہو جائے۔

کسی مفتوحہ ملک میں ہوں مگر وحشی قوم پر متمدن قوم کی فوقیت لازماً آخر الذکر کے غلبے کا سبب ہو جاتی ہے ۔

# تیسرا باب

## (۲) تکوین ثانوی کی صورتیں

الف۔ متعدد سلطنتوں کے معاقدے سے ایک مرکب سلطنت کی تکوین

دو یا زیادہ سلطنتیں جنھیں انفرادی حالت میں رہ کر اپنے کمزور ہو جانے کا اندیشہ ہو یا جو ایک ہی قوم کے اجزا ہوں اور اس کے لئے قومی اتحاد کے حاصل کرنے کی خواہاں ہوں وہ باہم ایک جدید اور وسیع متحدہ سلطنت میں متفق ہو سکتی ہیں۔ اس کی بنا افراد کے معاہدے سے نہیں ہوتی بلکہ سلطنتوں کے معاہدے ایسے اتحاد کو قائم کرتے یا کم سے کم اس کے لئے راستہ تیار کرتے ہیں مگر ایک نئی مجموعی سلطنت اس وقت تک وجود میں نہیں آتی جبتک کہ اس کے لئے ایک متفقی نظام سلطنت نہ مرتب کر لیا جائے۔

سلطنت کی اس نئی صورت کی مثالیں بوئیوٹیا (Bœotia) کی قدیم یونانی مشترکیت میں، ایپامی نونڈاس کی اس ناکام کوشش میں جو اس نے آرکاڈیا والوں کو متحد کرنے میں کی تھی، پیلوپونیسیا کے محالفے میں، جو اسپارٹا کے تحت تھا، اور ایٹولیا اور اکییا کے معاقدات میں پائی جاتی ہیں۔ اطالیا میں معاقدہ سمتانی اور ازمنۂ وسطی کے آخری حصے میں جرمانیا کے تجارتی شہروں (Hause towns) کے معاقدات اہل سویزرلینڈ اور ولندیزی سلطنتوں کے مشترکیات سب اس کی مثالیں ہیں۔

اس طریق سے جو سلطنت پیدا ہوتی ہے، وہ مفرد نہیں بلکہ مخروج (یا مرکب) ہوتی ہے، کیونکہ مختلف سلطنتیں جن سے اس کی ترکیب ہوتی ہے وہ بحال خود برقرار رہتی ہیں اور صرف ایک نئے تعلق میں متفق ہو جاتی ہیں۔ چونکہ یہ تعلق ابتداءً قانون

سلطنت سے زیادہ معاہدہ سلطنت پر مبنی ہوتا ہے، اس لئے آئندہ نسلیں ایسی حالت متضاد کی وارث ہوتی ہیں جس میں متعدد سلطنتیں اصلاً ایک دوسرے سے بالکل آزاد ہوتی ہیں اور دوسرے اعتبارات سے اس مرکب سلطنت کی فی الواقع تابع بھی ہوتی ہیں۔ اس تضاد سے ایک مستقل عمل اور ردّ عمل (Reaction) پیدا ہوتا ہے اور اکثر مجموعی اور خصوصی میلان میں ایک طرح کا تصادم رونما ہوجاتا ہے۔

اگر اتفاق کا احساس زیادہ قوی ہوجاتا ہے اور مشترک تنظیم کو زیادہ نشوونما حاصل ہوجاتی ہے تو پھر معاہدہ سلطنت کی صورت کے بجائے آئینی قانون کی صورت قائم ہوجاتی ہے، اس امتیاز پر اتحاد سلطنت کی دو خاص شکلیں بنتی ہیں۔ یعنی مشترکیت (Confederation) اور متفقیت (Federtion) [1] دونوں مرکب سیاسی اجسام ہیں اور اس حد تک محالفہ (Alliance) محض سے، جس سے کوئی نئی سلطنت نہیں بنتی، مختلف ہیں۔ مگر اول الذکر میں سلطنتوں کے اجتماع میں معاہدے کی خصوصیت قائم رہتی ہے اور ثانی الذکر میں ایک اجتماعی سلطنت یا اتحاد بننے کی طرف میلان کی ترقی مضمر ہوتی ہے۔

۱۔ مشترکیت

متعدد سلطنتوں کو ایک سیاسی ارتباط میں جمع کرلینے سے، مشترکیت کم ازکم خارجی اعتبار سے ایک سلطنت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، اگر بایں ہمہ وہ ان مخصوص سلطنتوں سے جداگانہ مرکزی سلطنت کی صورت میں منتظم نہیں ہوتی؛ مجموعی سلطنت کا انتظام یا تو بہ حیثیت صدر کے کسی ایک سلطنت کو تفویض ہوجاتا ہے یا تمام مختلف سلطنتوں کے وکلا و نائبین کی جماعت کے سپرد ہوتا ہے۔ اسپارٹا اور ایتھنز کی سرگروہی (Hegemony) میں معاہدات یونان کی نوعیت اول الذکر قسم کی سی تھی، اور ثانی الذکر صورت ۱۸۴۷ء تک سویزرلینڈ کی مشترکیت اور ۱۸۱۵ء کی جرمانی مشترکیت کی تھی۔

۲۔ متفقیت

برخلاف اس کے متفقیت میں یہی نہیں ہوتا کہ اس کی بعض سلطنتیں اپنی اپنی جگہ پر بہمہ وجوہ منضبط ہوں بلکہ ایک منضبط و مشترک مرکزی سلطنت بھی ہوتی ہے متفقیت

[1] مقابلہ کرو فریمین کی "حکومت متفقی" جلد اول باب دوم صفحہ ۹-۱۵ "مقابلتی سیاسیات" صفحہ ۲۸۷ انگریزی مترجم۔

کے اختیارات منفرد سلطنتوں میں سے کسی ایک سلطنت کے ہاتھ میں نہیں رہتے، نہ ان سلطنتوں کی کسی مجلس کو سپرد ہوتے ہیں بلکہ وہ اپنے مخصوص متفقی اور قومی اعضائے کار پیدا کر لیتی ہے جن کا تعلق صرف اسی مجموعی جسم سے ہوتا ہے۔ اکیا کا معاقدہ جس میں قوم کی ایک مشترک مجلس بہ حیثیت جماعت وضع قوانین کے تھی، محالفے کے سردار کی حیثیت سے ایک متفقی سپہ سالار تھا اور متفقی مجلس شوریٰ عدالت موجود تھی۔ یہ معاقدہ ایک حد تک اس قسم کی متفقی سلطنت رہ چکا ہے۔ ازمنۂ جدیدہ میں سلطنت کی یہ شکل اولاً شمالی امریکہ کی سلطنہائے متحدہ میں پیدا ہوئی مگر ۱۷۸۷ء کے قانونِ اتحاد کے قبل اس کا اظہار کامل نہیں ہوا اس کے بعد سویزر لینڈ نے اپنے ۱۸۴۸ء کے متفقی نظام سلطنت میں اس کی نقل کی۔ ان دونوں نظامہائے سلطنت کا انحصار اب سلطنتوں کے کسی باہمی معاہدے پر نہیں رہا ہے، بلکہ ایک عام قوم اور ایک عام سلطنت کے مفہوم پر شامل ہے، جس کی تنہا مرضی سے نظام سلطنت کی ترتیب ہوتی ہے اور وہ قلیل التعداد جماعتوں بلکہ منفرد سلطنتوں تک سے بھی اطاعت کی خواہاں ہوتی ہے اس طرح مشترکیت کے ابتدائی درجہ کو چھوڑ کر متفقیت یا اتحاد کے اعلیٰ درجے پر قدم رکھدیا گیا ہے۔

مرکب سلطنت کی یہ دونوں شکلیں شاہیوں کی بہ نسبت جمہوریتوں کے لئے زیادہ موزوں ہیں اگر ہم شمالی امریکہ اور سوئٹزرلینڈ کے نظامہائے حکومت کی تاریخ کا مقابلہ اس کشاکش سے کریں جو جرمانی مشترکیت کی اصلاح کی بابت پیش آتی رہی ہے تو یہ امر صاف طور پر واضح ہو جائے گا[1]

جرمانی مشترکیت ایک متفقی شہنشاہی بنائی گئی

۱۸۶۷ء کی شمالی جرمانی مشترکیت اور ۱۸۷۱ء کی جرمانی شہنشاہی کے نظام سلطنت عملاً قانوناً فی الواقع جرمانیا کی مختلف سیاسی طاقتوں اور قوتوں کو ایک عام قومی دائرۂ عمل میں متحد کرتے ہیں لیکن اگر ہم اصول پر خیال کریں تو اس نظام سلطنت کی مثال اس تتلی کی سی ہے جو ابھی پوری طرح پر خول سے نکل نہیں چکی ہے ایک جانب اس کے ابتدائے کار کی صورت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام منفرد سلطنتوں یعنی بادشاہوں

---

[1] اس بحث پر خاص کر دیکھو ہیملٹن اور میڈسن کی تصنیف "(Federalist)" "اور ممالک متحدہ کے نظام سلطنت کی شرح مصنفہ اسٹوری، بلنچلی کی تصنیف "سوئٹزرلینڈ کے قانون متفقیت کی تاریخ" ج ۱۔ ص ۳۵۲، بوالعس کی سیاسیات ۱۸۶۳ء

نیز مجلسوں کے آزادانہ معاہدے سے اس کی ابتدا ہوئی ہے مگر دوسری جانب واقعے
کی حیثیت سے یہ نظام سلطنت پروسی حکومت اور (جرمانی قوم کے قائم مقام کی حیثیت
سے) شہنشاہی ڈایٹ کی ممنتوں کے اشتراک سے وجود میں آیا ہے۔ اس موقع پر معاہدہ
اور قانون کچھ عجیب طرح پر باہم ملگئے ہیں مگر مجلس متفقی (Federal council) میں
متحدہ سلطنتوں کی نیابت ابتک مشترکی جرمانی مجلس کی یاد دلاتی ہے۔ صدارت متفقی کا ابتدائی
لقب جو پروشیا کے تاج شاہی کو دیا گیا تھا اس میں بھی اس مشترکی خصوصیت کی صفت
پائی جاتی ہے، لیکن اگر ہم صدر کے واقعی اختیار خاصکر اس کے سپہ دار اعظم ہونے کے
لحاظ سے، اس اختیار پر نظر کریں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ شہنشاہی جرمانی کا سرتاج ہمارے
سامنے موجود ہے اور اب شہنشاہی کے نظام سلطنت نے ایسے شہنشاہ جرمانیا کے پرشوکت
لقب کے ذریعے سے تسلیم کر لیا ہے۔ شہنشاہی ڈایٹ کی تنظیم خیالاً اور عملاً دونوں طرح
پر شمالی امریکہ کی کانگریس (موتمر) اور سویٹزرلینڈ کی مجلس متفقی دونوں سے زیادہ متحدہ و مربوط ہے۔

جرمانی شہنشاہی اور جمہوری متفقیات کے فرق

جرمانی شہنشاہی کا نظام سلطنت جمہوری متفقیات سے جن اہم امور میں مختلف
ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(الف) اس نظام سلطنت کی رو سے مجموعی سلطنت کے بعض اعضائے اعلیٰ
کی ذات میں لازماً یا واقعاً منفرد ماتحت سلطنتوں کے مناصب حکومت بھی جمع ہو گئے ہیں۔
مثلاً جرمانی شہنشاہ پروسیا کا بادشاہ بھی ہے مجلس متفقی کے ارکان اور منفرد سلطنتوں کے
حکمران ایک ہی ہیں۔ شہنشاہی صدر اعظم اور نیز شہنشاہی کے اعلیٰ عہدہ داروں میں سے
بہت سے عہدہ دار وہی ہیں جو پروسیا کے وزیر ہیں۔ برخلاف اس کے متفقی سلطنتوں
میں یہ دونوں فرائض کلیتہً جدا ہوتے ہیں۔

(ب) متفقیات میں مختلف سلطنتیں طاقت اور وسعت کے لحاظ سے فی الواقع
ایک دوسرے کے برابر نہیں ہوتیں مگر اتحاد کے مقابلے میں بہت ہی کمزور ہوتی ہیں اور
اس اعتبار سے ایک دوسرے کے مثل ہوتی ہیں لیکن جرمانی شہنشاہی میں سلطنت پروسیا
باقی تمام شریک سلطنتوں کے مجموعے سے بھی زیادہ طاقتور ہے اور اس لئے اسے سب کا
سرتاج اور سب پر بااقتدار سمجھنا چاہیے اسی پر شہنشاہی کی اصلی قوت کا انحصار ہے۔ بغیر اس
کے جرمانی شہنشاہی کچھ بھی نہیں ہے اور اسی کے گرد بقیہ جرمانی سلطنتیں مجتمع ہیں۔

(ج) شہنشاہی اور بیشتر منفرد سلطنتوں کا نظام سلطنت شاہی ہے۔

یہ اختلافات ایسے اہم ہیں کہ متفقی سلطنت کے رائج الوقت خیال کے تحت میں جرمانی نظام سلطنت کا شامل نکرنا ہی بہتر ہے۔ اسے متفقی شہنشاہی کا نام دینا چاہیے اور متفقی سلطنت کی ایک جدید و متوازی صورت خیال کرنا چاہیئے۔

ب۔ اتحاد

جس صورت پر ہم بحث کر رہے تھے، اسی کے قریب قریب دو یا زائد سلطنتوں کا (ایک خاص مفہوم میں) اتحاد ہے۔ خواہ ایک مشترک حکمران کے تحت میں ہو یا ایک نئی سلطنت کی صورت میں۔ اس کے مختلف اقسام و مدارج ہیں۔ اتحاد جب تک محض ذاتی وجہ پر مبنی ہوتا ہے وہ نامکمل رہتا ہے۔

۱۔ شخصی اتحاد

اگر ایک ہی شخص اتفاق سے دو مختلف سلطنتوں کے تخت کا وارث ہو جائے تو یہ اتحاد بالکل عارضی ہوتا ہے اور بعد میں اگر پھر جانشینی دو مختلف شخصوں کو حاصل ہو جائے تو یہ اتحاد زائل ہو جاتا ہے۔ چارلس پنجم کے تحت میں جرمانی شہنشاہی اور اسپین کا متحد ہو جانا یا آگسٹس (دوم و سوم) کے تحت میں پولینڈ اور سکسونیا کا یا خاندان برنس وگ کے مرد حکمرانوں کے تحت میں انگلستان اور ہنوور کا یا ۱۶۲۰ء کے معاہدے کے موافق اسلیشوگ ہولشٹائن اور ڈینمارک کا اتحاد، یہ سب اسی قسم میں داخل تھے۔ اتحاد کا یہ طریقہ سب سے کمتر درجے کا ہے اس سے کوئی نئی متحدہ سلطنت نہیں پیدا ہوتی بلکہ دو آزاد سلطنتیں محض بیرونی تعلقات کے لحاظ سے ایک بادشاہ کے تحت اقتدار میں آجاتی ہیں۔

جب دو سلطنتوں کا تاج ایک ہی خاندان کے پاس ہو اور ایک ہی قانون وراثت کے موافق اس کا سلسلہ جاری رہے تو یہ شخصی اتحاد مستقل صورت اختیار کر لیتا ہے اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔ تاج آسٹریا کے تحت میں جو سلطنتیں متحد تھیں ان کے لیے ۱۷۱۳ء کا فرمان شہنشاہی (جسے ۱۷۲۲ء میں ہنگری کی مجلس نے بھی سلطنت ہنگری کیلیے منظور کر لیا تھا) ۱۷۰۷ء میں شاہ پروسیا کا امارت نیوشاتل کا حاصل کر لینا، ۱۸۱۴ء میں ناروے اور سویڈن کا متحد ہو جانا ۱۸۶۷ء میں سلطنت ہنگری اور آسٹریا کا وفاق اس مستقل خاندانی اتحاد سے حقیقتاً ایک نئی مرکب سلطنت پیدا ہو سکتی ہے مگر یہ اتحاد بہت ہی نامکمل ہوتا ہے اور بالعموم اس میں کسی قسم کی عملی اہمیت نہیں ہوتی جبتک کے

خود حکمران کی ذات میں مطلق العنان اختیار مجتمع نہ ہو جائے۔ اس کے سوا تمام دوسری حالتوں میں فی الحقیقت ایک طرح کے تضاد و تخالف کی صورت رونما ہو جاتی ہے۔ ایک طرف متضاد اغراض و خیالات کی دو سلطنتیں ہوتی ہیں، دوسری طرف ایک مشترک بادشاہ ہوتا ہے جو ایک سلطنت کے حکمران کی حیثیت سے دوسری سلطنت کے خلاف اعلان جنگ تک کے لئے مجبور ہو سکتا ہے۔ اس لئے شخصی اتحاد کی یہ صورت نیابتی حکومت کے ساتھ باحسن طریق جمع نہیں کی جا سکتی۔

۵۔ حقیقی اتحاد

اعلیٰ توحد اس طاپ میں پایا جاتا ہے جسے "حقیقی اتحاد" کا نام دیا جاتا ہے متفقیت سے اسے وہی نسبت ہے جو شخصی اتحاد کو مشترکیت سے ہے۔ اس صورت میں نہ صرف حکمران کی شخصیت ایک ہوتی ہے بلکہ قانون سازی اور حکمرانی بھی ایک ہوتی ہے [۱]۔ بلاشبہ متحدہ سلطنتوں میں گونہ اندرونی آزادی ہو سکتی ہے اس لئے کہ معین حدود کے اندر ان کے خاص مجالس وضع قوانین اور ان کے خاص عمال ہو سکتے ہیں مگر پھر بھی تمام سلطنت کا ایک نظم ہوتا ہے اور اس کے سب سے اعلیٰ اغراض ایک ہی ہاتھوں میں مجتمع ہوتے ہیں۔ ایسے حقیقی اتحاد کی مثالیں یہ ہیں: ۱۵۳۶ء* کے شاہنشاہی قانون کے موافق ناروے کا سلطنت ڈینمارک سے متحد ہو جانا۔ کیسٹائل اور ارگون کا اتحاد اگرچہ ابتداہی (یعنی ۱۴۷۹ء) میں مکمل نہیں ہوا مگر بعد کو شاہان ہاپس برگ کے تحت میں مکمل ہو گیا۔ سب سے نمایاں مثال ۱۸۴۹ء کے قانون اساسی اور ۱۸۶۱ء کے نظام سلطنت کے موافق آسٹری شاہی کی ہے۔ ۱۸۶۷ء سے آسٹریا ہنگری کا نظام سلطنت دو خاص سلطنتوں کی دوگونگی کے ساتھ اتحاد شخصی کی شکل کو پہنچ گیا ہے اس وجہ سے کہ معاملات خارجہ کی وزارت، شہنشاہی فوج اور مالیات ایک ہیں۔ نیز آسٹریا اور ہنگری کی دو قائم مقام جماعتوں کی ایک مشترک سفارت ہے۔ اس شخصی اتحاد

[۱] ۔ پوٹیشل "قاموس علم السیاسۃ" کی فصل "اتحاد" میں، شخصی اور حقیقی اتحاد میں کچھ اور امتیاز قائم کرتا ہے۔ اس کے نزدیک شخصی اتحاد ایک اتفاقی چیز ہے اور حقیقی اتحاد، دو یا زیادہ سلطنتوں کے اقتدار کا بنیادی قانون کی بنا پر ایک ہی شخص کی ذات میں جمع ہو جانا ہے۔ اس طرح پر اس کی نظر میں سویڈن اور ناروے کا اتحاد بھی حقیقی اتحاد ہے۔

* اصل جرمانی متن میں ۱۵۳۲ء ہے

میں حقیقی اتحاد کے عناصر موجود ہیں۔ یہ دونوں خاص سلطنتیں اپنی اپنی جگہ پر شخصی اتحاد سے شروع ہوئیں مگر اب ان کا اتحاد حقیقی ہو گیا ہے۔

۶۔ اتحاد کامل

اتحاد کامل سے متعدد سلطنتوں کی تفریق ختم ہو جاتی ہے، اور اس سے ایک مرکب نہیں بلکہ ایک واحد سلطنت بن جاتی ہے۔

انگلستان اور اسکاٹلینڈ ابتداءً محض شخصی اتحاد سے مربوط ہوئے تھے مگر ۱۷۰۷ء میں برطانیہ عظمیٰ کا نام پاکر ان کے متحد ہو جانے اور بعد میں (۱۸۰۱ء میں) برطانیہ عظمیٰ اور آیرلینڈ کا اتحاد ہو جانے سے وہ اتحاد کامل کی مثال بن گئے۔ ان کی جداگانہ پارلیمنٹیں ختم کر دی گئیں اور اب تمام قلمرو کے لئے ایک پارلیمنٹ ہے۔ زیادہ جدید زمانے کی مثالیں حسب ذیل ہیں:-

۱۸۴۹ء میں امارتہائے ہوہنت سولرن کا پروسیا میں شامل ہو جانا

۱۸۶۰-۶۱ء میں اطالی امارتہائے ڈیوکی اور سلطنت نیپلز کا اطالیا کی ایک نئی سلطنت بنانے کی غرض سے پیڈمونٹ میں ملحق ہو جانا سب سے بڑھ کر یہ کہ ہنوور کی سلطنت ہیسے۔ نساؤ، اشلیس وِگ اور ہول اشٹائن کی امارت اور فرانک فرٹ کے آزاد شہر کا پروسی صوبوں میں مبدل ہو جانا۔

زمانۂ سابق میں قانون عامہ ان اتحادات و تغیرات کو خالصتہً خاندانی نقطہ نظر سے دیکھنے کی طرف مائل تھا۔ گویا یہ معاملہ ایک ہی شخص کا ذاتی حیثیت سے متعدد قطعہائے اراضی کا حاصل کر لینا یا ان کا وارث ہو جانا تھا اور بس۔ (وصیت اور وراثت کی صورتوں میں) شخصی قانون کسی شخص کی زندگی میں اور نیز موت کے وقت انتقال ملک کی جو صورتیں تجویز کرتا ہے وہی اس معاملے میں بھی مسلم سمجھی جاتی تھیں۔ گویا قوم اور ملک ایک ترکہ تھا۔ جسے ایک شخص واحد جس طرح چاہتا، کام میں لا سکتا تھا۔ جدید قانون عامہ اس رائے کو جو ہمارے تخیل سلطنت سے متصادم ہے مسترد کرتا اور اس امر پر زور دیتا ہے کہ اس قسم کے تغیرات چونکہ حقیقتاً قوم کے عام نظام سلطنت سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے عوام کے قائم مقاموں کی مرضی کے بغیر انھیں طے نہ کرنا چاہئے

ج۔ تقسیم

اتحاد کا عکس، ایک بڑی سلطنت کا دو یا زائد نئی سلطنتوں میں منقسم یا متفرق ہو جانا ہے۔

۷۔ تقسیم باعتبار قومیت

قومیت کے اعتبار سے تقسیم کا موقع بالخصوص ایسی جگہ ہوتا ہے جہاں مختلف قومیں جو اپنے املاک ارثی ہی کی وجہ سے ایک دوسرے سے جدا ہوں حقیقی اتحاد کے بغیر ظاہری طور پر ایک نئی سلطنت میں متحد ہو گئی ہوں اگر وہ جامع قوت جو اب تک انھیں متحد کئے ہوئے تھی کمزور ہو جائے تو طبعی اختلافات رونما ہو جاتے ہیں اور انفراق کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور اس موجودہ اجتماع کو متعدد جدید و آزاد سلطنتوں میں منتشر کر دیتا ہے چنانچہ وہ عظیم الشان عالمگیر سلطنت جسے سکندر نے اپنی قابلیت سے ذرا دیر کے لئے بنا دکھایا تھا اس کے مرتے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ نویں صدی کی فرانکی شاہی کے بھی قومیتوں کے اعتبار سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ نتیجہ کسی قدر خاندانی اختلافات کی وجہ سے بھی ہوا۔ نپولین کی شہنشاہی جس میں اسکی بنائی ہوئی تابع سلطنتیں بھی شامل تھیں۔ اس کے زوال کی بھی ایک بڑی حد تک یہی وجہ ہو سکتی ہے اور یہی وجہ ۱۸۳۰ء میں بلجیم کے ولندیز (ہالینڈ) سے جدا ہونے کی ہے۔

۸۔ تقسیم بذریعہ وراثت

ازمنہ وسطیٰ میں اکثر ایک سلطنت متوفی حکمران کے مختلف بیٹوں میں بالکل اسی طرح تقسیم ہو جاتی تھی جیسے کوئی وراثت مختلف وارثوں میں تقسیم ہو جائے۔ یہ طریقہ جو شخصی قانون کے اصول سے متفرع ہے سلطنت کے بہبود و اتحاد کے بالکل منافی ہے اور صرف زمانہ جدید کے سیاسی ناقابل التقسیم اصول کے تسلیم کئے جانے سے یہ طریقہ ساقط ہوا ہے۔

۹۔ اعلان آزادی

دوسری صورت اس وقت ظاہر ہوتی ہے۔ جب کسی سلطنت کا کوئی حصہ اپنے تئیں آزاد ظاہر کرتا اور ایک جداگانہ سلطنت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بالعموم سلطنت کے جزو ہونے کی حیثیت سے اس حصے کو کل کے خلاف بغاوت کرنے اور بزور اس سے جدا ہونے کا استحقاق نہیں ہے۔ تاریخ نے انفراق کی بہت سی ناواجب اور بدبخت کوششوں کی روایتیں ہم تک پہنچائی ہیں اور وہی تاریخ آزادی کے ایسے اعلانات کا بھی حال بتاتی ہے جو پوری طرح تسلیم کئے گئے ہیں اور جنھوں نے کافی طور پر اپنے کو حق بجانب ثابت کیا ہے۔

۱۵۷۹ء میں اسپین سے صوبجات متحدہ کی علیحدگی ۱۷۷۶ء میں شمالی امریکہ کی سلطنتوں کا اعلان آزادی اور ہمارے زمانے میں یونان کا ترکی تسلط سے

آزاد ہو جانا، یہ سب اسی طریقے کی یاد دلاتے ہیں اس اصول میں کسی قدر حصر کی ضرورت ہے جسے بطریق ذیل بیان کر سکتے ہیں: مستثنیٰ حالتوں میں جزو کا کل سے علیحدہ ہو جانا حق بجانب ہے بشرطیکہ اس کے دائمی اور اہم اغراض اس کل کے اندر محفوظ اور قابل اطمینان نہ ہوں جس سے اس کا تعلق ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی ہو کہ خود اس جزو میں اپنی فکر کرنے اور اپنی آزادی کے برقرار رکھنے کی اہلیت موجود ہو۔ صرف حقیقی ضرورت اور ناقابل برداشت مصیبت ہی علیحدگی کے لئے کافی وجہ ہو سکتی ہے اور اس کے مسلم سمجھنے کا حق صرف اس اخلاقی قوت سے پیدا ہوتا ہے جو خود کو فتحیاب ثابت کر دے اور تمام مشکلات پر غالب آجائے ان دو مفروضات کے ساتھ تاریخ کا فیصلہ اس پر مہر اعتراف لگا دے گا۔[1]

[1] امریکہ کا اعلان آزادی اس اصول کو زیادہ ہلکے طور پر زیر بحث لایا ہے، اور اس وقت کے حقوق فطری کے رائج الوقت نظریئے کو ان لفظوں میں تسلیم کرتا ہے:۔ ہم ان صداقتوں کو بدیہی سمجھتے ہیں کہ تمام آدمی یکساں درجے پر پیدا کئے گئے ہیں۔ خالق اکبر نے انھیں بعض نہ بدلنے والے حقوق عطا فرمائے ہیں اور اس زندگی کے ساتھ آزادی اور اپنی خوش حالی کی کوششیں وابستہ ہیں جو انھیں حقوق کے تحفظ کے لئے انسانوں میں حکومتیں قائم کیگئی ہیں جو اپنے جائز اقتدار کو محکوموں کی مرضی سے حاصل کرتی ہیں۔ جب حکومت کی کوئی شکل ان اغراض کے منافی ہو جاتی ہے تو قوم کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اس حکومت کو منسوخ کر دے اور اس کی جگہ پر نئی حکومت قائم کرے اور اس کی بنیاد ایسے اصولوں پر رکھے اور اس کے اختیارات کو اس طرح پر ترتیب دے جو اپنی حفاظت اور خوشحالی کے لئے قوم کی نظر میں سب سے زیادہ انسب معلوم ہوں۔ عاقبت اندیشی کا اقتضا ضرور یہ ہوگا کہ جو حکومت مدت دراز سے قائم ہو وہ خفیف اور عارضی وجوہ سے تبدیل نہ کی جائے اور اسی لئے تمام تجربات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ خرابیاں جبتک قابل برداشت ہوتی ہیں لوگ انھیں برداشت کرتے رہتے ہیں اور یہ نہیں کرتے کہ حکومت کے جن اشکال سے وہ مانوس ہوں انھیں منسوخ کر کے خود حاکم بن بیٹھیں لیکن جب کجروی اور بدکرداری کا ایک طویل سلسلہ بلا تغیر اسی ایک غرض کے لئے جاری ہو جائے کہ ابنائے ملک کو مطلق العنان حکمرانی کے تحت میں لے آئے تو پھر لوگوں کا یہ حق بلکہ ان کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ ایسی حکومت کو برطرف کر دیں اور آئندہ کے لئے اپنی محافظت کی تدبیریں عمل میں لائیں [اس اعلان کے خیالات و الفاظ کا لاک کے رسالہ "حکومت ملکی" (جلد دوم فقرات ۲۲۲ و ۲۲۵] سے مقابلہ کرو۔

# چوتھا باب

## (۳) تاریخی تکوین کی صورتیں

(۱) آبادکاری (الف) یونانی

یونانیوں کی آبادکاری جس نے ایشیائے کوچک، اطالیا اور سسلی میں بحر متوسط کے ساحلوں کو اور یونانی جزیروں کو نئے شہروں اور سلطنتوں سے پر کر دیا تھا وہ فی الواقع نئی سلطنتوں کی ارادی تکوین تھی نئی آبادی اپنے آبائی شہر سے اس طرح نکلتی تھی جیسے بیٹا خود اپنا گھر بنانے کے لئے اپنے باپ کے خاندان سے نکلتا ہے۔ یہ نئی آبادی فوراً ہی ایک نئی سلطنت ہو جاتی تھی جو آبائی شہر سے آزاد ہوتی مگر اپنی نسل، اخلاق، قانون اور مذہب کے روابط سے اس کے ساتھ وابستہ رہتی تھی۔ نوخیز شہر اپنے آبائی شہر کے ایوان (Prytaneum) سے آتش مقدس لے جاتا تھا اور اس طرح خاندانی دیوتا نئے وطن کو منتقل ہو جاتے تھے[۱]۔ یونانیوں نے کوئی بڑی شہنشاہی نہیں قائم کی مگر ان کی منتشر نوآبادیوں نے مشرق کو یونانی رنگ میں رنگ دیا۔

(ب) رومی

رومی نوآبادیوں کا حال اس سے بالکل مختلف تھا۔ ان کی غرض رومی تسلط

---

[۱] مقابلہ کرو ہرمن (Herrmann) "یونانی سلطنت کے آثار قدامت" باب ۴۔ فونیقیا کی قدیم تر آبادکاری ابتدا ہی سے نئی سلطنت کی بنیاد نہیں ہوئی تھی مگر بعد میں تھوڑے ہی دنوں میں اس نے یہ شکل اختیار کر لی

اور اقتدار کی حفاظت اور توسیع تھی اور اس لئے مستقر سے ان کا تعلق سخت تابعانہ حیثیت میں قائم رہتا تھا۔ وہ نئی سلطنتوں کی بنائیں نہیں تھیں بلکہ ایک ہی قائم شدہ سلطنت کی توسیع تھیں۔

(ج) جدید

اب جدید آبادکاری اس سے بھی مختلف ہے اگر ہم یورپی سلطنتوں کی قائم کردہ زمانہ حال کی نوآبادی کے ابتدائے کار پر غور کریں، خاصکر امریکہ کی نوآبادیوں پر تو یہ واضح ہو جائے گا کہ ان سے براہ راست نئی سلطنتوں کی بنیاد نہیں پڑی بلکہ زیادہ تر ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ قدیم ملک کے تسلط اور تمدن کو وسعت دیجائے یا نئی اقتصادی ہستی پیدا کی جائے اور کبھی وطن کے جور و تعدی سے بچنا بھی اس کا باعث ہوا کرتا تھا۔ جنوبی امریکہ کی نوآبادیوں کی وابستگی یورپ کی رومانی سلطنتوں سے، شمال کی نوآبادیوں کی بہ نسبت زیادہ تھی۔ اس لئے کہ شمال میں آزادی کا ٹیوٹونی احساس اور قیام شخصیات کا میلان ایک بڑی حد تک آبادکارانہ آزادی کا باعث ہوا یا کم از کم یہ کہ اس آزادی کا موید رہا۔

لیکن ان نوآبادیوں کی مابعد کی ترقی اور تاریخ پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یورپی حکومت سے اپنی آزاد ہستی خود حاصل کی ہے اور اس طرح ان سے علٰحدہ ہو کر آزاد سلطنتیں بن گئی ہیں۔ اس قسم کی نوآبادی کی صحیح مثال بچے کی پیدائش سے دیجا سکتی ہے، جو ایک تابع رکن کی حیثیت سے خاندان کی افزائش کا باعث ہوتا ہے مگر جب وہ جسمانی اور عقلی ترقی کر جاتا ہے تو الگ ہو کر خود ایک نیا خاندان قائم کر لیتا ہے۔

۴۔ فرمانروایانہ حقوق کا عطا کرنا۔

ازمنۂ وسطیٰ میں ایک دوسری طرح کی تکوین سلطنت اکثر یوں واقع ہوتی رہی ہے کہ سلطنت کے مخصوص حصوں کو فرمانروایانہ حقوق عطا کر دئے جاتے تھے اس طور پر بادشاہ سے مخصوص فرمانروایانہ حقوق حاصل کر کے (بالتخصیص جرمانی اضلاع، امارات، ممالک اور شہنشاہی امصار کا) ایک پورا سلسلہ قائم ہو گیا اور بتدریج ان کے حقوق بڑھتے رہے یہاں تک کہ بادشاہ کے لئے کسی قسم کی اصلی قوت باقی نہیں رہی، محض ایک ظاہری فوقیت رہ گئی۔ اس طرح جو ممالک ایک ہی سلطنت کے اجزا تھے وہ صدیاں گزرنے پر آزاد سلطنتیں بن گئے۔ ان عطیات کی خارجی صورت اکثر خریداری یا قرض کے ذریعے سے شخصی حصول حق ہوا کرتی تھی اور اس لئے یہ طریقہ موجودہ سلطنت کے لئے موزوں نہیں ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ تک میں یہ لازمی شرط نہیں تھی اور اس لئے موجودہ زمانے میں عملاً یہ

ممکن ہے کہ کوئی سلطنت اپنے ممالک جن کے کسی حصے کو صاف طور پر یہ سمجھکر کہ وہ اسے فرمانروایانہ حقوق عطا کرے گی اس طرح تربیت دے کہ وہ اس قابل ہوجائے اور اسے یہ حق عطا کردے۔ انگلستان، کناڈا اور اپنے دوسرے ملحقات کے ساتھ اسی روش پر چل رہا ہے۔

۳۔ غیر ملکی حکمران کی بنائے سلطنت

کسی نئی سلطنت کی بنا کا آخری طریقہ یہ ہے کہ کوئی غیر ملکی حکمران اسے قائم کرے، خاصکر فاتح جسکے حکم سے قدیم سلطنتیں برباد اور نئی سلطنتیں پیدا ہوجایئں نپولینی حکومت کے دوران میں یورپ نے دیکھ لیا ہے کہ شہنشاہ کی مرضی سے متعدد سلطنتیں برباد اور ان کے بجائے نئی سلطنتیں قائم ہوگئی تھیں مگر ایک آن واحد کی طاقت کے ان خودرایانہ مخلوقات کو کسی طرح کی حقیقی زندہ قوت نہیں حاصل ہوئی اور انھیں وجود میں آئے ابھی دیر نہیں ہوئی تھی کہ وہ از خود فنا ہوگئیں یا برباد کردی گئیں یہ ایک بدیہی ثبوت اس امر کا ہے کہ تکوین سلطنت کی تمام صورتوں میں سب سے زیادہ ناتکمل اور سب سے کم محفوظ صورت یہی ہے۔

# پانچواں باب

## سلطنتوں کا زوال

ساری زمین منہدم سلطنتوں کے کھنڈروں سے بھری پڑی ہے اور دنیا کی اب تک کی تاریخ سلطنت کے غیر فانی ہونے کے خلاف شہادت دے رہی ہے۔ جس طرح افراد میں موت کے اسباب مختلف ہوتے ہیں اسی طرح سلطنتوں میں بھی اس زوال کے مواقع اور اشکال مختلف ہیں، لیکن اس امر واقعی سے کہ تمام سلطنتیں بالآخر زوال میں آجاتی ہیں ہم ان کے فنا ہونے کے ایک مشترک سبب کو غالبًا دریافت کر سکتے ہیں۔ یہ سبب قوموں کی اخلاقی پستی میں نہیں مل سکتا کیونکہ زوال کے لئے اخلاق کی پستی نہ لازمی ہے اور نہ ہر ایسے موقع پر اس کا موجود ہونا ثابت ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ پست اخلاق والی قومیں اسی طرح مدتوں زندہ رہ سکتی ہیں جس طرح ایک بد اخلاق آدمی بسا اوقات بڑی عمر تک پہنچ جاتا ہے حکومت کی خرابی کو بھی اس کا سبب قرار نہیں دے سکتے کیونکہ بہت سی سلطنتیں خراب حکمرانوں کی کئی کئی نسلوں تک زندہ رہی ہیں، نہ جیسا کہ گوبی نو نے حال میں دعویٰ کیا ہے۔ نسل کے اختلاط اور پستی میں یہ سبب نظر آتا ہے۔ اس امتزاج خون سے بہت سی سلطنتوں نے عظمت و قوت حاصل کرلی ہے اور اگرچہ قومی نسل حقیقتاً بدل گئی مگر سلطنت برابر سرسبزی حاصل کرتی رہی۔ روما

انگلستان اور ممالک متحدہ امریکہ اس کی مثالیں ہیں۔ پس اصل سبب وہی ہے جو تمام دنیوی عضوی زندگی کے قانون عظیم میں پایا جاتا ہے کہ مرور ایام اسے ترقی دیتا اور اسے ختم بھی کر دیتا ہے قوموں اور سلطنتوں کی زندگی پردہ خفا سے نکلتی اور جو کچھ اس کے اندر موجود ہے اسے بتدریج ظاہر کرتی ہوئی اپنے مقصد کو پورا کرتی اور فنا ہو جاتی ہے؛ یعنی زمانے کی نہ تھکنے والی ترقی اس سے آگے نکل جاتی اور اسے پیچھے چھوڑ دیتی ہے اس لئے کہ فرسودہ زندگی اس کا ساتھ نہیں دیسکتی۔

ترقی پذیر عالم انسانی کو کسی مخصوص سلطنت میں کامل اطمینان نہیں حاصل ہوتا اور وہ تمام سلطنتوں کو نگل جاتا ہے۔ اگر کبھی انسانیت کی وسیع بنیاد پر تمام نسل انسانی کی ایک عالمگیر سلطنت وجود میں آجائے تو ہم یہ امید کرسکتے ہیں کہ یہ سلطنت اس وقت تک باقی رہے گی جبتک انسان خود باقی رہیں۔

سلطنتوں کے زوال کی خاص خاص شکلیں

سلطنتوں کے زوال کی خاص شکلیں ایک بڑی حد تک تکوین سلطنت کی صورتوں کے مقابل ہوتی ہیں اور بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ نئی سلطنتوں کے قائم ہونے سے پرانی سلطنتوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

قومی فساد تنظیم لاحکمیت

قوم کی تنظیم کا عکس ہے قومی تنظیم کا فساد یا اس کا بکھر جانا۔ تنظیم کے بکھر جانے کی مخصوص صورت لاحکمیت ہے۔ اگر اقتدار حکومت کا پاس ولحاظ قوم میں باقی نہ رہے اور جس شخص کی نظر میں جو مناسب معلوم ہو وہی کر گزرے اور کوئی شخص جماعت کے لئے نہ کسی طرح کی فکر کرے نہ اس کے لئے کسی قسم کا ایثار کرے۔ تو ایسے وقت میں سلطنت نفی کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور ایک منتظم قوم ایک غیر منتظم انبوہ میں مبدل ہو جاتی ہے لاحکمیت نہ صرف سلطنت کی موجودہ صورت کو بلکہ نفس سلطنت کو اٹھا دیتی ہے مگر ایسی قطعی اور دیرپا لاحکمیت، جو سلطنت کی موت کے ہم معنی ہو جاتی ہے، اقوام کی تاریخ میں نہایت ہی شاذ و نادر پائی جاتی ہے۔ زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ لاحکمی کیفیتیں صرف گزر جانے والی چیز اور ایک بخار کا عارضی بحران ہوتی ہیں جن سے سلطنت کی زندگی خطرے میں ضرور پڑ جاتی ہے مگر اکثر یہ کیفیت نظام سلطنت کی ایک نئی ہیئت کی تیاری ثابت ہوتی ہے یہی وہ پر آشوب اور ہنگامہ خیز اوقات ہیں جنہیں آریائی قوموں کی عجیب خصلت کا اظہار ہوتا ہے۔ جس وقت کہ وہ بہ غضب نفرت کے ساتھ سیاسی نظم

کو الٹ دیتی ہیں اس وقت میں بھی وہ سیاسی ہستی کی لازمی صورتوں کی مطیع ہو جاتی ہیں، اور جس حال میں کہ خیالات کی پراگندگی سے وہ لاحکمیت کی شیدائی ہوتی ہیں۔ اس حالت میں بھی وہ آنکھ بند کر کے ان سرگروہوں کی تقلید کرتی ہیں جو سب سے زیادہ بیباک اور سب سے زیادہ سخت گیر ہوتے ہیں۔ آزادی کے نشے سے مست اور ساری قیدوں سے آزاد انبوہوں کے جلوس فتحمندی کے بالکل عقب میں آمر مطلق (Dictator) کے بچہرے کے فولادی خط و خال دکھائی دیتے ہیں اور قدیم نظام سلطنت کے منہدم آثار پر قوم فوراً ہی اپنے لئے ایک نیا اور شاید پہلے سے بدتر سیاسی مسکن تیار کرتی ہے۔ جلیل القدر آریائی نسل کی قومیں بھی غیر فانی نہیں ہیں مگر جبتک ان کی زندگی باقی ہے وہ اپنی ہستی کی سیاسی زندگی سے اس سے زیادہ بے نیاز نہیں ہو سکتیں جس قدر مچھلی پانی سے یا چڑیا ہوا سے بے نیاز ہو سکتی ہے۔ تمام تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ہے کہ ایک آریائی قوم سلطنت کے قیود سے مستقلاً آزاد ہو گئی ہو یا خانہ بدوشوں کی حالت میں واپس چلی گئی ہو۔ سولھویں صدی میں باز اصطباغیوں نے سلطنت کے خیال کو اسی طرح کلیتہ مسترد کر دیا تھا، جس طرح ہمارے زمانے میں اشتمالی اسے مسترد کرتے ہیں مگر جب انھیں اپنی غیر سیاسی جماعت کے قائم کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے بھی ایک سلطنت بنا کر کھڑی کی گو وہ کیسی ہی مضحکہ خیز رہی ہو۔

۲۔ ترک وطن

جب کوئی قوم اپنے آبائی وطن کو ترک کر دیتی ہے (جیسے قیصر کے عہد میں اہل سوئزرلینڈ نے کوشش کی تھی) یا کوئی قوم اپنے وطن سے خارج کر دی جاتی ہے (جیسا کہ شہنشاہی روما کے زوال پر وحشیوں کے نفوذ کے دوران میں اکثر واقع ہوا) تو ان دونوں صورتوں میں سلطنت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور یہ امر بالعموم غیر متیقن ہوتا ہے کہ آیا اس طرح اپنے وطن سے نکلنے والی قوم کسی دوسرے ملک میں پائدار حکمرانی کے حاصل کر لینے اور اس طرح ایک نئی سلطنت کی بنا ڈالنے میں کامیاب ہو گی یا نہیں۔

۳۔ فتح

کسی غیر ملکی طاقت کا کسی ملک کو فتح کر لینا اور کسی تا حال آزاد قوم کا مطیع کر لینا ایک نئی سلطنت پیدا کرنے کے بجائے زیادہ تر ایک قدیم سلطنت کا برباد کر دینا ہوتا ہے۔ نتیجہ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ فاتح سلطنت میں کچھ اور زیادہ وسعت ہو جاتی ہے اسی طریق پر روما بہت سی سلطنتوں کو نگل گیا اور ان کے ملک اور آبادی پر اپنے

تسلط کو وسعت دیدی کمزور قوم کی اطاعت ظاہر میں رضامندانہ ہوا کرتی ہے مگر بالعموم ضرورت اور مجبوری سے ایسا ہوتا ہے اور اس وجہ سے یہ محض استیلا کی ایک صورت ہوا کرتی ہے

**۴۔ رضامندانہ انجذاب**

کامل اتحاد کے ساتھ ساتھ وہ سلطنتیں جو اتحاد میں شامل کرلی گئی تھیں ناپدید ہوجاتی ہیں لیکن چونکہ اس وقت میں اسی اتحاد سے ایک بڑی نئی سلطنت پیدا ہو جاتی ہے جسکے افراد انھیں ناپدید قوموں کے افراد کو شامل ہوتے ہیں اسلئے منفرد سلطنتوں کی جانب سے اپنی جداگانہ ہستی کا ترک ایک رضامندانہ فعل قرار دیا جا سکتا ہے۔

**۵۔ رضامندانہ جدائی اور مجبورانہ تقسیم**

چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے ایک بڑی مجموعی سلطنت میں جذب ہو جانے کا عکس ہے ایک شہنشاہی کا کئی سلطنتوں میں منقسم ہو جانا یا ایک سلطنت کا کئی مغائر سلطنتوں میں متفرق ہو جانا اول الذکر بلا کسی بیرونی دباؤ کے منتظم طریقے پر اس طرح واقع ہو سکتا ہے کہ مختلف حصے یوماً فیوماً اپنی خصوصیت کو زیادہ مستحکم کرتے جائیں اور بالآخر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں لیکن آخر الذکر صورت بالعموم کسی غالب غیر ملکی قوت کے فعل سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جو اپنی روشن خیالی اور انسانیت پر نازاں تھا، پولینڈ کی تقسیمات (۱۷۷۲ء، ۱۷۹۳ء، ۱۷۹۵ء) اس قسم کی ناجائز زبردستی کی ہولناک مثال ہیں۔

**۶۔ شاہی حقوق سے دست کشی یا ان کا ترک**

جسطرح فرمانروایانہ حقوق کے عطیے سے نئی سلطنتیں بنجاتی ہیں اسی طرح ان حقوق سے دستکش ہو جانے یا ان کو ترک کر دینے سے موجودہ آزاد سلطنتیں بتدریج اپنی سیاسی ہستی کو زائل کر دیتی ہیں۔ جرمانی شہنشاہی کی تاریخ اس قسم کی سلطنتوں کے بننے کے طریقے اور فرانس کی تاریخ ان کے مٹنے کی طریقے کی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ فرانس کے ایک مرکز کی طرف رجوع ہو جانے نے بالخصوص لوئی یازدہم کے زمانے سے ایک ایک کرکے ذی اقتدار امارتوں کی ایک کثیر تعداد کو شکست کر دیا مگر جرمانیا نے بھی انقلاب کے وقت سے بہت سی چھوٹی ریاستوں کو بڑی سلطنت کے بالواسطہ تابع بناکر ایسا ہی طرز عمل اختیار کیا ہے۔

# چھٹا باب

## تخمینی (یا تخیلی) نظریے

### (۱) نام نہاد فطری حالت

۱۔ عہد زریں

فلسفیانہ تخیل اس کا مشتاق ہے کہ پہلے ایک ایسے عہد ابتدائی کا تصور پیدا کرے جب انسان بلا کسی قسم کی سلطنت کے رہتا تھا اور اس کے بعد یہ بحث کرے کہ انسان اس حالت سے سلطنت کی حالت میں کیونکر آیا۔ عوام کی قوت تخیل نے اس ابتدائی حالت کو معصومیت کی اور فطری مسرتوں کے وفور کی خنداں و شاداں تصاویر سے مزین کیا ہے اور اس جنتی عہد زریں کا خواب دیکھتی رہی ہے جس میں ابھی خرابیوں اور ناانصافیوں کا دخل نہیں ہوا تھا اور سب کے سب اپنی پر امن ہستی سے غیر محدود آزادی و خوشحالی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ ان تخیلات کے مطابق اس ابتدائی حالت میں کسی قسم کی ملک نہیں تھی۔ کیونکہ قدرت کی بہتات سے ہر شخص کو کافی طور پر وہ تمام چیزیں ملجاتی تھیں جو اس کے بے تصنع اور غیر مکدر ذوق کے لئے ضروری تھیں۔ اس وقت تک درجات بلکہ پیشوں تک کا کوئی فرق نہیں تھا۔ ہر شخص دوسرے کے مانند تھا۔ نیز اس وقت میں نہ کوئی راعی تھا نہ کوئی رعیت نہ کوئی حاکم تھا نہ کوئی منصف تھا نہ کوئی فوج تھی اور نہ کسی قسم کا محصول لگتا تھا۔

سلطنت ایک لابدی خرابی کی حیثیت سے

ایسے تخیل کے مقابلے میں انسان کی مابعد کی سیاسی حالت لازماً ایک طرح کا تخریب وتنزل معلوم ہوگی ایک ایسی طاقت کی ضرورت، جو بدکاروں کی تخویف وتنبیہ کر سکے اور سب کے

انتفاعات کو خلل اندازی سے محفوظ رکھ سکے، پہلے پہل اس وقت لاحق ہوئی جب لوگوں کو ان وباؤں سے سابقہ پڑا جن کا پہلے کہیں نام و نشان بھی نہ تھا، جب ان کے دلوں میں جذبات نے بھڑک کر نئے خطرات پیدا کر دئے اور جب ارتکاب جرائم نے ان کی روحوں کے سکون کو غارت کر دیا۔ پس لوگوں نے اگر سلطنت کو ایک ایسی خرابی نہیں بھی سمجھا جس کے اختیار کرنے سے کوئی مفر نہ تھا تو کم سے کم یہ ضرور تصور کیا کہ سلطنت ایک ضرورت اور مجبوری کی چیز ہے جس کے ذریعے سے خود اس سے بڑی ہوئی خرابیوں سے ہم محفوظ رہ سکیں گے۔

فطری حالت جنگ کی حالت تھی

بہشت کے اس بچوں کے سے دل خوش کن تصور کے مقابلے میں دوسرے فلسفی اور اکثر خشک مزاج فلسفی انسان کی قدیم غیر سیاسی حالت کو اس کی سیاسی حالت سے کہیں بدتر سمجھتے ہیں۔ ان کا خوف زدہ تصور اس غیر سیاسی حالت کو بجائے ایک خدائی امن کے ایک ایسی حالت جانتا ہے جس میں ہر شخص دوسرے جملہ اشخاص کے خلاف نامتناہی تنفر اور جنگ میں مبتلا تھا، اور یہ فلسفی اگر سلطنت کو برا بھی سمجھتے ہوں تو بھی ان کے نزدیک یہ خرابی اس ابتدائی فطری حالت کے مقابلے میں جس میں انسان وحشی جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ (الف)، زیادہ قابل برداشت اور کم تکلیف دہ ہے۔ اس فلسفیانہ خیال کو اس مذہبی تصور کی خوش آیند تصدیق بھی حاصل ہو گئی جو سلطنت کو بہشت کی نہیں بلکہ ہبوط یافتہ انسان کی تنظیم سمجھتا ہے۔

دونوں رائیں انسان کی سیاسی فطرت کو نظر انداز کر گئی ہیں۔

یہ دونوں رائیں انسان کی سیاسی فطرت کو نظر انداز کر جاتی ہیں، دونوں اس صداقت سے اغماض کرتی ہیں[۱] جسے ارسطو نے نہایت ہی خوبی سے ظاہر کیا ہے کہ انسان

---

[۱] شیکسپیر نے اپنے ڈراما "طوفان" (Tempest)، باب ۲، پردہ ۱، سطر ۱۴۰ سے ۱۶۰ تک میں بہت ہی نفیس ہجو کی شکل میں اس حالت فطری کا نقشہ کھینچا ہے۔

(الف) ہابس کی رائے کے موافق "لے ویاتھن" (Leviathan) حصہ ۱۔ باب ۱۳-۱۴ انسان کی فطری حالت (یعنی ملکی سلطنتوں سے خارج اس کی حالت) ایک دوسرے کے خلاف جنگ کی حالت تھی۔ اسپنوزا کا بھی یہی خیال ہے دیکھو (Tract Pol) باب ۲۔ ف ۱۴؛ "انسان فطرتاً ایک دوسرے کے دشمن ہیں" اور باب ۵ ف ۲ "انسان متمدن پیدا نہیں ہوتا مگر متمدن بن جاتا ہے"۔ مگر ہابس اور اسپنوزا کے

ایک سیاسی حیوان ہے۔ ہم انسان کی ایک ایسی حالت تصور کر سکتے ہیں جو سلطنت کے پیدا ہونے کے قبل تھی مگر یہ حالت اعلیٰ ضروریات[علہ] کو کبھی پورا نہ کر سکی ہوگی اور انسان کے ارتقا میں وہ ساعت ایک غیر محدود ترقی کی ساعت تھی جب اس کی سیاسی قابلیت کا تخم ظاہر ہوا اور روشنی میں آیا۔

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ان بیانات کو زیادہ تر یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ ایک منطقی استدلال ہے کہ مدنی معاشرت (سلطنت) سے خارج انسان کی کیا حالت ہوتی، نہ یہ کہ ان بیانات سے کسی قسم کے تاریخی نظریے کا اظہار ہوتا ہے، ان کی غلطی یہ نہیں ہے کہ وہ غلط تاریخ کا دعوےٰ کرتے ہیں بلکہ غلطی یہ ہے کہ تاریخ کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ لفظ فطری محض لامدنی یالاسیاسی کے منفی مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور اس لئے یہ ارسطو کے Puois سے بالکل مغائر ہے کیونکہ خود ارسطو نے بتایا ہے کہ یہ حالت آخر میں یا کسی شخص کی کامل ترین ترقی کے بعد پائی جاتی ہے۔ دیکھو ارسطو کی "سیاسیات" (۱، ۲) ف ۸، ۱۲۵۲ اب ۳۲۔) دوسرے موقع پر اس نے تقریباً وہی کہا ہے جو اسپینوزا نے کیا ہے۔ انگریزی مترجم}

علہ۔ افلاطون (ری پبلک" جلد دوم صفحہ ۳۶۹) سلطنت کے قیام کی ضرورت اس وجہ سے قرار دیتا ہے کہ منفرداً آدمی بجائے خود کافی نہیں ہے بلکہ فطرتاً دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا محتاج ہے۔

# ساتواں باب

## (۲) سلطنت بہ حیثیت تنظیم ربانی

سلطنت کے ربانی تنظیم ہونے کا اعتقاد ازمانۂ قدیمہ و ازمنۂ وسطیٰ دونوں میں ہمارے ان وقتوں سے زیادہ پھیلا ہوا اور زیادہ قوی تھا مگر اس وقت بھی سلطنت کی اس ربانی بنا کے مختلف مفہوم سمجھے جاتے تھے۔

(۱) خدا کا سلطنت کو بلا واسطہ قائم کرنا۔

ایک خیال کے موافق قیام سلطنت خداوند تعالیٰ کا بلا واسطہ فعل یعنی زمین پر خدائی حکومت کا بلا واسطہ ظہور تھا۔ اسی خیال پر یہودیوں کی مذہبی سلطنت مبنی تھی اور اس کا منطقی نتیجہ ہمیشہ مذہبی سلطنت کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا ہے کیونکہ صرف یہی صورت اس کے لئے موزوں ہو سکتی ہے۔ اگر خدا نے سلطنت کو بلا واسطہ قائم کیا ہے تو یہ ایک طبعی امر ہے کہ وہ اسے براہِ راست برقرار رکھے اور اس پر حکمرانی کرے۔

(۲) خدا کا سلطنت کو بالواسطہ قائم کرنا۔

دوسرا خیال یہ ہے کہ خدا نے سلطنت کو بالواسطہ قائم کیا اور وہ بالواسطہ ہی اس پر حکومت کرتا ہے[1]۔ اس خیال میں اہل یونان اور اہل روما دونوں شریک تھے ان کی سلطنتیں کسی اعتبار سے مذہبی سلطنتیں نہیں بلکہ اصلاً و کاملاً انسانی سلطنتیں تھیں۔ تاہم قدیم زمانے میں کوئی

---

[1] اس مفہوم میں ٹی بورنے (اپنی تصنیف "زمانۂ انقلاب کی تاریخ" ج ۱۔ ص ۲۱ میں) سلطنت کو وہ تنظیم قرار دیا ہے جسے خدا نے معین کیا ہے اور جو ازدواجی اور پدری تعلق کے مانند انسان کی حقیقی فطرت سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر یہ ایک ایسی تنظیم ہے

کارروائی عامہ جس میں کچھ بھی اہمیت ہو بلا دعا اور قربانی کے عمل میں نہیں آتی تھی اور طیور سے شگون لینے کے کام کو (جس سے دیوتاؤں کی مرضی معلوم ہوتی تھی) رومیوں کے قانون عامہ میں بہت بلند مرتبہ حاصل تھا۔ ان میں انسانی آزادی اور تعین ذاتی کا احساس اس اعتقاد کے ساتھ ملا ہوا تھا کہ انسانی معاملات کی رہبری خدا کے ہاتھ میں ہے اور جبکہ افراد کی قسمتوں میں دیوتاؤں کی طاقت واضح اور محسوس تھی تو وہ اسے اور بھی زیادہ بین و بدیہی سمجھتے ہیں کہ وہ اخلاقی جماعت جسے ہم سلطنت کہتے ہیں، خدا کی مرضی اور اس کے فعل سے کسی طرح جدا نہیں کی جا سکتی[1] تو کیا یہ لوگ غلطی پر تھے؟ یہ بجائے خود مسلم ہے کہ عیسائیت سلطنت کو دنیا کے خدائی انتظام و حکومت سے خارج نہیں قرار دیسکتی۔ مسیحیوں کے خیال کے لئے یہ امر نہایت اہم ہے کہ جبکہ شہنشاہ نیرو عیسائیوں پر سلطنت کے لئے جور و ستم کر رہا تھا اس وقت رسول پادلوس نے رومیوں سے ان مشہور الفاظ میں خطاب کیا تھا "ہر شخص کو اس حاکم کے تابع ہونا چاہئے جس کا اقتدار اس پر ہے، کیوں کہ کوئی حاکم نہیں مگر خدا کی طرف سے، اور اگر کوئی حاکم ہے تو وہ خدا ہی کے حکم سے ہے" (پادلوس کا تیرھواں خط رومیوں کے نام فقرہ (۱)) اس لئے یہ کچھ محل تعجب نہیں کہ ازمنۂ وسطی کے سارے دور میں ہر ایک عیسائی سلطنت کے اندر فرمانروایانہ اقتدار خدا ہی سے حاصل شدہ قرار دیا جاتا تھا، اور شہنشاہ کا اعلیٰ ترین اقتدار بلا کسی غیر کے واسطے کے خدا ہی سے حاصل شدہ سمجھا جاتا تھا۔[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) جو اس عالم میں مکمل نہیں ہوسکتی۔ سلطنت واقعتاً جس حال میں موجود ہے وہ سلطنت کے ربانی تصور کا صرف سایہ ہے۔

[1] ہالر (Haller) نے پلوٹارک کا ایک نفیس جملہ نقل کیا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ "ایک شہر کا بلا زمین کے قائم کرلینا اس سے آسان ہے کہ خدا پر اعتقاد رکھے بغیر سلطنت قائم کرلیجائے" زمانۂ حال میں بھی واشنگٹن اپنی (۱۷۸۹ء کی) کانگریس کی تقریر افتتاحی کا وہ کہتا ہے کہ "نہایت نامناسب ہوگا کہ اپنے اس پہلے سرکاری کام میں اس خداوند قادر مطلق کے نسبت اپنی پرجوش اطاعت کا ذکر نکردوں جو تمام عالم پر حکومت کرتا، قوموں کے مشوروں کی رہبری کرتا اور اپنی کارسازانہ امداد سے ہر انسانی نقص کی تلافی کرسکتا ہے۔ اسی کا فضل ہے کہ ممالک متحدہ کی آزادی و خوشحالی کے لئے ایک ایسی سلطنت عطا ہوئی جسے خود اہل ملک نے ان اہم اغراض کیلئے قائم کیا ہے اور اس کے فضل سے یہ امید ہے کہ اس سلطنت کے نظم و نسق میں جسقدر کارکن شامل ہیں ان میں

سلطنت کی خدائی نویت کے نسبت بعض غلط خیالات

جو خیال سلطنتوں کے عروج و زوال کو دنیا کی ربانی حکمرانی سے متعلق کرتا ہے وہ کیسا ہی پرہیبت کیوں نہو اور ہمیشہ اسکی اخلاقی اہمیت کیسی ہی اعلیٰ کیوں نہ سمجھی گئی ہو مگر ہمیں کسی حال میں اس امر کو نظر انداز نکرنا چاہیئے کہ یہ از ابتدا تا انتہا ایک مذہبی خیال ہے۔ سیاسیات سے اسے تعلق نہیں ہے اور اس وجہ سے یہ خیال جب ایک سیاسی اور قانونی اصول قرار دیا جاتا ہے تو وہ غلطیوں اور خرابیوں کے پیدا ہونے اور ان کے شائع ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔ مثلاً

شاہانہ تعصبات

ا۔ اس میں شک نہیں کہ خدا نے انسان کو ایک سیاسی مخلوق بنایا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اسے اس امر میں آزاد رکھا ہے کہ وہ سلطنت کے اس خیال مرکوز کو اپنی خاص کوششوں اور اپنے فہم و ادراک کے موافق اپنے مناسب حال صورتوں میں عمل میں لائے۔ یہ ایک سخت غلطی ہے کہ سلطنت کی خاص خاص شکلوں کو مثلاً جمہوریت کو اس بنا پر رد کر دینا چاہیئے کہ خدا دنیا پر مثل ایک بادشاہ کے حکومت کرتا ہے۔

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سے ہر ایک کو وہ اپنے فرض کو کامیابی کے ساتھ ادا کرنے کی قوت عطا فرمائے گا میرا یقین ہے کہ تمام عام و خاص افعال نیک کے لئے خالق اکبر کے حضور میں اس اظہار اطاعت سے میں اپنے ہی احساس کو نہیں بلکہ اس سے زیادہ آپ کے احساس کو اور اس سے بھی بڑھ کر اپنے تمام ہموطنوں کے احساس کو ظاہر کر رہا ہوں۔ ممالک متحدہ امریکہ کی قوم سے زیادہ کسی قوم پر اس پوشیدہ دست ایزدی کے اعتراف و تعظیم کا فرض عائد نہیں ہوتا جو انسانی معاملات کا ہادی و رہبر ہے۔ ایک آزاد قوم کی حیثیت حاصل کرنے میں انھوں نے جو قدم اٹھایا اس میں خدائی مدد کا کوئی نہ کوئی نشان ضرور پایا گیا ہے۔ (سوانح عمری واشنگٹن جلد دوم مصنفہ اسپارکس)

(حاشیہ صفحہ نمبر ۲۹۸) ع۲۔ لڈوگ شاہ بویریا کے نظام سلطنت ۱۳۳۸ء کا منشا بھی یہی ہے۔ "جو حکمرانی کے جلال اور اقتدار والا مان لیا گیا ہے وہ بلا واسطہ محض خدا کی طرف سے (یعنی پوپ کے واسطے سے نہیں) ہے اور انتخاب کرنے والے امرا کے انتخاب ہی سے مقرر ہوا ہے اور سچا بادشاہ اور رومیوں کا شہنشاہ تسلیم کئے جانے کا قطعاً مستحق ہے۔" آوگس برگ کے اقرار ۱۵۳۰ء کا فقرہ ۱۶ یہ تعلیم دیتا ہے کہ دنیا میں جتنا کچھ اقتدار اور حکومت اور نظم و قانون ہے اسے خدا ہی نے بنایا ہے اور اسی نے قائم کیا ہے۔" خلاصہ یہ کہ تمام قانونی نظم خدا کی مرضی کا نتیجہ ہے۔

بادشاہ بحیثیت نائب خدا

۲۔ اس میں شک نہیں کہ اقتدارِ حکومت اصولاً و عملاً خدا ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا نے چند معین اور مخصوص افراد کو انسانی کمزوریوں سے بالاتر کر کے اپنے سے زیادہ قریب کر لیا اور انھیں گویا نیم خدا (یا اوتار) بنا دیا ہے، نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا نے انسانی حکمرانوں کو اپنا ذاتی قائم مقام بنایا ہے اور ان سلطنتوں کے حدود کے اندر انھیں بالکل اپنے مثل قوی اور مقتدر کر دیا ہے[علہ]۔ اس قسم کے تصورات جو مذہب اور سلطنت کو خلط ملط کرنے سے پیدا ہوتے ہیں وہ ان لوگوں کی انسانی فطرت کے بالکل خلاف ہیں جنھیں سلطنت کی حکمرانی کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ لوئیس چہاردہم کا یہ پرغرور مقولہ کہ "ہم بادشاہ اس ذات کی زندہ تصویریں ہیں[علہ] جو قدوس و قادرِ مطلق ہے خدا کی شان میں گستاخی اور اس کی زیرِ فرمان مخلوق کی (جس کا ہر فرد لوئیس کے برابر ہے) توہین کرتا ہے۔

اختیار کا منبع حیث الاختیار خدائی ہونا۔

۳۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان شخصوں کی ذات سے علیحدہ جو اسے عمل میں لاتے ہیں اقتدارِ اعلیٰ بجائے خود فوق الانسان اور سیاست خداوندی ہے۔ اشٹال کہتا ہے[علہ] کہ "سلطنت کا اقتدار خدا کا اقتدار ہے" نہ صرف اس معنی کر کہ تمام حقوق مثلاً ملکیت، ازدواج، اقتدارِ پدری سب خدا کے حقوق ہیں، بلکہ اس کے صاف اور قطعی معنی یہ ہیں کہ یہ خدا ہی کا فعل ہے اور وہی اس کو چلاتا ہے۔ سلطنت صرف اسی بنا پر حکمرانی نہیں کرتی کہ خدا نے اسے اقتدار دے رکھا ہے۔ جیسے باپ بچوں پر حکمرانی کرتا ہے

---

علہ۔ دیکھو اشٹال کا "نظریۂ سلطنت" (Staatslehre) کی دوسری اشاعت ج ۲ ف ۴۱ "ازمنۂ وسطیٰ کے نظری تصور کے مواقع عالم عیسوی کے سردار خود خدا کے قائم مقام ہیں اس لئے جملہ حکمران دپوپ، شہنشاہ، بادشاہ) اپنی ذات میں خدا کی طرف سے پورے اختیارات رکھتے ہیں"۔

علہ۔ دیکھو لوئیس چہاردہم کی تصانیف ج ۲ ص ۳۱۰ جہاں یہ تشریح بھی درج ہے "جس ذات نے انسانوں پر بادشاہ مسلط کئے ہیں اس کا منشا یہ ہے کہ بادشاہ کا احترام اس کے نائب کی حیثیت سے کیا جائے صرف یہ اختیار ذاتِ باری نے اپنے لئے رکھا ہے کہ حکمرانوں کے فعل اور ترکِ فعل پر محاکمہ کرے جو رعایا کی حیثیت سے پیدا ہوا ہے اس کو بے چون و چرا اطاعت کرنا چاہئے۔ یہی ہے خشیت الٰہی۔

علہ۔ "نظریۂ سلطنت ج ۲ ف ۳۴ دوسری جانب کے لئے میکالے کی عبارت کو دیکھنا چاہئے جو اس کتاب کے مقالہ ۶ باب ۱۴ کے حاشیہ (۲) میں منقول ہے۔

بلکہ وہ خدا کی طرف سے حکمرانی کرتی ہے اور یہی باعث سلطنت کے نشان عظمت کا ہے"۔ مگر ایسا کرنا فی الحقیقت حکومت مذہبی کے خیال پر واپس آجانا ہے اور اس کا نتیجہ عملاً یہی ہوتا ہے کہ حکمران خدا کا ذاتی قائم مقام سمجھا جانے لگے اور تمام مفروضات اور خرابیاں جو اس سے وابستہ ہیں، وہ پھر پیدا ہو جائیں۔ یہ ایسا خیال ہے کہ اسٹال خود اسے رد کرتا ہے۔ خود حضرت عیسیٰؑ نے یہ فرما کر کہ "جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو" نہایت ہی واضح اور قطعی طور پر سلطنت کی انسانی خصوصیت ظاہر کر دی ہے، اور سیاسی اقتدار کو مختص خدائی حکمرانی کے مرادف کرنے کے ہر ایک خیال کو مسترد کر دیا ہے۔ اس لئے علم السیاست کا یہ طریقہ بہت اچھا ہے کہ وہ سلطنت کے وجود اور اس کے تنظیمات کو انسانی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔

خدائی حق

۴۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک قائم شدہ نظام سلطنت اور بالخصوص حکمران کی ذات یا اس کا خاندان اس اصول پر ناقابل تبدل قرار دیدیا گیا ہے کہ موجود الوقت اقتدار خدا کی مرضی سے قائم ہوا ہے مگر تمام تاریخ عالم سے یہ ظاہر ہے کہ بیرونی اشکال اور شخصی تعلقات کا ناقابل تبدل ہونا ربانی حکومت عالم کا کوئی لازمی جزو نہیں ہے اور پاولوس کی یہ نصیحت کہ حاضر الوقت اقتدار کی اطاعت کرنا چاہئے بجائے خود تنظیمات سیاسی کا قابل تغیر ہونا بالمعنی تسلیم کرتی ہے۔ سترہویں صدی میں یہ نصیحت یقیناً بہت سے متورع انگریزوں کے دلوں میں ایک صادقانہ پیچ و تاب پیدا کر سکتی تھی کہ آیا جیمز ثانی کے ظلم و جور کا مقابلہ کرنا اور اسے تخت سے اتار دینا درست ہوگا یا نہیں، مگر جب ولیم آرنج کو قوم اور پارلیمنٹ نے بادشاہ تسلیم کر لیا تو نہایت ہی محتاط اور با ایمان مذہب پرست ٹوری کے لئے بھی اس کی طاقت کو مرضی خدا سمجھکر اس کا احترام کرنا ممکن ہوگیا (الف)

غیر ذمہ داری

۵۔ ذمہ داری کے مسئلے کا بھی یہی حال ہے۔ جو اصول اوپر بیان ہوا ہے اس سے

(الف) [غیر معاہد ٹوریوں نے ولیم سوم کو بادشاہ تسلیم کرنے میں کوئی ایسی علت نہیں کی وہ اس رائے پر قائم رہے کہ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص عملاً بادشاہت پر قابض ہو وہ قانوناً بھی بادشاہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلنچلی نے محتاط مذہبی ٹوری کا یہ خیال "ڈکاآف برے" سے اخذ کیا ہے۔ انگریزی مترجم۔]

یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مدبرین، جن کو بہت کچھ تفویض کیا گیا ہے، اور بادشاہ، جن کو اقتدار عطا کیا گیا ہے، اپنے فعل اور ترک فعل کے لئے خدا کے سامنے ذمہ دار ہیں مگر اس اصول سے اس مزید سوال کا کوئی فیصلہ نہیں ہوتا کہ یہ لوگ کسی انسانی منصف کو بھی جوابدہ ہیں یا نہیں اور ہیں تو کس حد تک۔ سلطنت کی اعلیٰ ترین طاقت کے لئے انسانی منصف کے روبرو عدم جوابدہی کا دعویٰ اس وجہ سے نہیں کیا جاتا کہ وہ مخصوص ربانی طاقت ہے بلکہ یہ دعویٰ محض اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ وہ سب سے فائق طاقت ہے کسی مدبر کو اس اعتقاد کے بھروسے پر کہ خدا قوموں اور سلطنتوں کی قسمت کو معین کرتا ہے اور اس اعتماد پر کہ خدا کی حکومت ہر حال میں اچھی ہی ہوتی ہے، یہ نکرنا چاہئے کہ خدا کو پھنسا کر آپ دامن جھاڑ الگ ہو جائے۔ اس سے تو اور زیادہ یہ لازم آتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری سے اس وقت تک بری نہیں ہو سکتا، جبتک وہ اپنی بہترین طاقت سے ایمانداری کے ساتھ اس کام کو پورا نکرے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے[۱]

فقرہ بعنایت ایزدی کی تاریخ

تعلیق۔ بادشاہوں کے لقب کے ساتھ فقرہ "بعنایت ایزدی" کا جو طرّہ لگا ہوتا ہے، اس کی تاریخ قابل توجہ ہے مختلف اوقات میں اس کا مفہوم مختلف رہا ہے۔

**(الف)** یہ فقرہ بالتخصیص ازمنۂ وسطیٰ میں استعمال ہوتا تھا۔ فرانکی بادشاہ فقرات ذیل اول بدل کے استعمال کیا کرتے تھے: "بفضل خدا"، "خدائے نگہبان کے حکم سے"، "خدائے مہربان کے فضل سے"، "خدا کے رحم و فضل سے"، "مراحم ربانی سے"۔ اس زمانے میں ان فقروں کا مفہوم صرف اس قدر ہوتا تھا کہ بادشاہ کی طرف سے خدا کے حضور میں عاجزانہ تقدیس اور مذہبی امتنان کا اظہار ہو کیونکہ وہ اپنی ذاتی رفعت کو خدا ہی کی طرف منسوب کرتے تھے۔ شاہ پپن جسے ایک انقلاب کی وجہ سے بادشاہی حاصل ہو گئی تھی ان متداول فقروں کا استعمال اسی طرح کرتا تھا جس طرح اس کا بیٹا چارلس اعظم کرتا تھا۔

---

[۱]۔ لمارتین اپنی تصنیف "۱۸۴۸ء کا انقلاب" (Revolution de 1848) ج ۱، ص ۱۴ خود اپنے متعلق کہتا ہے اور خوب کہتا ہے "لمارتین نے خدا اور انسانوں پر اس بار کو ڈالنے کی کوشش کی تھی، اور اب اپنے تئیں اس غلطی پر سخت ملامت کرتا۔ یہ نہایت سخت ناانصافی ہے کہ جو چیز خدا نے انسان پر عائد کی ہے، یعنی ذمہ داری، انسان الٹا اسے خدا پر ڈال دے۔ یہ گویا خدا سے لڑنا ہے۔"

فرانکی دور میں ان سے فرمانروایانہ قوت کا اظہار نہیں ہوتا تھا ساقفہ اور روسائے خانقاہ اگرچہ قانوناً بادشاہ کے منتخب کردہ یا مقرر کردہ ہوتے تھے اور دنیاوی کاونٹ اگرچہ شاہی عہدہ دار ہوتے تھے مگر یہ لوگ بھی اپنے القاب کے ساتھ یہ فقرے لگادیا کرتے تھے۔

(ب) جرمانی رومی امتوں کی شہنشاہی میں یہ فقرہ اولاً اسی طریقے پر جاری رہا۔ نہ صرف منتخب شدہ بادشاہ بلکہ ڈیوک اور کاونٹ جو بادشاہ کے ماتحت ہوتے تھے اور اساقفہ اور رؤسا، خانقاہ سب کے سب یکساں طریقے پر عنایت ایزدی کو مسلّم سمجھتے تھے۔ بعض اوقات دنیاوی امرا عنایت خدا کے ساتھ "عنایت شہنشاہ" کا اور مذہبی امرا "عنایت پوپ" کا بھی اضافہ کرلیتے تھے مگر آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ عنایت خدا کے فقرے کے مخصوص معنی یہ سمجھے جانے لگے کہ یہ اقتدار بلا توسط اور براہ راست خدا سے حاصل ہوا ہے اور کسی ماتحت کا حاصل شدہ اختیار ایک شئے جداگانہ ہے۔ اس فقرے کو ازمنۂ وسطیٰ کے اس میلان سے بہت زیادہ مناسبت تھی کہ تمام اقتدار خدا سے حاصل ہوا ہے۔

(ج) "اصلاح" کے بعد لوتھر کے ماننے والے عالموں نے پادلوس کے اس قول کو کہ "موجودالوقت اختیارات خدا کی مرضی سے قائم ہوئے ہیں" عیسوی معتقدات میں داخل کردیا اور صاحبان اقتدار کو خدا کا مقرر کردہ قائم مقام ثابت کرنے لگے۔ لوتھر خود اس معاملے میں بہت زیادہ آزاد خیال تھا اس نے ایک مرتبہ ہنری ہشتم شاہ انگلستان کو لکھا تھا کہ "مارٹن لوتھر کی جانب سے جو بعنایت ایزدی اہل کلیسا میں داخل ہے ہنری کو جو خدا کی عدم عنایت سے انگلستان کا بادشاہ ہے۔" جن مذہبی عالموں نے محض الفاظ کو پکڑ رکھا تھا انھوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ رسول پادلوس نے یہ قول رومی شہنشاہ نیرو کی نسبت کہا تھا جسے رومی قوم کی طرف سے اختیار حاصل ہوا تھا اور اس قول سے پادلوس کا اصل مقصد یہ تھا کہ اُن مذہب پرست یہودی صفت عیسائیوں کی رائے کی مخالفت کرے جو اس کافر شہنشاہ سے متنفر تھے۔ انھوں نے اس واقعے کو نظرانداز کردیا کہ رسول پتروس نے جب عیسائیوں کو انسانی حکومت کی اطاعت کی صلاح دی ہے تو اس کا بھی بالکل یہی منشا تھا۔ (پتروس باب دوم درس ۱۳)۔ وہ اس امر پر نازاں تھے کہ وہ دنیاوی بادشاہوں کے خدائی اختیار کے محافظ ہیں۔

(د) فرانس کے لوئس چہاردہم اور انگلستان کے جیمس دوم نے اس سے بھی

زیادہ قطعی طور پر "عنایتِ خدا" کو ایک سیاسی اعتقاد بنا کر بادشاہ کی مطلق العنانی کے لئے ایک اعلیٰ منظوری حاصل کرنا چاہی۔ ملک، خاندان، پارلیمنٹ، غرض تمام انسانی حقوق کے برعکس بادشاہ کے اقتدار کا بالتخصیص خدا کی طرف سے ہونا چاہا جاتا تھا۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہی تھا کہ اسے اختیار مطلق حاصل ہو جائے، یعنی وہ انسانی قانون کے دست رس سے بالاتر قرار دیدیا جائے۔ اس اثنا میں فرانسیسی طبقات نے بادشاہ کے منجانب اللہ ہونے کو از روئے قانون مان لینے سے انکار کیا اور انگریزی پارلیمنٹ نے اور بھی زیادہ زور کے ساتھ اس کی مخالفت کی۔ انگلستان کے انقلاب ۱۶۸۸ء اور فرانس کے انقلاب ۱۷۸۹ء نے اس مذہبی اصول کو قطعی طور پر مسترد کر دیا۔

(ھ) اس اصول کے نہایت مسلم دشمن جرمنی کے اہل قلم پفیین دورف اور تھوماسی ئیس تھے مگر اس کا سب سے زیادہ مخالف فریڈرک اعظم تھا۔ جس نے یورپی سیاسیات کی اس اصولی غلطی کو سمجھ لیا تھا۔

(و) زمانۂ حال میں اسٹال نے اس غلط خیال کو از سر نو جامۂ قبول پہنانے کی کوشش کی ہے اور مطلق العنان بادشاہ کی شخصیت کو مرجع اختیار قرار دینے کے بجائے اختیار کو فی نفسہ ایک خدائی حق بتا کر اسے از سر نو نظریۂ سلطنت میں خفیہ طور پر داخل کر دینے کی کوشش کی ہے مگر یہ فعل عبث ہے۔ دنیائے جدید اس کمزور خیال کے بے نتیجہ رشحات سے ہرگز فریب میں نہیں آسکتی۔

# آٹھواں باب

## (۳) نظریۂ جبر

قوت ہی حق کی دلیل ہے

سلطنت قہری تسلط کا نتیجہ ہے اور اس کی بنا زیادہ قوت رکھنے والے کے استحقاق پر ہے اکثر فلسفی اور ان سے بھی زیادہ مطلق العنان بادشاہ ہمیں یہی باور کرانا چاہتے ہیں عله۔ یہ اصول موضوعہ مطلق العنانی کے لئے مفید ہے کیونکہ اس سے ہر زیادتی حق بجانب ثابت ہو سکتی ہے مگر انقلاب پسند جس وقت اتنی قوت حاصل کر لیں کہ علانیہ اسے استعمال کر سکیں تو ان کی غرض بھی اسی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ حق کو پامال کرنے والی جابرانہ قوت اکثر اسی کو پسند کرتی ہے۔ یہ ایک طرح کا مغالطہ ہے، جو صرف طاقتوروں کو پسند ہے۔ وہ اس سے کمزوروں کو تباہ کر سکتے ہیں، مگر انھیں دھوکا نہیں دے سکتے۔ جو شخص اس اصول کا حامی ہو وہی اس کے فریب میں آ سکتا ہے۔ دوسرے اس فریب میں نہیں آ سکتے

آیا تاریخ کی تلقین یہی ہے

کہا جاتا ہے کہ تاریخ سے اس رائے کی صداقت ثابت ہوتی ہے، بیشک سلطنتوں کے قائم کرنے میں معاہدے سے زیادہ جبر کا اظہار ہوتا ہے مگر ایسا بہت کم ہوا ہے کہ محض جابرانہ

عله۔ پلوٹارک نے سوانح کمیلوس باب ۱۷ میں برینوس شاہ گال کی زبان سے یہ نظریہ ادا کیا ہے کہ "تمام قوانین میں سب سے قدیم تر قانون جو خدا سے لیکر بہائم تک وسیع ہے، قوی کو کمزور پر حکمراں بناتا ہے"

قوت نے خاص اپنے زور سے سلطنتیں قائم کردی ہوں اور ایسا ہوا بھی ہے تو ایسی سلطنتیں کبھی وسیع اور دیرپا نہیں ثابت ہوئی ہیں۔ علی العموم نئی سلطنتوں کے قیام میں اگر قوت کو خاص کر جنگ کی صورت میں دخل ہوا ہے، تو بھی یہ طاقت ہر طرح پر اصل دعاوی حق کے تابع تھی، وہ خود حق کا مخرج نہیں تھی بلکہ اس نے صرف ان موانعات کو رفع کردیا تھا جو "حق بحقدار رسید" میں حائل تھے۔ قوت نے حق کو پیدا نہیں کیا بلکہ اس کی تائید کی اور اس کے تسلیم کئے جانے پر لوگوں کو مجبور کیا۔ تاریخ میں جہاں کہیں قوت اپنی وحشیانہ سختی کے ساتھ رونما ہوئی ہے وہاں یہی ثابت ہوا کہ اس میں کسی نئی چیز کے پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے بلکہ وہ بنی بنائی چیزوں کے بگاڑنے کا اور موت و تباہی کا ایک آلہ ہے۔

یہ اصول موضوعہ شخصی آزادی کے خیال کا نہایت ہی سخت مخالف ہے۔ یہ اصول صرف آقا اور غلام کو جانتا ہے۔ آزاد شخص سے آزاد شدہ شخص مراد لیتا ہے۔ اسی طرح یہ اصول حق اور قانون کے خیال کا بھی سختی کے ساتھ مخالف ہے، اس لئے کہ قانون میں روحانیات اور اخلاق کو بہت زیادہ دخل ہے اور برخلاف اس کے اصول مذکور، ظاہری قوت کی وحشیانہ برتری کو تخت حکومت پر متمکن کرتا ہے۔ طاقت محض کو حق کی خدمت گزار بننا چاہئے۔ پس اگر وہ خود حق بننے کا ادعا کرے تو وہ اپنے مالک کے خلاف سرکشی کرتی ہے [علہ]

اس اصول میں صداقت کا جزو

تاہم اس اصول کی غلطیوں میں بھی کسی قدر صداقت کا شائبہ مضمر ہے۔ سلطنت کے لئے جو اجزاء لابدی ہیں ان میں سے ایک جزو یعنی قوت کو یہ اصول نمایاں کرتا ہے اور مخالف نظریے کے مقابلے میں، جو سلطنت کی بنا افراد کی آزادانہ مرضی پر قرار دیتا اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سلطنت کی اقتداری طاقت سلب ہو جاتی ہے، یہ اصول گو نہ حق بجانب ہے۔ یہ اصول ظاہری صورت کی حقیقت اور لاحق حالات پر زیادہ زور دیتا اور محض خیالی خوابوں کے

علہ۔ اشمٹ ہنر (علم السیاست" ج ۱، ص ۱۳ میں) نے اسی بحث سے متعلق روسو کے اس نفیس مقولے کو نقل کیا ہے کہ "قوی سے قوی بھی اپنی قوت کا سکہ سلطنت کے معاملے میں نہیں بٹھا سکتا جبتک کہ اس میں یہ قابلیت نہ ہو کہ اپنی قوت کے غلبے کو قانون اور محکوموں کی اطاعت شعاری میں مبدل کر سکے"۔ (دیکھو روسو کی کتاب "معاہدہ معاشری" Contract Social ج ۱، ص ۳۔

پورا کرنے کی عبث کوششوں کے خلاف (جہاں فطرتی قوتوں کے آپس میں تصادم ہوتا ہو) متنبہ کرتا ہے۔

طاقت کے بغیر نہ کوئی سلطنت وجود میں آسکتی ہے اور نہ قائم رہ سکتی ہے۔ اندرونی اور بیرونی دونوں قسم کی ضرورتوں کے لئے طاقت کی حاجت ہے۔ طاقت جب پائدار اور دیرپا صورت پیدا کرلیتی ہے تو پھر وہ حق کے ساتھ واسطہ پیدا کرنا چاہتی ہے اور اکثر وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے یعنی وہ حق کے ذریعے سے خود کو تسلیم کرانا اور پاک اور محترم بنانا چاہتی ہے۔ حق کے بغیر قوی کا زور محض بہائم کا سا زور ہے، وہ ایک بھیڑیا ہے جو بکری کو پھاڑ کر ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ مگر حق سے مل کر یہی زور انسان کی اخلاقی طبیعت کے سزاوار ہو جاتا ہے۔

# نواں باب

## (۴) نظریۂ معاہدہ

معاہدۂ معاشری کے نظریے کا اثر

خاصکر روسو کے وقت سے اس نظریئے کو بہت وسیع قبول عام حاصل ہو گیا ہے کہ سلطنت خالص معاہدے یعنی باشندوں کے آپس کے قرارداد کا نتیجہ ہے۔ اس سے لوگوں کے عجب و تمکنت کو بڑی شہ ملی کیونکہ ہر شخص اپنے تئیں ایک بانی سلطنت خیال کر سکتا تھا۔ یہ نظریہ ہر شخص کی خواہش کے موافق ہو سکتا تھا کیونکہ ہر شخص جس طرح چاہتا اس معاہدے کے شرائط کی تاویل کر سکتا تھا۔ فرانسیسی انقلاب کے زمانے میں اس نظریئے کو نہایت ہی مہلک اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ اس کی مدد سے قدیم سیاسی صور و اشکال شکست کر دئے گئے اور مختلف طرح سے کوششیں کی گئیں کہ اس کھنڈر پر ایک ایسی نئی عمارت تعمیر ہو جس سے ہر شخص راضی ہو سکے مگر کبھی اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن اگرچہ یہ نظریہ انقلاب کا نہایت مقبول اصول تصور کیا جاتا ہے تاہم اس سے قبل اس نظریئے سے مطلق العنان حکومت کی حقیقت ثابت کرنے کا کام بھی بارہا لیا جا چکا تھا (الف)۔

---

(الف) یہ مدنظر رکھنا چاہئے کہ ہابس، لاک اور روسو نے نظریۂ معاہدہ کو مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ہابس کی رائے کے موافق لیوی یاتھن باب ۱۷ انسان حالت فطرت سے حالت معاشرت میں صرف اسطرح

نظریۂ جبر (قوت) کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کا عکس یہاں صادق آتا ہے۔ نظریۂ جبر عام طور پر قوت کی مطلق العنانی کا موید ہے مگر مستثنیٰ صورتوں میں انقلاب کے نتائج کے لئے اسے عذر آپیش کر سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے نظریۂ معاہدہ خصوصیت کے ساتھ لاحکمیت کا معاون ہے، مگر مستثنیٰ صورتوں میں وہ قلیل التعداد گروہوں کو دبانے میں مطلق العنان کثیر التعداد گروہوں کا مطلق العنان کثرت کے قلت پر زیادتی یا اطاعت پذیر مفتوحوں پر ظلم کرنے کے معاملے میں فاتح کا مددگار بھی ہوتا ہے۔

یہ نظریہ واقعات تاریخی کے خلاف ہے

یہ نظریہ اپنی ہمہ گیر صحت کا دعویدار ہے اس نظریے کی رو سے تمام سلطنتوں کا وجود میں آنا اور بعض امور کے لحاظ سے ان کا قائم رہنا بھی معاہدے پر منحصر ہے۔ مگر تاریخ میں جس نے

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) آتے ہیں کہ وہ اپنے حقوق کسی ذی اختیار (بادشاہ) کو سپرد کر دیں (یہ ذی اختیار شخص ایک ہو، چند ہوں یا کثیر التعداد ہوں)۔ لاک (رسائل حکومت" کتاب دوم باب ۲ دفعہ ۶ میں) حقوق یعنی آزادی اور ملک کو ایسا قرار دیتا ہے کہ وہ حالت فطرت میں موجود ہیں۔ پھر "ابتدائی اجتماع" کے ذریعے سے حکومت کی ایک شکل قائم کی جاتی ہے تاکہ یہ حقوق محفوظ ہو جائیں (یہ مدنظر رہے کہ لاک اجتماع کا لفظ استعمال کرتا ہے نہ کہ معاہدے کا)، روسو کے خیال کے موافق انسان حالت فطرت سے حالت معاشرت میں معاہدۂ معاشری کے ذریعے سے آتا ہے (یہی نظریہ ہابس کا ہے) مگر یہاں وہ "ذی اختیار" جسے سب اپنے حقوق تفویض کر دیتے ہیں وہ خود قوم ہے پس اس طرح ہر شخص بادشاہ بھی ہے اور رعایا بھی (دیکھو اس کی تصنیف "معاہدۂ معاشری" (Contrat social). ج ۱، باب ۶) یہ اقتدار فرمانروائی ناقابل انتقال ہے (جلد ۲، باب ۱) حکومت معاہدے سے نہیں قائم ہوتی (ج ۳، باب ۱۶) بلکہ حکومت صرف مرضی عامہ کو عمل میں لاتی ہے اس طرح ہابس کے قول کے موافق حکومت موجود الوقت کے خلاف جسے وہ بادشاہی کے مرادف قرار دیتا ہے کسی قسم کا انقلاب حالت فطرت اور لاحکومیت کی طرف بازگشت کرتا ہے، اور یہ کسی طرح جائز نہیں قرار دیا جا سکتا لاک کے قول کے موافق انقلاب اس وقت حق بجانب ہو سکتا ہے، جب حکومت اپنے کار مفوضہ یعنی آزادی شخصی کی حفاظت کرنے سے معذور ہو جائے۔ روسو کے قول کے موافق انقلاب صرف وزارت (قوت عاملہ) کا تغیر ہے۔ عام خیال کے بالکل برعکس لاک حکومت اور رعایا کے کسی معاہدے کا مطلقاً کوئی ذکر نہیں کرتا، اس کا نظریہ قریب قریب وہی ہے جو روسو کا ہے۔ ٹی۔ ایچ گرین کے تصانیف جلد ۲ ص ۳۶۶-۳۹۲- انگریزی مترجم]

تکوینِ سلطنت کے متعلق ہمارے لئے معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ مہیا کر دیا ہے ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس میں فی الواقع افراد کے باہمی قراردادوں اور معاہدوں سے کوئی سلطنت پیدا ہوئی ہو البتہ بعض منفرد مثالیں ایسی ہیں کہ دو یا زائد سلطنتوں کے درمیان ایسے معاہدے ہوئے ہیں جن سے ایک نئی سلطنت پیدا ہو گئی۔ ایسی بھی چند صورتیں موجود ہیں جن میں بادشاہوں یا سرداروں نے قوم کے مخصوص درجات یا طبقات کے معاہدے سے نئے نظام سلطنت قائم کر لئے ہیں مگر ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس میں تجارت یا بیمے کی کمپنی کی طرح ملک کے "ہم رتبہ" شہریوں نے شرکت باہمی سے کوئی سلطنت قائم کر لی ہو اس خیال کی بھی تاریخ سے کسی طرح تائید نہیں ہوتی کہ بقائے سلطنت افراد کے درمیان مسلسل تجدید معاہدہ پر منحصر ہے بلکہ بجائے اس کے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر فرد رکنِ سلطنت کی حیثیت سے پیدا ہوتا اور تربیت پاتا ہے اور قبل اس کے کہ وہ اس حد کو پہنچے کہ اپنی کوئی رائے قائم کر سکے اور اس رائے کو ظاہر کر سکے اس کی پرداخت، نشو و نما اور تعلیم معین قومی اور ملکی خصائص کے موافق پوری ہو چکتی ہے۔

پس تاریخ کی شہادت قطعاً اس نظریئے کے خلاف ہے۔ جس زمانے میں معاہدہ معاشری کے اصول کے ماننے والے زیادہ سے زیادہ تعداد میں تھے اور یہ نظریہ اپنے اثر میں نہایت کامل تھا اس زمانے میں بھی اسے کبھی یہ قدرت نصیب نہیں ہوئی کہ فطرت کی واقعیت پر جس سے وہ متناقض تھا غالب آ گیا ہو۔ یہ البتہ ہوا کہ قوم آزاد اور ہم رتبہ "شہریوں" میں منقسم ہو گئی تھی مگر قلت کی ابتدائی مجالس تک میں کثرت کے ساتھ میزان نہ بٹی اور کثرت اس طرح عامل رہی گویا اس کی مرضی کو فوقیت ہے اور صرف اسی کی مرضی کو اقتدار حاصل ہے نظامِ سلطنت کو وضع کرنے والی عام مجلس (Constituent assembly) کے نسبت بیشک یہ خیال کیا گیا تھا کہ وہ ملک کے جملہ باشندوں کی قائم مقام اور ان کی پسند کردہ ہے اور اس کا مفوضہ کام یہ تھا کہ وہ بالاتفاق ایک نظام حکومت قرار دے اس میں بھی انفرادی معاہدے کے بجائے طریق کار نے یہ صورت اختیار کی کہ ایک متحدہ جماعت ہر کام کا فیصلہ کر لیتی تھی۔ لوگوں نے معاہدے کا ایک "وہم" پیدا کر لیا تھا اور خود اپنے کو اور دوسروں کو افراد کی مرضی کہہ کر دھوکا دیتے تھے حالانکہ کثرت سب کی طرف سے آلہ کار بن کر اختیارات کو اس طرح کام میں لا رہی تھی کہ یہ اختیارات اکثر ناقابل برداشت

یہ نظریہ منطق کے بھی خلاف ہے

ظلم کی حد کو پہنچ جاتے تھے۔[۲]

یہ نظریہ جس طرح تاریخ سے غلط ثابت کیا گیا اسی طرح معقولی تنقید کے سامنے بھی وہ نہیں ٹھہر سکتا۔ یہ نظریہ معاہدہ کرنے والے افراد کی آزادی اور ان کی مساوات کو مسلم سمجھتا ہے، مگر سیاسی آزادی جو یہاں پہلے ہی مان لی گئی ہے صرف سلطنت کے اندر ہی ہو سکتی ہے سلطنت سے باہر اس کا ہونا خیال میں بھی نہیں آ سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ انسان میں اس آزادی کا شوق بالکل اسی طرح موجود ہوتا ہے جس طرح اس میں سلطنت کے ولولے اور اس کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے مگر اس آزادی کا عملی حصول سلطنت کے عضوی تعلقات باہمی کے باہر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مزید براں اگر انسان سب برابر ہوتے تو سلطنت کبھی وجود میں نہ آ سکتی اس لئے کہ "سیاسی" مراتب کی غیر مساوات، جس کے بغیر نہ کوئی حاکم ہو سکتا ہے نہ محکوم ہو سکتا ہے، سلطنت کے وجود کے لئے ایک لازمی شرط ہے[۱]۔ مزید براں اس نظریے کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ افراد کو معاہدہ کرنے والا فرض کرتا ہے۔ افراد اگر معاہدہ کرتے ہیں تو اس سے شخصی حقوق پیدا ہوتے ہیں سلطنتی حقوق ہرگز نہیں پیدا ہوتے۔ ایک منفرد شخص کی حیثیت سے کسی کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کی ذاتی املاک اور اس کا شخصی مقبوضہ ہوتا ہے۔ اس پر اسے پورا اختیار ہے اور اس کے متعلق وہ جو چاہے معاہدہ کر سکتا ہے۔ مگر معاہدوں کو سیاسی نوعیت اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتی جبتک کہ پہلے ہی سے افراد سے بالاتر ایک متحدالاغراض جماعت نہ موجود ہو، کیونکہ معاہدہ اگر سیاسی ہوتا ہے تو وہ افراد کی ذاتی بہبود سے بحث نہیں کرتا بلکہ جماعت کی عام بہبودی سے بحث کرتا ہے۔

غرضکہ افراد کے باہمی معاہدے سے نہ کوئی قوم پیدا ہو سکتی اور نہ کوئی سلطنت، انفرادی مرضیوں کے مجموعے سے کوئی مشترک مرضی نہیں پیدا ہوتی۔ شخصی حقوق کتنی ہی بڑی تعداد میں کیوں نہ شرک کر دئے جائیں مگر ان سے کوئی حق عامہ نہیں پیدا ہوتا۔

---

[۱] روسو (ج ۱، ص ۷) ایک ابتدائی اتحاد رائے کو فرض کرتا ہے جس سے اس کے خیال میں بعد کو کثرت کا قانون پیدا ہوا، اگر یہ فرضی شکل بھی تناقض کو رفع نہیں کرتی۔

[۲] ارسطو۔ "سیاسیات" (جلد ۲۔ ۱، ۴)

یہ نظریہ عملاً خطرناک ہے

عملی سیاسیات کے لئے یہ اصول نہایت درجہ خطرناک ہے کیونکہ یہ اصول سلطنت اور اس کی تنظیمات کو افراد کی حرص وہوس کا ایک شگوفہ بنا دیتا ہے اور موجود الوقت افراد کی مرضی کے موافق اسے قابل تغیر قرار دے دیتا ہے۔ یہ قانون عامہ کے تصور کو تباہ کر دیتا ہے، باشندگان ملک کو غیر آئینی حرکات کے لئے اکساتا ہے اور سلطنت کو غایت درجے کی بے اطمینانی اور ابتری کے لئے وقف کر دیتا ہے اس لئے اسے ایک سیاسی اصول سمجھنے کے بجائے لاحکمیت کا نظریہ سمجھنا زیادہ موزوں ہے۔

تاہم اس میں صداقت کا کچھ عنصر بھی ہے

بایں ہمہ اس نظریئے میں بھی صداقت کا کچھ عنصر مضمر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نظریئے کی غلطی سخت دھوکے میں ڈالنے والی اور نہایت ہی خطرناک ہے پھر بھی اسی کے اندر ایک ایسی سچائی بھی چمک رہی ہے جو ہر شخص کو دکھائی دے رہی ہے۔ اس نظریئے کے مقابلے میں جو سلطنت کو محض فطرت کی پیداوار سمجھتا ہے یہ نظریہ اس امر واقعی کو ابھارتا ہے کہ انسانی مرضی سلطنت کی تکوین کو متعین و متاثر کر سکتی ہے اور اس کا ایسا کرنا ایک جائز فعل ہے خلاف عقل استبداد کے مقابلے میں یہ نظریہ انسانی آزادی کے حقوق کی حمایت کرتا ہے اور سلطنت کے مطابق عقل ہونے کو ثابت کرتا ہے۔

# تعلیقات

۱۔ ارسطو کے اس مشہور جملے سے کہ سلطنت منفرد شہریوں سے اسی طرح سابق ہے جس طرح کل، جزو سے سابق ہے ("سیاسیات"، ج ۱، فصل ۲، فقرہ ۱۲) اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ افراد سلطنت کو پیدا کر سکتے اور بنا سکتے ہیں۔ ایک سیاسی فرد یا شہری جسم سلطنت کا صرف ایک عضو ہے اور کل سے علیحدہ ہو کر اس کی کوئی ہستی عضوِ سلطنت کی حیثیت سے باقی نہیں رہ سکتی۔

۲۔ سلطنت کو افراد کی مرضی پر مبنی جاننے کی غلطی کا تعلق ایک دوسری غلطی سے ہے جو بہت زیادہ رائج ہے اور جس میں وہ لوگ بھی جو نظریۂ معاہدہ کو مبتذل سمجھتے ہیں اکثر مبتلا ہیں یعنی یہ فرض کر لینا کہ حق یا قانون، "آزاد مرضی" ہی کا نتیجہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی آزاد مرضی کو یہ قدرت ہے کہ وہ بعض حالتوں میں حق یا قانون کو وضع کرے، بدلے یا اسے نئی شکل میں ڈھالے لیکن حق و انصاف کا بیشتر حصہ نظم عالم فطرت انسانی اور حالات ماحول کے بموجب ازل سے متعین ہو چکا ہے اور انسانی مرضی سے کلیتہً آزاد ہے۔ حق کا سب سے زیادہ حصہ وہ ہے جو ایجاد نہیں کیا جاتا بلکہ منکشف ہوتا ہے اور لوگ اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ وہ دستیاب ہو جاتا ہے، بنایا نہیں جاتا۔ قانون کے پیدا کرنے میں "ہم چاہتے ہیں" کے بجائے "تمہارا فرض ہے" زیادہ موثر ہے۔ ہیگل نے حق کا استخراج مخصوص انفرادی مرضی سے نہیں بلکہ "مرضی صادق" سے کیا ہے جو انسان کے اندر مرکوز اور از خود قائم ہے، لیکن اس نے بھی

حق کی نوعیت کو صحیح طور پر سمجھا نہیں ہے گو کہ نظریۂ معاہدہ کی غلطی کو اس نے پوری طرح سے سمجھ لیا ہے دیکھو فلسفۂ حقوق" ( Rechtsphilosophie )، فقرہ ۲۵۸ ) ۳۔ جینیوا (ژنیو) کے شہری، روسو نے اپنی قوت مناظرہ کے زور سے عام رائے میں نظریۂ معاہدہ کو فتحمند کر دکھایا۔ ایک دوسرے سوِس یعنی شہر برن (سویٹزرلینڈ) کے پٹریسی لڈوگ فون ہلر نے مروجہ عقیدۂ قانونِ فطرت پر بہت شدومد سے حملہ کیا اور نظریۂ معاہدہ کو پوری طرح سے باطل ثابت کر دکھایا لیکن اسے اپنے طریق کے مثبت حصے میں جسے وہ "رجعت" کہتا تھا کم کامیابی ہوئی۔ اس کے اصول کو نظریۂ قوت میں خلط ملط کر دینا اور اسے ہر طرح کی مطلق العنانی کا موئید سمجھنا حق بجانب نہیں ہے۔ بلکہ جسطرح روسو انقلاب کا معلم ہے اسی طرح وہ رجعت قہقری کا معلم ہے۔

ہلر سلطنت کی بنیاد اس فطری قانون پر قائم کرتا ہے کہ قوی تر حکمراں ہوتا ہے۔ ساری حکومت اور ساری ماتحتی کا انحصار وہ ایک کی فوقیت اور دوسرے کی حاجت پر قرار دیتا ہے اسے وہ خدا کا ایک ابدی اور نہ بدلنے والا نظم جانتا ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ اس کے نزدیک قوت جبر کے ہم معنی نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں کے فرق کو وہ زیادہ تفصیل کے ساتھ یوں بتاتا ہے: "قوت کو احساسِ فرض کے اس اخلاقی قانون نے محدود کر رکھا ہے جسے خدا نے انسانوں کے دلوں پر نقش کر دیا ہے جس کا اظہار بچوں کی قوت امتیازی سے اور نیز تمام قوموں میں تمام وقتوں میں ہوتا رہتا ہے وہ اخلاقی قانون یہ ہے کہ بدی سے بچو اور نیکی کرو اور کسی کو صدمہ نہ پہنچاؤ اور جو جس کا ہے وہ اسی کے پاس رہنے دو، قانون عدل، اور قانون الفت، طاقت کو تعدی کی شکل اختیار کرنے سے بچاتے رہتے ہیں۔ یہ دونوں قانون خدا نے انسان کے اندر جما دئے ہیں وہ اس کی پیدائشی صفت ہو گئے ہیں اور وہ عالمگیر اور لابدی، ابدی اور ناقابل تغیر ہیں۔ ہر شخص انھیں سمجھ سکتا ہے اور جس بلند ترین اور قوی ترین شخص کے تابع تمام انسانی قوانین ہوں اسے بھی کوئی شخص ان قوانین کی پابندی سے آزاد نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ قوانین نہایت ہی نرم اور نہایت ہی محبت آمیز بھی ہیں، ان کی پابندی آسان اور ان کا بار ہلکا ہے۔ اس فرض شناسی کے قانون کی بنیاد نہ تو تمام قوم کی مرضی ہے، نہ عام نفع کا خیال، نہ کسی انسانی زیادتی کا خوف، بلکہ صرف خدا کی مرضی اس کی اصل ہے اور اس وجہ سے صاحب قوت پر اس کا پورا پورا اطلاق ہوتا ہے۔ اس سے کسی طرح بھی تجاوز کرنا قوت کے ناجائز استعمال کی حد میں داخل ہو جاتا ہے، خواہ اس کا ارتکاب کسی چھوٹے سے خاندان

کے بزرگ سے ہو یا کسی بڑے سے بڑے بادشاہ سے۔ اس سے عدل و حمیت کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ عدل کا مطالبہ قوی سے اسی طرح ہونا چاہئے جس طرح کمزور سے۔ محبت اور بخشش طبیعت انسانی کا شریف ترجزو ہے اور انسان سے اس کی توقع کی جانا چاہیئے۔ اعلیٰ ترین طاقت کی امکانی غلط روی کا کوئی چارۂ کار انسانی انتظامات کے ذریعے نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ کے مقابلے میں کوئی انسانی حکم نہیں ہے۔ سوا خدا کی مدد کے اور کوئی علاج نہیں ہے۔ بقول پلوٹارک کے خدا کا اعتقاد ہی تمام انسانی نظم معاشرت کا واسطہ ورابطہ اور عدل کا پشتیبان ہے۔ صرف مذہب ہی وہ شئے ہے جو قوت کو اس کی حد کے اندر رکھ سکتی ہے اور کمزور کی تقویت کا باعث ہو سکتی ہے۔

ہلر کے اصول (مسلمات) کے خاص مباحث کو ہم نے اسی کے الفاظ میں ادا کر دیا ہے یہ عجیب بات ہے کہ وہ حق کو اور سلطنت کو عدل پر نہیں بلکہ قوت پر مبنی کرتا ہے اور اول الذکر کو ثانی الذکر کے لئے ایک حد بندی سمجھتا ہے۔ اس کی رائے میں قوت اور صرف قوت ہی سے حق کا ظہور ہوتا ہے جس قدر قوت بڑھی ہوئی ہو گی اسی قدر حق بھی بڑھا ہوا ہو گا گو اس کے برخلاف اصلیت یہ ہے کہ قوت بجائے خود واقعتاً ضرور ایک شئے ہے مگر قانوناً مسلم نہیں ہے۔ یہی سلسلہ خیال ہلر کے سارے نظام استدلال میں جاری وساری ہے۔ طاقت واقعیٔ کے احترام کی وجہ سے وہ اکثر قانون کی انتہائی اخلاقی خصوصیت کے دیکھنے سے باز رہتا ہے، اعلیٰ ترین طاقت اور بادشاہ کے حق کو ہر طرح کی مدافعت سے محفوظ کرنے کی خواہش سے رعایا کی ان تمام کوششوں کی طرف سے جو اس اعلیٰ طاقت کے غلط استعمال کے خلاف ہوں اور اس کے عملدرآمد کو محدود کرنا چاہیں ایک طرح کی حقارت ونفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسانی تطاول کے مقابلے میں انسانی انتظامات کے ذریعے سے خدائی قانون فرض کی حفاظت کرنا ایک جرم ہے، اس لئے ہلر تمام آئینی طریق کا مسلمہ مخالف ہے اور از منہ وسطیٰ کے اس خیال کی کہ شاہی ایک ملک ہے وہ نہایت غلو کے ساتھ تدوین کرتا ہے۔

[ بلنچلی کی اس باب کی تنقید کے لئے فونہیلے کی علم معاشرت

ہم عصر" (A. Fouillee. La Science Sociale Contemporaine)
باب اول دیکھنا چاہیئے موسیو فوہیے معاہدۂ معاشرتی کے نظریے" کی اس
خیال سے حمایت کرتا ہے کہ اس سے کامل ترین سلطنت کا اظہار ہوتا ہے
انگریزی مترجم۔]

---

# دسواں باب

## (۵) انسان کی فطری تمدن پذیری اور اس کا سیاسی احساس

سلطنت فطرت انسانی کے وجدان معاشری سے پیدا ہوتی ہے

مروجہ تخمینی نظریوں کا مسترد کر دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ ضرورت ہنوز باقی ہے کہ ہم سلطنت کے اشکال ظاہری کی متعدد ہیئتوں سے ممیز، اس ایک سبب کو دریافت کریں جس سے سلطنت کی تکوین ہوئی ہے یہ مشترک سبب جو تمام تکوین سلطنت کی علت العلل ہے ہمیں انسانی فطرت میں ملتا ہے فطرت انسانی میں اس کے انفرادی اختلافات کے ساتھ ساتھ اجتماع واتحاد کے میلانات بھی موجود ہیں یہ میلانات ترقی کرتے ہیں اور لوگوں ( People ) میں ایک قوم بننے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اس احساس کے مناسب حال ایک ظاہری صورت قائم ہو جائے۔ پس اس طرح معاشرت کا یہ باطنی وجدان ایک مردانہ خود اختیاری حکومت کی صورت میں مشترک زندگی کا ایک بیرونی نظم پیدا کر دیتا ہے، یعنی اس سے سلطنت کی شکل رونما ہو جاتی ہے۔

یہ معاشری وجدان غیر وقوفی درجہ سے گزر کر وقوفی درجہ پر آجاتا ہے

سلطنت بنانے کا یہ معاشری میلان ابتدا میں محض جبلت کی بنا پر عمل کرتا ہے ارادے کو اس میں دخل نہیں ہوتا ہے۔ بہت سے لوگوں کی نظریں ایک ساتھ کسی ایسے سردار پر پڑتی ہیں جس کی اعلیٰ ہمت اور دماغی قابلیت کے وہ قائل ہوتے ہیں اور اپنی جماعت کے اعلیٰ فرد کی حیثیت سے اس کی عزت کرتے ہیں اور وہ اس پر بھروسا بھی رکھتے ہیں

اور اس سے ڈرتے بھی ہیں۔ پس وہ اس کے تحت میں خود کو منتظم کرتے اور اس کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں۔ مگر تمدن اور تجربے کی ترقی کے ساتھ پوشیدہ وجدان بتدریج ظاہر ہونے لگتا ہے اور سلطنت کے لئے وقوف وارادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک طبعی امر ہے کہ اولاً اس کا احساس قوم کے رہبروں اور سرداروں ہی کو ہوتا ہے ان میں سلطنت کا مستعدانہ وقوف اور اس کے لئے منتظم و موثر ارادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر عام محکومین ہنوز سلطنت کے انفعالی وقوف سے آگے نہیں بڑھتے۔ آہستہ آہستہ یہ وقوف نظم معاشرت کے اعلیٰ جماعات و طبقات میں بڑھتا جاتا ہے اور بالآخر نیچے کے جماعات و طبقات میں بھی سرایت کر جاتا اور ان میں بھی فاعلی اور موثر ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔

فطرت انسانی میں اس سیاسی میلان کا پہلے بلا وقوف اور بعد میں باوقوف حیثیت سے تسلیم کرنا سلطنتوں کی تاریخی آفرینش کے مخالف نہیں بلکہ اس کا واضح کرنے والا ہے طاقت رکھنے والوں میں اس سے غلبہ حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ کمزوروں میں یہ غلامانہ اطاعت کی صورت اختیار کر لیتا ہے مگر آزاد لوگوں میں یہ احساس فہم وادراک کے ذریعے درخشاں اور اس اخلاق خود شناسی سے مملو ہو جاتا ہے جو اجتماعی وقوف اخلاقی کے ہمنوا ہوتی ہے۔ صرف آزاد سلطنت ہی سچی سلطنت ہے کیونکہ صرف اسی میں وہ عام سیاسی جذبہ پایا جاتا ہے جو تمام طبقات قوم میں جاری و ساری ہوتا ہے

اس رائے میں جسے قدما بھی اس سے پہلے ظاہر کر چکے ہیں[۱] وہ تمام صحیح خیالات شامل ہیں جو غلط تخمینی نظریوں میں پائے جاتے ہیں مگر اس کے ساتھ ان کی غلطیاں اس میں داخل نہیں ہیں۔ سلطنت بالواسطہ ربانی ہے کیونکہ خدا ہی نے معاشرتی وجدان فطرت انسانی میں ودیعت کیا ہے اور اس طرح سلطنت کا صورت پذیر ہونا اسی کی مرضی سے ہوا ہے۔ پس ہمارے اس اعلان سے کہ سلطنت کی ابتدا ئے کار انسان کے عمل واقعی سے ہوئی ہے، سچے مذہبی احساس کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔ مزید براں ہماری اس رائے

اس رائے میں وہ تمام صداقتیں داخل ہیں جو مختلف نظریوں میں پائی جاتی ہیں

---

[۱] دیکھو اوپر باب (۹) تعلیق (۱) اور سسرو کی کتاب "جمہوریہ" ج ۱، فقرہ ۲۵: "قوم کا اولیں مقصد لوگوں کا باہم جمع ہو جانا ہے اور یہ کچھ اس سبب سے نہیں کہ انسان کمزور ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ اس وجہ سے کہ وہ بالطبع اجتماع کی طرف مائل ہے۔

میں قوت واثقی کی وہ اہمیت تسلیم کی گئی ہے جو تکوین سلطنت کے لئے لابد ہے۔ کیونکہ حقیقی طاقت فطرت انسانی کے وجدان عام پر منحصر ہے۔ آخر میں "مرضی آزاد" کے جزو کو بھی اس کے مناسب حقوق دیئے گئے ہیں مگر ہم منتشر انفرادی مرضیوں کے بجائے قوم یا سلطنت کی ایک مشترک مرضی کو تسلیم کرتے ہیں۔

قوم میں جس طرح اتحاد و تنظیم کا میلان (جسے ہم سیاسی میلان کہتے ہیں) طبعًا پایا جاتا ہے اسی طرح اس اجتماعی مرضی کا تخم بھی اس کی سرشت میں مضمر ہوتا ہے۔ یہ مشترک مرضی جب ظاہر ہوتی ہے تو وہ سلطنت کی مرضی بن جاتی ہے۔ برخلاف اس کے انفرادی مرضی اس حالت میں بھی انفرادی ہی رہتی ہے جب وہ افراد باہم کوئی معاہدہ کریں اس لئے اس مشترک مرضی کے لئے مناسب لفظ معاہدہ نہیں ہے بلکہ اس سے اگر مستقل نظم مقصود ہے تو اسے اجتماعی قانون کہنا چاہیئے، اسی طرح جیسے "حکم" وہ ہے جو ضبط انتظامی کی بنا پر ہو اور "فیصلہ" اسے کہیں گے جو نفاذ عدل کے لئے ہو سلطنت کے اندر وہ ذرائع عمل موجود ہوتے ہیں جن سے اجتماعی مرضی کو خود اپنا وقوف ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ارادوں کو مصمم کرنے اور ان کے عمل میں لانے کے قابل ہو جاتی ہے۔

سلطنت ایک ضروری عمل نیک ہے

پس سلطنت کوئی ایسا انتظام نہیں ہے جس کی غرض صرف بدخواہشوں کو قابو میں رکھنا اور گر ضرورت ہو تو روا باشد کی مصداق ہو بلکہ وہ ایک ایسا عمل نیک ہے جسے لازمًا و ضرورتًا ہونا چاہیئے سلطنت ہی کے ظہور پذیر ہونے سے یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اقوام (Peoples) اور نوع انسان بہ حیثیت مجموعی اپنے حقیقی باطنی اتحاد کو ظاہر کریں اور ایک آزاد اجتماعی ہستی پیدا کریں؛ سلطنت نظم مشترک کے اہتمام اور جملہ امور عامہ میں حیات مشترک کی تکمیل کی تنظیم ہے۔

جب اس طرح دیکھا جائے تو سلطنت اولًا ایک انسانی اور ارضی ہی تشکیل معلوم ہوتی ہے مگر اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ ہم ایک غیر مرئی کلیسا کے مذہبی خیال کے پہلو بہ پہلو ایک غیر مرئی سلطنت کا سیاسی خیال قائم کر دیں کیونکہ اول الذکر ایک طرح کا اجتماع جذبات ہے جو مذہبی طور پر متحد ہو گیا ہے اور ثانی الذکر وہ اجتماع جذبات ہے جو سیاسی طور پر متحد ہو گیا ہے۔ جس طرح اہل مذہب آسمان پر ایک زیادہ مکمل کلیسا کے ہونے کا ذکر کیا کرتے ہیں اسی طرح اہل سیاست

بھی دنیاوی سلطنت کو آسمانی سلطنت تک پہنچنے کا محض پہلا زینہ تصور کر سکتے ہیں۔
مگر واقعی کلیسا کی طرح واقعی سلطنت بھی وہی ہے جس میں ہم رہتے اور کام کرتے ہیں۔ علم السیاست کو صرف اسی سلطنت سے بحث ہے اور فطرت انسانی پر غور کرنے سے اس قسم کی سلطنت کی پوری طرح توضیح و تشریح ہو سکتی ہے۔

---

# پانچواں مقالہ

## سلطنت کی غایت

## پہلا باب

### سلطنت غایت ہے یا وسیلہ؟ کس حد تک غایت ہے اور کس حد تک وسیلہ؟

اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ سلطنت غایت المرام ہے یا وسیلة المرام یعنے سلطنت فی نفسہ مقصود بالذات ہے یا اس سے محض یہ غرض ہے کہ وہ افراد کے لئے حصول غایت کا وسیلہ ہو۔

نظریۂ قدیم سلطنت غایت المرام ہے

قدما کا خاصکر یونانیوں کا نظریۂ سلطنت؛ انسانی زندگی کا بلند ترین مقصد سلطنت کو سمجھتا تھا اور سلطنت ہی کو کامل انسانیت تصور کرتا تھا۔ اس لئے اس کا میلان اس طرف تھا کہ وہ سلطنت کو فی حد ذاتہ غایت المرام سمجھے۔ افراد کا جب سلطنت سے مقابلہ کیا جاتا تھا تو وہ محض اس کے اجزا معلوم ہوتے تھے، یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت سے علٰحدہ بھی ان کے کچھ شخصی حقوق ہیں۔ جس طرح جسم کا ہر عضو مجموعةً جسم کی خدمت کرتا ہے اسی طرح سلطنت کا ہر فرد سلطنت کا خدمتگزار تھا۔ سلطنت افراد کی خدمت گزار نہیں تھی۔ اس لئے

لوگوں کے ذاتی مفاد بلاتامل سلطنت پر قربان کر دئیے جاتے تھے، اور صاف تو یہ ہے کہ لوگوں کی ہستی اسی حد تک ضروری اور قابل قدر سمجھی جاتی تھی جس حد تک وہ سلطنت کے کام آسکتی تھی۔ اسی طرح ہر شخص کی آزادی، قومی آزادی کا محض ایک جزو سمجھی جاتی تھی اور جب کوئی شخص قوم و سلطنت کی بہبود عام کے خلاف اپنے خاص طریق پر آزادانہ چلنا چاہتا تھا تو نہ اس کی ہمت افزائی ہوتی تھی اور نہ اسکی حفاظت کی جاتی تھی۔

نظریہ جدیدہ سلطنت وسیلۂ المرام ہے

قدما کے اس اساسی نظریئے کے بالکل برعکس ان انگریز اور امریکی مصنفین کی رائے ہے جن کا یہ دعویٰ ہے کہ سلطنت فی نفسہ مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ وہ محض افراد کے حصول بہبود کا ایک ذریعہ ہے۔ میکالے نے اپنے تحریرات[1] میں متواتر یہ دعویٰ کیا ہے کہ قدیم مدبرین اور ماکیاویلی کی سیاسیات کا خاص نقص یہی ہے کہ یہ لوگ متاخرین کی طرح اس اصول اعظم کو تسلیم نہیں کرتے کہ نظامہائے معاشرت اور قوانین صرف شخصی خوشحالی کی مجموعی مقدار کے بڑھانے کے لئے ہیں۔ یہ فرقہ متاخرین، سلطنت کو محض ایک ایسی تنظیم یا کل سمجھتا ہے جس سے افراد کو اپنے جان و مال اور شخصی آزادی کی حفاظت حاصل ہوتی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ ایک مصنوعی آلہ ہے جو اس غرض سے پیدا کیا گیا ہے کہ تمام یا کم سے کم اکثر افراد کی بہبود اور خوشحالی کو بڑھائے اور ترقی دے۔ بیکن کے زمانے سے لیکر اب تک نہ صرف ارباب سیاست نے بلکہ ان ارباب فن نے بھی (جنھیں محض نظریات سے بحث تھی) جوش کے ساتھ اس رائے کی حمایت کی ہے جو شخص سلطنت کو محض افراد کا ایک مجموعہ سمجھتا ہے وہ فی الواقع اس رائے سے انکار نہیں کرسکتا۔ میکالے تو یہاں تک یقین کرتا ہے کہ جدید زمانے میں امور عامہ میں جو ترقی ہورہی ہے وہ بیشتر اسی نظریئے کے اثر سے ہے۔ روبرٹ فون مول اسے بالکل محال خیال کرتا ہے کہ انسان کو اور ایک ایسی تنظیم محض کو جو انسان کی بہتری کے لئے ہو یکساں اہمیت دیجائے۔

---

[1] دیکھو "میکالے کے مضامین" معمولی اشاعت صفحہ ۴۸ میں سے وہ مضمون جو اسنے ماکیاویلی پر لکھا ہے۔ انگریزی مترجم

دونو نظریے یکطرفہ ہیں

میرے نزدیک ان قدیم اور جدید دونوں دعووں میں صداقت کا ایک عنصر ضرور شامل ہے مگر دونوں میں یہ غلطی ہے کہ وہ معاملے کے صرف ایک ہی رخ پر نظر ڈالتے ہیں اور دوسرے رخ کو نظر انداز کر جاتے یا اس سے انکار کرتے ہیں۔

یہ سوال کہ "سلطنت وسیلہ ہے یا غایت ہے" ایک ایسا سوال ہے جس کا اسلوب ہی انسان کو صرف ایک رخ پر نظر کرنے اور اس سے غلطی میں پڑنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ ایک ہی شئے ایک نظر سے دوسرے مقاصد کے حصول کا ذریعہ معلوم ہوتی ہے اور دوسری نظر سے وہ خود اپنی غایت ہوتی ہے۔ ایک تصویر اکثر کسی مصور کی معاش یا کسی تصویر فروش کے نفع کا ذریعہ ہوتی ہے لیکن ایک اہل فن کی نگاہ میں اسکا انتہائی مقصود صنعت کا اعلیٰ کام ہوتا ہے اس میں اسے اپنی حیات کا نہایت ہی نمایاں اظہار اور اپنے منتہائے خیال کا مجسمہ نظر آتا ہے اس اعتبار سے اس کی غایت خود اسی میں ہوتی ہے، اسی طرح بلا شک وشبہ مناکحت میاں بیوی دونوں کی انفرادی ضروریات زندگی کے پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے اور اس سے دونوں کے لئے زیادہ مسرت آمیز زندگی ممکن ہو جاتی ہے مگر وہی مناکحت ان دو جنسوں میں اتحاد بھی قایم کرتی ہے جنھیں فطرت نے ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے اور اسی اتحاد سے خاندان کی بنا قایم ہوتی ہے، یعنی اسی اتحاد سے ایک اعلیٰ مجموعی فرد بن جاتا ہے اور تمام ارکان خاندان کی انفرادی ہستی اسی کے تابع ہوتی ہے۔ خاندان کا ہر رکن اس امر پر آمادہ رہتا ہے کہ وہ اپنے شخصی اغراض ومرضی کا ایک حصہ اس اعلیٰ مقصد پر قربان کر دے جو مناکحت اور خاندان پر محتوی ہے۔

یہی امر سلطنت پر بھی صادق آتا ہے۔ ایک طرف سلطنت اپنے مشتملہ افراد کے نفع کا ایک وسیلہ ہوتی اور دوسری نظر سے وہ خود اپنی غایت المرام ہوتی ہے اور افراد اس کی ضرورت کے تابع اور اسکی

خدمت پر مجبور ہوتے ہیں۔

نظریۂ قدیم کا خطرہ

متقدمین کی یکطرفہ رائے نے قوم کے اندر افراد کو نظر انداز کر دیا تھا اور اس سے افراد کی آزادی و بہبود سخت خطرے میں پڑ گئی تھی اور اسکا بلاواسطہ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کی قدرت مطلق کا تصور پیدا ہو گیا جو آسانی سے مطلق العنانی کی بتنذل صورت میں مبدل ہو گیا۔

نظریۂ جدید کا خطرہ

اسی طرح متاخرین کی یکطرفہ رائے جنھیں درختوں کے کھڑے ہونے کی وجہ سے جنگل دکھائی نہیں دیتا سلطنت کی عظمت و جلالیت کے تسلیم کرنے میں ناکامیاب رہی اور اس طرح اسکا میلان یہ ہو گیا کہ سلطنت کو افراد کے ایک پریشان انبوہ میں تحلیل کر دے اور اختلالِ سلطنت کی ہمت افزائی کا باعث ہو۔

افرادِ موجودہ کا خیال

متقدمین، سلطنت کے اس اہم فرض کی طرف توجہ کرنے میں ناکام رہے کہ شخصی آزادی اور سوادِ اعظم کی شخصی بہبود کا ترقی دینا سلطنت کا فرض ہے۔ متاخرین اربابِ سیاست یہ فخر کر سکتے ہیں کہ انھوں نے سلطنت کے اس فرض کو تسلیم کیا اور قدما کے بہ نسبت وہ اسے زیادہ وسعت کے ساتھ عمل میں لائے۔ موجودہ زمانے میں وہ حکومت ضرور حقارت اور نفرت کی مستوجب ہے جس کا طرز عمل یہ ہو کہ افراد کی بہبودی ایک گیند ہے جسے حکمراں اپنی خواہشِ نفس کے موافق جدھر چاہیں لڑھکاتے رہیں یا اسے محض اتفاقاتِ زمانہ کے بھروسے پر چھوڑ دیں۔ اب یہ امر مسلم ہو چکا ہے کہ قانون اور اس کے عمل میں لانے والے افراد پر محض حکمرانی نہیں کرتے بلکہ وہ ان کی نہایت ہی ضروری اہم خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس زمانے کی بہت سی کارآمد اور نفع بخش تنظیمات کی اصل اسی خیال پر مبنی ہے۔ یہی وہ شئے ہے جس سے ازمنۂ جدیدہ کی شخصی آزادی اور آزادی رائے کا پتہ چلتا ہے۔ عیسائیت نے اس سے مذہبی زندگی میں کام لیا اور ٹیوٹنیوں کے احساس قانون نے اسی کو افراد کی تمام قانونی ہستی پر

عائد کیا۔

سلطنت ایک شئے واقعی ہے

مگر باوجود اسکے یہ دعویٰ کرنا ایک منطقی اور سیاسی غلطی ہے کہ سلطنت محض افراد کے ذاتی اغراض کے لئے ہے اور نظم و نسق سلطنت کی کوئی غرض سوا اسکے اور کچھ نہیں ہے کہ وہ افراد کی بہبود کا خیال کرے۔ اس قسم کا ادعا سلطنت کے اصلی جوہر ہی کو برباد کردے گا اور "قانون عامہ" کو محض "قانون شخصی" کی ایک تمہید بنا دے گا۔ جن قوموں میں مردانگی ہوتی ہے ان میں سلطنت کے خطرے یا ضرورت کے وقت ہزارہا آدمی بار گراں برداشت کرنے اور اپنی جانوں اور اپنے خاندانوں کو خطرے میں ڈالنے کے لئے آمادہ ہوجاتے ہیں۔ اس جذبۂ ایثار کی تعبیر سوا اس خیال کے اور کسی طرح پر نہیں ہوسکتی کہ یہ لوگ سلطنت کی حفاظت و بہبود کو اپنی ذاتی حفاظت و بہبود پر ترجیح دیتے ہیں، اگر سلطنت صرف انفرادی اغراض کے پورا کرنے کا وسیلہ ہوتی، اگر قوم کی مجموعی زندگی افرادِ کثیر کی زندگی سے کوئی بلند تر حقیقت نہ رکھتی ہوتی تو پرانے وقتوں کے سورماؤں نے جو کارہائے نمایاں کئے ہیں وہ محض مجنونانہ حماقت سمجھے جائیں گے۔ قومی زندگی کو جب مشکلات شدیدہ و خطرات عظیمہ کا سامنا پیش آجاتا ہے تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ سلطنت محض باہمی بیمے کی کمپنی نہیں ہے بلکہ کوئی اعلیٰ و ارفع شئے ہے جس وقت وطن کی محبت کے شعلے بھڑک رہے ہوں اس وقت افراد کی خود غرضانہ حرص و ہوس جل کر خاک ہوجاتی ہے، اور عوام میں جب ایک مرتبہ سلطنت کی نسبت اپنے فرض کا احساس برانگیختہ ہوجاتا ہے تو اس سے ان کی طبیعتوں میں جوش اور خیالات میں رفعت پیدا ہوجاتی ہے۔

سلطنت و افراد کی بہبود ناقابل تفریق ہیں

جس طرح سلطنت اپنے اشخاص مشتملہ کے مجموعے سے کچھ زائد شئے ہے بعینہٖ اسی طرح قومی بہبود، انفرادی بہبود کے مجموعے سے کچھ زائد ہے یہ صحیح ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک گہرا تعلق ہے اور یہ کہ عام طور پر ان کا عروج و زوال ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ اگر سلطنت کے سواد اعظم

کی انفرادی بہبود کم ہو جاتی ہے تو اس سے بالعموم سلطنت کی بہبود میں بھی سخت خرابیاں لاحق ہو جاتی ہیں مگر دونوں کی سمتیں اور راہیں ہمیشہ متوازی نہیں ہوتیں بعض وقت وہ ایک دوسرے کی مخالف اور بعض وقت بالکل ہی ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً سلطنت خود اپنی بقا یا اپنی آیندہ نسلوں کے مفاد کے خیال سے مجبور ہوتی ہے کہ اپنے موجود الوقت اراکین سے سخت مطالبات کرے یا ان پر بہت بھاری بوجھ ڈال دے۔ کبھی یہ بھی صورت پیش آجاتی ہے کہ انفرادی بہبود سلطنت سے غیر معمولی امداد و تائید کی خواہاں ہوتی ہے اور اس سے سخت ذمہ داریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمیں زیادہ دقت نظر سے اس امر کو جانچنا چاہئے کہ کن حالات میں سلطنت، انفرادی اغراض کا وسیلہ ہے اور کن حالات اور کن حدود کے اندر سلطنت خود اپنی غایت المرام ہے اور اپنے ارکان کو فرداً فرداً اپنی ضرورت کے تابع کرنے کا حق رکھتی ہے۔

# دوسرا باب

## سلطنت کی غایت کے متعلق غلط خیالات

سلطنت کی غرض حکمراں قوت کا قائم رکھنا ہے

نظریات میں اور اس سے بھی زیادہ عملیات میں اکثر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ سلطنت کی غرض یہ ہے کہ اعلیٰ طاقت حکمرانی کرے خاص کر پادشاہ اپنی رعایا پر حکمراں رہیں۔

اگر سلطنت کی غایت اسی حکمرانی کا برقرار رکھنا ہے تو اس خیال کا منطقی نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ حکومت جس قدر بھی ممکن ہو مطلق العنان اور وسیع ہو یعنی سیاسی کوشش کا آخری نتیجہ یہ ہو کہ ایک عالمگیر مطلق العنان پادشاہی بلکہ ایک عالمگیر خودسر پادشاہی قائم ہوجائے لیکن یہ منصوبہ ہم کو سلطنت کے حقیقی منتہائے خیال تک نہ پہنچائے گا بلکہ اس کے ساتھ قومی آزادی اور انسانی قویٰ کی ترقی کا جمع ہونا ناممکن ہوجائے گا۔

اس تمام خیال کی بنا نہ تو انسانی فطرت میں پائی جاتی ہے، نہ ان معاشرتی تحریکات میں جو فطرت کی طرف سے انسان میں ودیعت کی گئی ہیں، بلکہ جو کچھ ہے وہ حکمرانوں کی خودپرستی اور اپنی عظمت کو بلند کرنے کی مغرورانہ خواہش ہے۔

ارسطو اپنے مشہور مقالے[1] میں مدتوں قبل اس رائے کو مسترد کرچکا ہے جس نظام

[1] یعنی "سیاسیات"

سلطنت سے محض حکمران کا نفع مقصود ہو وہ صحیح نظام سلطنت کی تحریف یا تخریب ہے۔ لوگ اسے بھلا دیتے ہیں کہ سلطنت کے اندر قوم بھی کوئی شئے ہے، یہ کہ رعایا بھی حکمرانوں ہی کی طرح کے انسان ہیں اور ان میں بھی وہی انسانی صفات، حسیات اور قویٰ موجود ہیں جو حکمرانوں میں ہیں اور اس لئے یہ امر اصول فطرت کے بالکل منافی ہے کہ ایک حصہ تو تمام سیاسی حقوق کا تنہا مالک سمجھا جائے اور دوسرے کی غرض محض یہ سمجھی جائے کہ اس پر حکومت کی جائے یعنی وہ شخص کے بجائے شئے قرار دے دیا جائے۔ وہ ساری دلیلیں جو غلامی کے خلاف پیش کی جاتی ہیں، اس مطلق العنانی کے خلاف بھی عائد ہوتی ہیں۔

اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ حکمراں طاقت، سلطنت کی ایک لازمی صفت ہے مگر وہ سلطنت کی غایت نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وہ غایت سلطنت کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ حکمرانوں کے حظِّ نفس کے لئے ایک حق ہونے کے بجائے حکمرانی ایک فرض ہے جو قوم کی جانب سے عائد کیا گیا ہے۔

اس لئے ضرورت ہے کہ نظامِ سلطنت کے ذریعے سے حکمرانی کی حد و تعریف معین کر دی جائے۔ سلطنت کا وہ تصور، جو امکانی حد کمال تک پہنچ سکتا ہے وہ مطلق العنان حکمرانی کا نہیں بلکہ آئینی حکمرانی کا تصور ہے یعنی آئینی حکمرانی باہمی حکمرانی کے مرادف ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک خاص قسم کی حکومت نیک نیتی سے قائم کی گئی مگر کچھ زمانہ گزرنے کے بعد وہ قوم کے تبدیل شدہ حالات کے موافق نہیں رہی۔ اس صورت میں صحیح حکمت عملی یہ نہیں ہو سکتی کہ سلف سے طریقِ حکمرانی جس طرح چلا آتا ہے اسی طرح بلا تغیر و تبدل برقرار رکھا جائے بلکہ ایسے وقت میں کوشش یہ ہونا چاہیے کہ اس از کار رفتہ طریق میں اصلاح کر کے اس میں اور قومی زندگی کے دوسرے حالات میں ہم آہنگی پیدا کر دی جائے۔

...لطنت کی غرض ...مرضی کو پورا ...ا ہے

مذہبی حکومت کے نظریے کے موافق سلطنت کی غایت یہ ہے کہ زمین پر خدا کی بادشاہی کا ظہور ہو جائے۔ انشٹال[۱] کہتا ہے کہ "سلطنت کا ادائے فرض خدا کی خدمت کی بجا آوری ہے۔ سلطنت پر لازم ہے کہ خدا کی حکومت قائم کرے اور عدل، انتظام اور اخلاق جو معاشرتی زندگی کے لئے خدا کے احکام ہیں انھیں برقرار رکھے"۔ ازمنۂ وسطیٰ

علہ "فلسفۂ قانون" (Rechtsphilosophie) ج ۲ ص ۲۔

میں عیسائی اور مسلمان دونوں علی العموم اسی خیال کے معتقد تھے۔ دنیائے جدید اگرچہ اس رائے کی مذہبی اہمیت سے انکار نہیں کرتی ہے اور اس امر کو پوری طرح سمجھتی ہے کہ کیونکر دنیا کے تمام کاروبار کے طریقے ربانی نظم و نسق کی روشنی میں برگزیدہ نفوس پر ظاہر ہوئے مگر جس طور پر حکومت ربانی معاملات کی رہبری کے لئے کام میں لائی جاتی تھی اسے وہ قطعاً لغو اور جہالت قرار دیتی ہے۔

جس تمثیل پر مذہبی حکومت کے خیال کا دار و مدار ہے، یعنی "بادشاہ ایک قوم پر اسی طرح حکومت کرتا ہے جس طرح خدا دنیا پر حکومت کرتا ہے" وہ خود علانیہ غلط ہے۔ اس لئے کہ دنیا پر خدا کی حکومت مقید ہستیوں پر ایک طاقت علی الاطلاق کی یا مخلوق پر خالق کی حکومت ہے۔ پس وہ ایک ایسی حکومت ہے کہ ہم نہ اس کی کنہ کا پتہ چلا سکتے ہیں، نہ اس کے ذرائع اور غایت کو معین کر سکتے ہیں۔ کسی قوم پر بادشاہ کی حکمرانی ایک انسان کی دوسرے انسانوں پر حکمرانی ہے جو اسی کے مثل ہیں اور جن کی زندگی کا منبع وہی ہے جو بادشاہ کی زندگی کا، جن کے صفات اسی طرح محدود ہیں جس طرح بادشاہ کے صفات۔ پس محکوموں میں بھی اس امر کی پوری قابلیت ہے کہ وہ انسانی نقطۂ نظر سے بادشاہ کی نسبت ایک رائے قائم کریں اس لئے بادشاہ کو خدا سے تشبیہہ دینا ہر اعتبار سے غلط ہے اور چونکہ اس سے غرور اور انتہائی خود پسندی پیدا ہو جاتی ہے اس لئے یہ مضر بھی ہے۔ سلطنت کا مقصد وہ ہونا چاہئے جسے انسان تسلیم کر سکے، انسانی فطرت کے مطابق اس کا تعین کیا جا سکے اور اگر بالکل نہیں تو جہاں تک ممکن ہو انسانی دسترس کے اندر ہو

یہ امر بالکل ہی مردود ہے کہ سلطنت کی غایت اس قوم اور اس ملک سے باہر قرار دیجائے جس پر سلطنت مشتمل ہے اور اس طرح وہ محض بیرونی اغراض کے حصول کا ایک وسیلہ بن جائے۔

سلطنت ک
غرض کسی بر
مقصد کا حا
کرنا ہے

پادریوں کی جماعت کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ کلیسا کی سلطنتوں کی ضرورت اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ رومن کیتھولک کلیسا کی آزادی و اقتدار کے لئے ایک پوپ کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے روما کا با اقتدار حکمران بھی ہونا چاہئے مگر وہ اس پر نظر نہیں کرتے کہ یہ استدلال خود ہی رومی مذہبی سلطنت کا واضح طور پر

بطلان کرتا ہے اس لئے کہ اس سے ان سلطنتوں کی آزادی کا انکار واجب ہو جاتا ہے جو پوپ کے تابع ہوں اور اس حالت میں ان کی حیثیت ہی سلطنت کی نہیں باقی رہتی کیونکہ کوئی سلطنت جو اپنی مرضی پر عامل نہ ہو سکے اور قانونی حقوق سے دست بردار ہو کر کسی بیرونی طاقت کی غلام بن جائے سلطنت کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی خواہ یہ بیرونی طاقت رومن کیتھولک کلیسا ہی کی کیوں نہ ہو۔ پادری صاحبان یہ فرض کر لیتے ہیں کہ رومی قوم نے جس پر یہ سلطنت مشتمل ہے ایک مذہبی اور غیر سیاسی جماعت کے مفاد کے خیال سے سیاسی زندگی کو ترک کر کے سیاسی غلامی اختیار کر لی ہے مگر یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو اس قوم کی طبیعت اور کلیسا کی مذہبی نوعیت دونوں سے یکساں طور پر مغائر ہے۔

تاریخ عالم نے اس صریح ضلالت کے خلاف اپنا فتویٰ صادر کر دیا ہے۔ روما اب کیتھولکی عیسویت کے تابع نہیں ہے جو خود ہی مختلف سلطنتوں میں منقسم ہے، روما کا تعلق اب رومی بلکہ ایتالوی قوم سے ہے اور اس ایتالوی قوم کے اجزا و عناصر رومی ہیں۔

لیکن حیرت یہ ہے کہ موجودہ زمانے تک میں اس غلطی کی متعدد مثالیں موجود ہیں لیشٹن اشٹائن کی امارت کا وجود بحالات ظاہر اس چھوٹے سے گاؤں اور اس کی مختصر سی آبادی کے لئے نہیں ہے، اس سے صرف ایک خارجی غرض پوری ہوتی ہے، وہ اسی امیر خاندان کی عزت و وقعت کا کام دیتی ہے جو ملک سے باہر آسٹریا کے شہنشاہی دربار میں رہتا ہے صاف ظاہر ہے کہ اس سلطنت کی غایت خود اس کے اندر نہیں ہے۔

# تیسرا باب

## سلطنت کے غایت المرام کی نسبت ناکمل یا مبالغہ آمیز خیالات

سلطنت کا مقـ
اشخاص و املاک
کے حقوق کا محـ
کرنا ہے ۔

کانٹ اور فشٹے کے زمانے سے ایک مدت تک جرمانیا میں یہ رائے قائم رہی کہ سلطنت کی اصلی غایت محض تحفظِ حقوق ہے خاصکر اشخاص و املاک کا تحفظ حقوق ۔

کانٹ نے (نظریۂ حقوق" (Rechtslehre) فقرہ ۴۷- ۴۹ میں) تاکید کے ساتھ یہ کہا ہے کہ "سلطنت کی سلامتی (یعنی اس کی غایت) باشندوں کی بہبود و خوشحالی میں نہیں بلکہ اس کے نظام سلطنت اور اصول قوانین کے تطابق میں مضمر ہے" فشٹے "حقوق طبعی" (Naturecht "تصانیف" ج ۳ ص ۱۵۲) میں کہتا ہے کہ "عامۂ خلائق کے حقوق کا تحفظ ہی عام مرضی (یعنی سلطنت کی مرضی) ہے۔ کانٹ کی اس رائے کو بنیاد قرار دے کر ولہلم فون ہمبولٹ "سلطنت کے میدانِ عمل" کے نہایت ہی تنگ حدود معین کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ "بیرونی دشمنوں اور اندرونی تنازعوں سے محفوظ رکھنا ہی" غایت سلطنت[الف] ہے۔ خود ہماری اس انیسویں صدی میں جبکہ قومیت کا خیال اس درجہ قوی ہو گیا ہے اے اوے ٹوئیس اپنی تصنیف "خیالات جدیدہ" Mdrne Ideen ج ۲ ص ۹۱ میں اسی

(الف) [مل نے اپنی کتاب "آزادی" کا طغرائے عنوان ہمبولٹ ہی کی تصنیف حدود فرائض حکومت

خیال پر قائم ہے کہ سلطنت کی غرض افراد کی حفاظت ہے۔

یہ رائے گزشتہ صدی کے نصف آخر کی ہے(ب)۔ اُن دنوں لوگوں کو ضرورت تھی کہ اس زمانے کی روشن خیال مطلق العنانی کے وفورِ حکمرانی کے لئے کوئی اصولی حد قائم کریں یہ وفور اگرچہ بہی خواہی پر مبنی تھا مگر لوگوں کے لئے ایک بارگراں اور شخصی آزادی کا تباہ کرنے والا اور بہبودِ عامہ کے عذر سے خاندانی زندگی اور آزادانہ ذرائع معاش اور ذاتی آمدنی کے انتظام میں دخل دینے کو حق بجانب سمجھنے لگا تھا۔ پس لوگوں نے یہ رائے قائم کی اس حد سے بڑھی ہوئی حکمرانی کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے کی بہترین تدبیر یہی ہے کہ تحفظ قانون کو سلطنت کی غایت قرار دیں۔ چنانچہ اس طرح کی محدود سلطنت کا نام "قانونی سلطنت" ( Rechtsstaat ) قرار پا گیا اور اس کے مقابلے میں دوسری صورت جس سے لوگ متنفر تھے "احتسابی سلطنت" ( Polizeistaat ) کہلائی۔ (ج)

غایت سلطنت کو اس طرح مقید کر دینے سے زندگی عامہ میں جو تنگی پیدا ہوئی

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ Spl ere and duties of Govt سے لیا ہے۔ ل کے خیالات کے لئے اس کی تصنیف "علم سیاست مدن" کی کتاب پنجم بھی دیکھنا چاہئے، لیکن ملّ ال سلطنت کے لئے بہت وسیع اختیارات جائز رکھتا ہے ہربرٹ اسپنسر کی رائے کے مطابق یہ حدود اور بھی زیادہ وسیع ہیں۔ دیکھو اس کی کتاب انسان اور سلطنت کا مقابلہ" ( The Man Vergus the State انگریزی مترجم]

(ب) [ اس خیال کا سلسلۂ قدامت یونان کے سوفسطائیوں تک پہنچتا ہے۔ ارسطو نے اپنی سیاسیات میں لیکافرن سوفسطائی کی زبان سے یہ ادا کیا ہے کہ قانون کا مقصد صرف حقوق باہمی کا تحفظ ہے وہ باشندوں کو اچھا یا بُرا نہیں بنا سکتا۔ لاک نے بھی اپنے رسائل حکومت Treatises as Government میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سیاسی اجتماع و حکومت کا مقصد یا خود اسی کے الفاظ میں یہ کہ انسان جس وجہ سے سوسائٹی میں داخل ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ اس طرح سے ہر شخص اپنی ذات اپنی آزادی اور اپنی ملک کو زیادہ محفوظ بنا لیتا ہے۔ انگریزی مترجم۔]

ج ( دیکھو اوپر پہلا مقالہ ساتواں باب، ص ۶۸ ) انگریزی مترجم۔]

وہ نہ موجودہ قوموں کے مذاق کے موافق ہوئی اور نہ انکے ضروریات کو پورا کر سکی۔ اس میں کسی کو شک نہیں تھا کہ حقوق کا تحفظ قانونی سلطنت کے فرائض میں داخل ہے مگر موجودہ زمانے کی کوئی قوم یا حکومت اپنے سیاسی میدان عمل کے لئے ایسی تنگ وسعت کو پسند نہیں کر سکتی اس رائے کے بڑے حامیوں کو بھی ذاتی تجربے نے مجبور کر دیا کہ ان حدود سے تجاوز کر کے عملاً اعلیٰ مقاصد کی طرف توجہ کریں۔ فشتے نے پہلے یہ دعویٰ کیا تھا کہ حفاظت ملک، سلطنت کی بڑی غایت ہے مگر نپولین کی ہمہ گیر مطلق العنانی کے مقابلے کے لئے وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا گو کہ نپولیونی مطلق العنانی ملک کی حفاظت کے لئے کافی طور پر آمادہ تھی۔ اس دوران میں فشتے کا خیال ایک ایسی قومی سلطنت کی طرف مائل ہوا جو قومی جذبات کی ترجمانی کا کام دے سکے۔ ول ہیلم فون ہم بولٹ جب پروشیا کا وزیر تھا تو اس نے سلطنت کے مدارس کے ذریعے سے اہل پروشیا کی ذہنی ترقی کی کوشش کی گو کہ اپنے نظریہ میں وہ اس کی تردید کر چکا تھا معہذا اس نے سلطنت پروشیا کی طاقت کو بھی وسعت دی حالانکہ قانون حقوق و جرائم کو نافذ کرنے کے لئے یہ طاقت پہلے ہی کافی تھی۔

اس خیال کے نقائص

فی الحقیقت تحفظ قانونی کا یہ اصول سلطنت کی غایت کو اور خاصکر موجودہ زمانے کی مہذب سلطنتوں کی غایت کو کلیتہً ختم نہیں کر دیتا ہے یہ اصول ازمنۂ وسطیٰ کے خیالات کے زیادہ مناسب ہے، جس میں خیالات شخصی قانون کے تصور سے زیادہ آگے نہیں بڑھے تھے۔

کسی قوم کی عملی قوت صرف پاس قانون ہی تک محدود نہیں ہے۔ سڑک نہر۔ ریل۔ ڈاکخانہ وغیرہ کی سی بہت سی اقتصادی ضرورتیں بھی ہوتی ہیں جنھیں تحفظ قانون سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ صرف سلطنت ہی ان ضروریات کو پورا کر سکتی ہے، لیکن اگر سلطنت کی غایت صرف تحفظ حقوق ہی ہے تو وہ ان کاموں کے کرنے کی جراءت نہیں کر سکتی۔ ان کے علاوہ قوم کے اہم ذہنی اغراض بھی ہیں مثلاً قومی مدارس۔ مدارس علوم و فنون، حرفتی و صنعتی مدارس۔ ان کے لئے سلطنت کو فکر کرنا لازمی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ چیزیں شخصی وہم و خیال اور کلیسا کے خود غرضانہ اقتدار کے بھروسے پر، جو ہمیشہ سلطنت کو زیر اثر لانے کی فکر میں رہتا ہے، چھوڑ دی جائیں۔ ازمنۂ وسطیٰ میں چونکہ سلطنت کی نسبت یہ تنگ خیالی شائع تھی کہ وہ قانونی حقوق کے تحفظ کی ایک تنظیم ہے

اس لئے اس زمانے میں ان اغراض سے بے پروائی برتی جاتی تھی۔
مزید براں قوم ایک سیاسی ہستی ہے، جس کا منصب صرف یہی نہیں ہے کہ شخصی حقوق کی حفاظت کے لئے قانون بنائے اور اس کو عمل میں لائے بلکہ سیاسی حکومت اور آزادی کی ترقی کا نہایت ہی اعلیٰ فرض بھی اس پر عائد ہوتا ہے۔

اس کے نتائج

سلطنت کی اس نامکمل تعریف کی جب حالات واقعی پر تطبیق کی جائے تو اس سے نتائج ذیل ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

(الف) اقتصادی اغراض سے بے پروائی۔
(ب) عام ذہنی اغراض سے بے پروائی۔
(ج) قوم کے جذبات عامہ کا مفلوج اور مردہ ہو جانا اور اس باعث سے سلطنت کا کمزور ہو جانا۔
(د) قانون کی خفیف اور رکیک کج بحثوں کا رواج، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں مقدمہ بازی کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور یہ سلطنت کے لئے مہلک ہے۔

۲۔ سلطنت کی غرض خوشحالی عام کا حاصل کرنا ہے۔

جس طرح خیال سابق، ضرورت سے زیادہ تنگ ہے اسی طرح دوسرا مروج خیال کہ "سلطنت کی صحیح غایت خوشحالی عامہ کا حصول ہے" ضرورت سے زیادہ وسیع ہے بیشتر انسان کی فراغ بالی کو سلطنت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بہت سے مادی اسباب بھی ہیں جن پر انسان کی خوشحالی کا انحصار ہے مثلاً مکان، غذا لباس اور آمدنی، یہ سب سلطنت کے ذریعے سے نہیں بلکہ افراد کی محنت اور جسز رسی سے حاصل ہوتے ہیں۔ روحانی امور کی بابت جن پر انسان کی دماغی دولت اور خوشحالی کا انحصار ہے یہ کلیہ اور بھی صادق آتا ہے۔ انسان کی ذہانت اور قابلیت، سلطنت نہیں عطا کرتی ہے۔ یہ فطرت کے عطئے ہیں اور وہ سب میں یکساں ہونے کے بجائے افراد کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ سلطنت کسی کو دوستی اور صحبت کی مسرتیں مطالعہ علمی شاعرانہ و مصورانہ تخلیق کا لطف، مذہبی اطمینان و تسلی یا خدا کے ساتھ روح کے تعلق کی پاکیزگی و لطافت نہیں عطا کر سکتی۔
انسان اپنی تمام زندگی و ہستی کے اعتبار سے محض سلطنت کا ایک جز نہیں ہے بلکہ مختلف افراد اپنی اپنی طبیعت کے مطابق ایک مخصوص قابلیت اور خاص خاص

فرائض زندگی رکھتے ہیں سلطنت کی بنا قوم کے اجتماعی خصائص پر ہے، نہ کہ افراد کے اخلاقی طبائع پر۔ اس لئے اس کی غایت شخصی زندگی کی عام غایات پر شامل نہیں ہوسکتی سابق الذکر غلطی کی طرح اس غلطی کو بھی جب واقعی حالات پر تطبیق دیجائے تو اس سے سخت مضر نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

اس خیال کے مضر نتائج

(الف) سلطنت زندگی کے ایسے شعبوں میں دخل دینے لگتی ہے، جو اس کی حکمرانی سے تعلق نہیں رکھتے اور جس حال میں کہ اسے خود کو شخصی آزادی کی حفاظت تک محدود رکھنا چاہیئے، وہ تعدی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔

(ب) چونکہ سلطنت میں شخصی زندگی کے اُن شعبوں کے انتظام کی فی الحقیقت قابلیت نہیں ہوتی اس لئے شخصی خوشحالی کے مجموعے کو بڑھا دینے کی خواہش کے باوجود سلطنت اپنی ناشستی کی وجہ سے شخصی زندگی کے لئے نقصان رساں ہوتی اور اس کی فطری ترقی میں خلل ڈال دیتی ہے۔

(ج) چونکہ اس طرح سلطنت ایسے مقاصد کے لئے سعی کرتی ہے جن کا حاصل کرنا اس کے لئے ممکن ہی نہیں اور اس غلط سمت میں کوشش کر کے وہ اپنی قوتوں کو ضائع کرتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے اصلی اغراض سے ہٹ جاتی اور پیش افتادہ فرائض کے پورا کرنے میں اپنی قوت کا ایک حصہ ضائع کر دیتی ہے۔

قدیم زمانے کی سیاسی زندگی میں یہ غلطی سخت نقصان کا باعث ہوئی مگر اٹھارویں صدی کی روشن خیال جماعت بھی اسی طرح سے بہک گئی موجودہ زمانے کے سیاسیات میں سلطنت کی غایت المرام کی زیادہ صحیح تعریف و تحدید ہونا چاہیئے۔

# چوتھا باب

## سلطنت کی صحیح غایت

سلطنت کی صرف ایک ہی عام غایت ہے

اگرچہ مختلف قوموں، ملکوں اور زمانوں میں مختلف طور پر عملدرآمد ہوا ہے مگر سلطنت کا تصوّر صرف ایک ہی ہے، اس لئے باوجود اس کے کہ تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف صاحب سلطنت قومیں مختلف اغراض کے درپے رہی ہیں پھر بھی غرض مشترک کا اتحاد ان تمام مخصوص اختلافات کو قبول کرلیتا ہے مگر وہ ان سب میں ربط اور یکرنگی بھی پیدا کردیتا ہے رابرٹ فون مول کا یہ دعویٰ صحیح تھا کہ ہر قوم کا فرض ہے کہ اپنی مخصوص نوعیت اور ضروریات کے اعتبار سے مختلف اغراض کے حصول کی فکر کرے (انسائکلوپیڈیا صفحہ ۳)، مگر اس کے نظریے میں تخیل کی اس یکرنگی کی کمی تھی جو غلط خیالی سے روکتی ہے اور گمراہی کا انسداد کرتی ہے۔ برخلاف اس کے فون ہولشین ڈورف جس نے اس موضوع پر خاص توجہ صرف کی ہے ہمارے اتحاد غایت سلطنت کو "اغراضِ سلطنت کی ہمنوائی" کا نام دیتا ہے

"عدل" بہت تنگ ہے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس واحد اعلیٰ غایت سلطنت کی تعریف کس طرح کی جائے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ "عدل" یعنی حصول مقصد قانون ہے۔ یہ تعریف ہمیں بہت ہی تنگ معلوم ہوتی ہے اور اگر قانون میں قانون عامہ اور قانونِ بین الاقوام دونوں شامل ہیں اور وہ افراد کے قانونی تحفظ تک محدود نہیں ہے تو یہ بجائے خود غلط ہے

ملاحظہ ہو باب سوم۔ قانون منجملہ شرائط سیاسیات کے ایک شرط ہے، اس کی غائت نہیں ہے
اقوام کی زندگی محض عدالتی زندگی نہیں ہے اقوام میں اقتصادی اور ذہنی زندگی بھی ہوتی
ہے اور اس کے سوا طاقت قومی کی بھی ایک زندگی ہوتی ہے رومی جو بالطبع قانون کی طرف
مائل تھے وہ بھی عدل کو سلطنت کی غایت اعلیٰ نہیں سمجھتے تھے۔

اخلاق زائد از ضرورت وسیع

ہیگل کا قول ہے کہ "اخلاق" اور قانون اخلاق کا عمل پیرا ہونا سلطنت کی غائت ہے
اور اس سے مدتوں قبل افلاطون کا بھی یہی قول تھا" مگر وہ دو طاقتیں جنسے اخلاقی زندگی
معین و مرتب ہوتی ہے یعنی خدا کی مرضی اور انسان کی روح انفرادی، یہ دونوں کی دونوں
انسانی قدرت سے باہر ہیں۔ اخلاق کے حدود سلطنت کے حدود سے بہت زیادہ
وسیع ہیں اور اگر سلطنت اخلاق کے نگران ہونے کی کوشش کرے تو وہ اپنے حدود
مناسب سے تجاوز کر جائے گی اور اخلاق پر مضر اثر ڈالے گی۔

۳ حصول بہبود عامہ

رومی سلطنت کا اصلی غرض بہبود عام کو سمجھتے تھے اُن کے دو فقرے: "شئے عامہ"
(Res publica) اور "عافیت عامہ" (Salus publica) زبان اور منطق
دونوں کے لحاظ سے آپس میں ربط رکھتے ہیں ان دونوں میں وہی واسطہ ہے جو جوہر اور
عرض میں یا قوت اور فعل میں ہے۔ غائیت سلطنت کے اس کلیے کا مفہوم اکثر غلط سمجھا
گیا ہے، خاصکر اس وجہ سے کہ افراد کی ہیئت اجتماعی پر نہیں بلکہ ان کے انبوہ پر یا حکمرانوں
کی بداحکامیوں پر زیادہ توجہ کی گئی ہے۔ بادشاہوں یا جماعتہائے غالب کی مطلق العنان
خود مختاری کے عذر کے لئے بہت کثرت سے اس کا استعمال ہوا ہے اور پیرس کی مجلس
تحفظ عامہ (۱۷۹۳ و ۱۷۹۵) کے ہولناک اعمال نے اسے بالکل ہی ساقط الاعتبار کر دیا ہے

غلط نہیں

لیکن اگر سلطنت کے حدود طبعی اور خاص کر اس کے عدالتی انتظام اور نظم و نسق
پر لحاظ کیا جائے اور اُن حدود سے خارج امور (جیسے افراد اور مذہبی جماعتوں کی آزادانہ
زندگی) میں دخل دینے سے پرہیز کیا جائے تو یہ فقرہ فی الحقیقت اعتراض سے پاک ہے
کبھی اور کہیں کوئی مدبر ایسا نہیں ہوا جس کی جد و جہد کا نصب العین اپنی قوم کی بہبودی
نہ ہو اور ملک کا ہر محب وطن باشندہ اپنے وطن کی سلامتی کا جوش رکھتا ہے۔ اس لئے
بہبود عامہ، حکمت عملی کی ایک لازمی غرض ہے اور اس کا ترقی دینا بے شک و شبہ
سلطنت کا خاص فرض ہے۔ غایت سلطنت کی اس تعریف میں قانون کا ارتقا و اکمال

اور زندگی کے عام تعلقات و حالات کی ترقی عمومی بھی شامل ہے، اس میں قانون کا عملدرآمد بھی داخل ہے جو باامن رفتار زندگی کے تحفظ کے لئے ضروری ہے اور جس سے جماعت کو نقصان پہونچانے والی زیادتیوں کی روک اور تادیب ہوتی ہے۔ رومیوں کے اس سیاسی اصول میں کہ "قوم کی سلامتی سب سے برتر قانون ہے" غلطی یہ نہیں ہے کہ وہ زائد از ضرورت تنگ ہے بلکہ اس کا سقم یہ ہے کہ وہ سلطنت کی طاقت کو بہت پھیلاتا ہے اور اسے غیر متعلق امور پر وسیع کرتا ہے۔

ہمگر مشکلات میں ناکافی ہے

تاہم ایک نظر سے یہ فقرہ ناکافی ہے۔ اگرچہ معمولی اوقات میں سلطنت کی حکمت عملی یہ ہوگی کہ قومی بہبود کے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے مگر قوموں کی زندگی میں ایسے بھی اوقات آتے ہیں جب انھیں غیر معمولی فرائض سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایسے حالات پیش آجاتے ہیں، جبکہ افراد کی طرح سلطنت کو بھی اپنی ہستی اور اس کے ساتھ قومی خوشحالی کو خطر میں ڈال دینا پڑتا ہے۔ ایسے وقت میں حب وطن کا اقتضا یہ ہوتا ہے کہ زندگی جب عزت کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی تو اس زندگی ہی کو خیرباد کہدینا چاہیے، فرض کیجئے کہ ایک نہایت ہی قوی دشمن کسی چھوٹی قوم کو بہت سے خارجی فوائد دیتا ہے مثلاً وہ محصولات کم کردیتا ہے، امن کا تحفظ کرتا ہے، ملک کے نظم و نسق کی حالت کو بہتر کردیتا ہے پس اگر محض بہبود عامہ پر خیال کیا جائے تو اس شرط کا قبول کرلینا ہی قطعاً مناسب معلوم ہوتا ہے اور اس کے رد کرنے میں سلطنت کے مشکلات میں پڑجانے بلکہ تباہ ہوجانے کا احتمال غالب ہوتا ہے مگر بااین ہمہ اس آڑے وقت کا فرض ہی ہوگا کہ برضائے خود غیر ملکی قوت کے مطیع ہوجانے پر جان جوکھوں اور عزت کی موت کو ترجیح دیجائے اور شائد یہی دلیرانہ اور جانبازانہ کوشش آگے چل کے سلطنت میں از سر نو زندگی پیدا کردینے کی ضامن ثابت ہو۔ تہیمس ٹوکلیس کے زمانے میں اہل ایتھنز نے اس کی ایک بہت ہی شاندار مثال پیش کی ہے۔ بسا اوقات جب ہستی کا قائم رکھنا ممکن نہیں ہوتا تو اس کا ختم کردینا ہی ہر طرح پر ضروری اور شایان شان ہوتا ہے۔ کارتھیج یا یروشلم کے عبرتناک خاتمے پر افسوس ہوتا ہے مگر جو کچھ ہوا اس سے کوئی مفر نہ تھا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ جب کسی سلطنت کے باشندوں میں یہ قابلیت باقی نہیں رہتی کہ وہ اپنی مستقل ہستی کو قائم رکھ سکیں اور وہ لوگ قوم کی اعلیٰ تر مجموعی زندگی میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو سلطنت کو فنا کردینا پڑتا ہے کوئی بے تعصب جرمانی یا اٹالوی

ان چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے تباہ ہو جانے پر افسوس نہیں کرے گا جو بیکار اور بیجان ہو گئی تھیں بلکہ وہ اس بات پر فخر کرے گا کہ ان سب سے ملکر ایک زیادہ وسیع اور زیادہ مقتدر سلطنت بن گئی۔ ایسی صورتوں میں ہمارا بہبود عامہ کا کلیہ ناکافی ثابت ہوتا ہے بجز اس کے کہ وہ نئی جماعت پر عائد کیا جائے۔

صحیح تعریف

لیکن اگر ہم سلطنت کا مختص و بلاواسطہ مقصد اس اصول پر قرار دیں کہ قوم کی قابلیتوں کا نشو و نما قومی زندگی کا کمال اور بالآخر اس کا انتظام سلطنت کا غایت المرام ہے تو یہ تمام اعتراضات رفع ہوئے جاتے ہیں مگر اس کی لازمی شرط یہ ہے کہ یہ اخلاقی سیاسی ارتقا اور نوع انسانی کے مقصد آخری کے خلاف نہو۔ اس کلیئے میں وہ تمام امور جمع ہو گئے ہیں جو سلطنت کے موزوں فرائض قرار دئے جا سکتے ہیں اور جو امور سلطنت کی حد سے باہر ہیں وہ سب خارج ہو گئے ہیں۔ اس میں مختلف اقوام کے مخصوص خیالات اور مختص ضروریات کا لحاظ کیا گیا ہے اور اس طرح جہاں وہ غایت سلطنت کے اتحاد کو مضبوطی سے قائم رکھتا ہے وہیں وہ اس کے مختلف طریق ارتقا کو بھی محفوظ کر دیتا ہے اور اس طرح سلطنت کو خود ایک شخص تسلیم کر کے قوم کی پوشیدہ طاقتوں کو ترقی دینا اور اس کی قابلیتوں کو ظاہر کرنا اس کا فرض قرار دیتا ہے۔ لہذا سلطنت کے دہرے فرائض قائم ہو جاتے ہیں اول قومی طاقتوں کا قائم رکھنا دوسرے ان کو کمال پر پہنچانا سلطنت پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ عہد ہائے گزشتہ کے فتوحات کو محفوظ رکھے اور مستقبل میں انھیں وسعت دے

۵۔ یہ عام تعریف ... خاص میلانات ... پر حاوی ہے

اس عام غایت کے اندر بعض خاص میلانات بھی داخل ہیں اکثر انھیں خاص میلانات کے مطابق عمل پیدا ہونے کی کوشش کی جاتی ہے اور کسی خاص قوم کے مخصوص حالات کی بنا پر ایسا طرز عمل جائز قرار دیا جاتا ہے مگر یہ طریقہ سلطنت کے لئے بہ حیثیت مجموعی خطرات سے خالی نہیں ہے اس کی کچھ مثالیں یہ ہیں:-

بیرونی طاقت ... ترقی دینا

(۱) سلطنت کی طاقت کا نشو و نما۔ سلطنت کو اپنی آزادی کے قائم رکھنے اور اپنے احکام کے نافذ کرنے کے لئے طاقت کی ضرورت ہے صرف طاقت ہی سے سلطنت کی ہستی اور زندگی باقی رہ سکتی ہے مگر اس طاقت کی نوعیت اور مدارج کے لحاظ سے سلطنتوں میں بڑا تفاوت ہے۔

(الف) عالمگیر طاقتیں (بادول) ہم ان سلطنتوں کو کہتے ہیں جن کی اہمیت اور

حدود عمل ان کی خاص مملکت سے بہت ہی دور دراز ممالک تک وسیع ہوں اور جو دنیا کے دو مختلف حصوں یا تمام عالم کی سیاسیات میں نمایاں حصہ رکھتی ہوں اور اس لئے ان کو ساری دنیا کے امن اور نظم و نسق کی فکر بھی ہو۔

(ب) بڑی طاقتیں (یا دولتیں)۔ ہر بڑی طاقت (یا طاقتِ عظمیٰ) کے لئے ایک عالمگیر طاقت ہونا ضروری نہیں۔ لیکن کوئی عالمگیر طاقت ایسی نہیں ہے جو طاقت عظمیٰ نہ ہو۔ عالمگیر طاقت کے لئے ضروری ہے کہ وہ بحری طاقت ہو کیونکہ سمندر کے تعلق کے بغیر وہ دنیا کے معاملات پر اپنا اثر نہیں ڈال سکتی مگر کسی طاقت عظمیٰ کے لئے یہ شرط ضروری نہیں ہے۔ ایک برّی طاقت بھی طاقت عظمیٰ ہو سکتی ہے جیسے جرمانی شہنشاہی کی تکمیل سے پہلے پروسیا کی سلطنت تھی اسی طرح آسٹریا ہنگری ایک عالمگیر طاقت ہونے کے بجائے زیادہ تر ایک طاقتِ عظمیٰ تھی اور اب بھی ہے ایک طاقت عظمیٰ بھی اپنے خاص حدود ملک سے بہت دور دراز تک اپنے وسیع اثر کو کام میں لاتی ہے اور جس براعظم میں وہ واقع ہے اس کی حالت میں اگر اہم تغیرات واقع ہوں تو یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ نظر انداز کر دی جائے یا اس کی آواز پر لحاظ نہ کیا جائے اگر کسی وقت میں ان دونوں قسم کی سلطنتوں میں سے کوئی سلطنت بھی اپنی قوت کے بیجا استعمال سے دوسری جائز سلطنتوں کو پریشان کرے تو دوسری طاقتوں کو اس کے روکنے کا حق حاصل ہے نپولین اول کی سی اعلیٰ قابلیت کا شخص بھی فرانسیسی قوم کی طاقت عظمیٰ کا غلبہ تمام یورپ پر قائم نہ کر سکا اور اسی کوشش کی ناکامی اس کے زوال کا باعث ہوئی اسی طرح روس کو اتنی قوت نہیں حاصل ہو سکی کہ وہ ٹرکی کو اپنا مطیع کر لیتا۔ آسٹریا، اپنا لیا پر اپنی حکومت نہیں قائم رکھ سکی۔ انگلستان باوجود اپنی بحری فوقیت کے دوسری قوموں کی ہمسری کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

(ج) متوسط اور صلح پسند طاقتوں (یعنی غیر جانبدار سلطنتوں) میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ ممالک غیر کے سیاسی معاملات میں زیادہ دخل دے سکیں وہ زیادہ تر اپنے اندرونی ہی معاملات میں مستغرق رہتی ہیں۔ ان سلطنتوں کی حکمت علی اگرچہ بہت ہی معتدل ہوتی ہے مگر یہ حکمت عملی صرف اپنے ہی باشندگان ملک کے لئے خاص اہمیت نہیں رکھتی بلکہ اس اعتبار سے بھی اہم ہوتی ہے کہ وہ ہمہ گیر سیاسیات کی رفتار

محدود اور معتدل کر دیتی ہے ۔
(۶) ہمارے زمانے میں جبکہ وسیع تر اور قوی تر سلطنتوں کے قیام کو ترجیح دی جاتی ہے صحیح معنوں میں چھوٹی سلطنتوں کا وجود بہت ہی مشکوک اور غیر محفوظ ہے۔ انکی بقا صرف اسی طرح ممکن ہے کہ وہ کسی بڑی سلطنت کو اپنا محافظ بنا لیں یا کسی قوی تر سلطنت سے ملجائیں مگر ازمنہ وسطیٰ کا میلان اس کے خلاف تھا اور یورپ کی قوموں خاصکر جرمانیوں اور اٹیالیوں کا رجحان اس طرف تھا کہ جہاں تک ممکن ہو چھوٹے سے چھوٹا سیاسی اتحاد اختیار کیا جائے ۔
کسی سلطنت کے لئے غیر سلطنتوں کے مقابلے میں اپنی طاقت کو بڑھانے کے دو ہی بڑے ذریعے ہیں ایک سیاسی فراست (ڈپلومیسی) دوسرے فوج بری اور بحری جو سلطنت اپنی فوجی قوت اپنے ارکان کی جنگی ہمت اور اپنے سلاح جنگ کے قائم رکھنے کو اپنا خاص فرض سمجھتی ہو وہ "جنگی سلطنت" کھلاتی ہے ۔ اس قسم کی سلطنتوں کی مثال یونانیوں میں اسپارٹا اور جرمانی شہنشاہی کے قیام کے پہلے سلطنت پروشیا تھی جب کسی سلطنت کو باہر سے خطرہ ہو اور وہ اپنے ضروری حدود تک پھیلنا چاہتی ہو تو اس کی جنگی قوتوں پر یہ غیر معمولی بار لابد ہو جاتا ہے مگر ایک اوسط درجے کی سلطنت جو اپنی پوری ترقی پر پہنچ گئی ہو اسے کبھی اس امر کو فراموش نکرنا چاہئے کہ فوجی قوت اس کے اجرائے کار کا صرف ذریعہ ہے، غائت نہیں ہے، اور اس قوت پر غیر ضروری بار ڈالنا سلطنت کے صحیح اغراض کے لئے مضرت رسان ہوگا

اغراض اقتصادی

(۷) بعض اوقات "اقتصادی اغراض" کو خاص طور پر نمایاں جگہ دیجاتی ہے چنانچہ جب باشندوں کا بڑا کام مویشیوں کی پرورش اور پرداخت ہو تو سلطنت کو "سلطنت راعیہ" (Pastoral) اور زراعت سب سے اہم مشغلہ ہو تو "سلطنت زرعیہ" اور صنعت و حرفت پر دار و مدار ہو تو "سلطنت صناعیہ" اور تجارت اصل چیز ہو تو "سلطنت تجاریہ" کہتے ہیں ۔
یہ صحیح ہے کہ یہ اغراض زیادہ تر خاص افراد کے ہوتے ہیں اور صرف جزدی طور پر تمام قوم کے اغراض میں شمار ہوتے ہیں، مگر خاص اسی وجہ سے کہ لوگ انھیں میں کلیتہ یا غیر ضروری طور پر منہمک ہو جاتے ہیں، سلطنت کے دوسرے فرائض کی طرف

سے غفلت پیدا ہو جاتی ہے اور تمام دیگر اغراض کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ علاوہ اس کے ایسی قوموں میں سیاسی جذبے کو کبھی پوری ترقی نہیں ہوتی بلکہ ذاتی اغراض کے محدود اور خود غرضانہ انہماک میں وہ خراب ہو جاتا ہے۔ ایک رائی سلطنت میں قوم غریب اور جاہل رہے گی۔ زرعی سلطنت میں لوگ اعلیٰ تعلیم و تربیت کو شک اور تنفر کی نظر سے دیکھینگے، کیونکہ ان کے کام کے لئے طبعاً سختی پسند عادات کی ضرورت ہے۔ صناعی سلطنت میں محنت مزدوری کرنے والوں کی بدامنیاں اور اشیائے بیرونی کے اخراج سے خاص خطرے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور علیٰ ہذا سلطنت تجاریہ محض دکانداری کو اپنا منتہائے خیال سمجھکر بے راہ روی میں پڑ سکتی ہے۔

یا اغراض ذہنی

(۳) یہ بھی ممکن ہے کہ کسی قوم کی زندگی خاص کر ذہنی و دماغی اغراض کی طرف مائل ہو اور اس سے ایسی سلطنت پیدا ہو جائے جسے ہم "ذہنی سلطنت" کہتے ہیں پیریکلیس کے زمانے میں اسپارٹا کی فوجی سلطنت کی مدمقابل ایتھنز کی ذہنی سلطنت تھی ایتھنز کی ذہنی سلطنت اپنے شغف علمی اور اپنے باشندوں کے حصول علم کی قابلیت کا غیر فانی ثبوت اپنے بعد کی نسلوں کے لئے چھوڑ گئی ہے۔ فلورنس و وینس اور اینٹورپ میں ایسے دور گزرے ہیں جب ذہنی اغراض تمام دوسرے اغراض پر غالب آگئے تھے۔ اس زمانے کی چینی سلطنت بھی اس کی ایک مثال ہے مگر اس کی ذہنی قابلیت ترقی کن نہیں رہی ہے بلکہ ساکت ہو گئی ہے اسی طرح زیورچ اور جنیوا دونوں کو اس امر پر فخر ہے کہ وہ اپنے مدارس عامہ پر خاص توجہ کرتے ہیں۔ ان اغراض کے اعلیٰ و افضل ہونے میں کوئی شک نہیں مگر قوم کی دوسری طاقتوں کو نقصان پہنچا کر انھیں غیر معمولی ترقی دینا ایک مضر طرز عمل کی علامت ہے۔

آزادی کی قانونی ضمانتیں

(۴) بعض سلطنتوں میں خاص کام یہ سمجھا جاتا ہے کہ قومی اور انفرادی آزادی کی قانونی ضمانتوں کو ترقی دیجائے اور اس طرح آزاد و قانونی سلطنتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کی نمایاں مثالیں سوئٹزرلینڈ کے شمالی صوبجات اور شمالی امریکہ کی ریاستیں ہیں۔ جن کلیات کا اوپر ذکر ہو چکا ہے ان سب سے زیادہ یہی کلیہ غایت سلطنت کی عام خیال کی تہ میں موجود ہے۔

اتحاد قومی

ایک صورت یہ بھی ہے کہ جب قومیت کا احساس زیادہ قوی جوش کے ساتھ

سیاسی زندگی کو متاثر کر دیتا ہے اور جبکہ قومی اتحاد کا اظہار ہی سلطنت کی خاص غایت سمجھا جانے لگتا ہے تو اس سے "قومی سلطنتیں" پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگلے زمانے میں فرانس کا یہی حال تھا اور ہمارے زمانے میں سلطنت اٹالیا اور جرمانی شہنشاہی پر یہی اثر غالب ہے۔

سلطنت کے بالواسطہ فرا[ئض]

سلطنت کی اس لازمی اور بلا واسطہ غایت کے علاوہ جس کا تعلق خود قوم سے ہے سلطنت کے ان تمام بالواسطہ فرائض پر بھی لحاظ کرنا چاہیئے جن کا تعلق محض شخصی زندگی سے ہے۔ اس موقع پر بالتخصیص ضروری ہے کہ سلطنت کے حدود عمل کے لیئے کوئی تعین قائم کیا جائے۔ سلطنت کے فرائض کی طرح افراد کے فرائض کا بھی یہ کلیہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ انفرادی خصوصیت و قابلیت کا ارتقا و اظہار ان کا کام ہے مگر اس کے ساتھ ہی خاندان قوم اور نوع انسان کے اغراض سے اس کا ہم آہنگ ہونا بھی ضروری ہے۔ ان فرائض کی انجام دہی کے لیئے شخصی آزادی لازمی ہے۔ سلطنت کا پہلا فرض یہ ہے کہ شخصی آزادی کو ناواجب دست اندازی سے محفوظ رکھے اور خاص کر خود اپنی طرف سے اس شخصی آزادی کو محدود کرنے اور اسے مضطر و پریشان کرنے سے بچتی رہے۔

عمل سلطن[ت] کی حد بند[ی]

ایک مقدم ضرورت یہ ہے کہ سلطنت خود اپنی نوعیت کے لحاظ سے جس طرح محدود ہے اس کا ایک صاف تصور قائم کر لیا جائے۔

(۱) سلطنت حیات عامہ کی ایک خارجی تنظیم ہے اس لیئے اس کے قوائے عمل صرف انھیں اشیاء کے لیئے ہیں جو خارجاً محسوس ہوتی ہیں واضح اس باطنی روحانی زندگی کے لیئے نہیں ہیں جس کا اظہار کبھی الفاظ و اعمال سے نہیں ہو سکتا ہے اس لیئے سلطنت کے لیئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ حیات انفرادی کے تمام اغراض پر محتوی ہو جائے کیونکہ اس زندگی کے بہت سے پہلو اور ایسے پہلو جو سب سے زیادہ اہم ہیں اس کی نظر سے مخفی ہیں اور وہاں تک اس کی طاقت کی رسائی نہیں ہے۔ افراد کے فطری عطیات سلطنت سے بالکل آزاد ہیں۔ سلطنت بیوقوف کو باعقل بزدل کو باہمت اور نابینا کو بینا نہیں بنا سکتی۔ دلوں میں محبت کے شعلہ زن ہونے میں سلطنت کا کوئی دخل نہیں ہے وہ کسی پڑھنے والے کے خیال کا ساتھ نہیں دے سکتی، نہ روایات کی غلطیوں کی اصلاح کر سکتی ہے جس وقت افراد کی زندگی اور خاص کر روحانی زندگی کا سوال پیش آجاتا ہے سلطنت کو فوراً یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کی دوربینی اور طاقت ایسے حدود کے اندر بند ہیں جن سے وہ کسی

طرح گز نہیں سکتی۔

(۲) سلطنت کی بنا تمام تر انسان کی عام فطرت اور خاص کر اپنی ہی قوم کی عام فطرت پر قائم ہے اس لئے شخصی زندگی کی خالص انفرادی کیفیت پر اسے قابو نہیں مل سکتا بلکہ اسکا قابو صرف وہیں تک ہے جہانتک کہ یہ زندگی انسان کی عام فطرت اور مشترک ضروریات کے تابع ہے۔ مثلاً سلطنت یہ کر سکتی ہے کہ تمام لوگوں کے لئے کسی مادی شئے یعنی ملک کا قبضہ مساویانہ طور پر محفوظ کر دے مگر اس ملک کا مصرف و انتظام اسے افراد ہی پر چھوڑنا پڑیگا پینینی کے پاس بیلا (وائیولن) اور لسٹ کے پاس پیانو اور کاول باخ کے پاس گھریا کی رنگین پنسلوں کا ہونا بالکل اس سے مختلف حیثیت رکھتا ہے کہ یہی آلات کسی ناواقف شخص کے پاس ہوں۔ ملک کی اس مزید کار آمد صورت سے سلطنت کو کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ یہ مشترک حیثیت نہیں بلکہ انفرادی حیثیت ہے، علی ہذا سلطنت سرسری اور عمومی طور پر مناکحت کے شرائط اور زوجین کے حقوق معین کر سکتی ہے بلکہ حقیقتاً یہ اس کا فرض ہے کیونکہ اس پر خاندان کی حفاظت اور قوم کی صحت اخلاقی کا دار و مدار ہے مگر یہ کہ کوئی خاص عقد کس طرح تکمیل کو پہنچا اور خاندانی زندگی کی جزوی صورتیں کیا ہیں یہ امور سلطنت کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہیں۔ ولہلم فون ہمبولٹ نے اسے محسوس کیا اور وہ اسی خیال میں بہک گیا کہ معاملات مناکحت کو قانونی اثر سے نکال لے اور اسے بالکل ہی افراد کی مرضی پر چھوڑ دے۔ مذہبی قانون اس کے برعکس غلطی میں مبتلا ہو گیا اور اس نے ان معاملات پر ایسے قانونی ضوابط عائد کرنا چاہے جن کا تعلق ذاتی آزادی سے تھا۔ سلطنت نے جب ارتداد کو جرم قرار دے کر اس کے لئے سزا دی تو وہ اپنے فطرتی حدود سے متجاوز ہو گئی اور شخصی آزادی میں اس نے غیر ضروری مداخلت کی۔

(۳) سلطنت کی حکمرانی حد قانون سے زائد وسیع نہیں ہے کیونکہ ہر ایسی حکمرانی جسے جبر کی طاقت حاصل ہو قانون ہی کی بنیاد پر قائم ہو سکتی ہے، مگر قانون خود اپنی جگہ پر اسباب ذیل سے محدود ہے۔

(**الف**) افراد کے باہم امن و آشتی کے ساتھ رہنے کی ضرورت یعنی حیات عامہ کے ضروری شرائط کا تسلیم کرنا (اس ضمن میں قانون شخصی اور قانون قصاصی وغیرہ داخل ہیں) اور

(**ب**) قوم کی ہستی اور ارتقار اور جہاں تک تحفظ و بہبود کی حاجت ہے۔ افراد

کی شخصی زندگی کا اس کے تابع ہونا (اس ضمن میں محصول، فوجی خدمات، آئینی اور انتظامی قوانین شامل ہیں) ۔

جہاں تک قانون کی بحث ہے، سلطنت کو اعلیٰ اختیار حاصل ہے کیونکہ قانون کی توضیع اور اس کا عملدرآمد فی نفسہ وہ چیزیں ہیں جن کا تعلق سلطنت سے ہے ۔

(۴) سلطنت اپنی انتظامی خبرگیری اور نتیجتہً اپنے اثر کو تنظیمات قانونی کے حدود سے آگے بڑھا سکتی ہے مگر اس صورت میں اسے جبر کا اختیار باقی نہیں رہتا اور اس کے فرائض صرف اس حد تک رہتے ہیں کہ جن اہم معاشری امور میں سلطنت کی امداد کی ضرورت ہو وہ ان کی تائید و ہمت افزائی کرے اس کی مثال سلطنت کی اقتصادی اور تعلیمی کارروائیاں وغیرہ ہیں ۔ اس موقع پر سلطنت کی خبرگیری، قومی بہبود سے تجاوز کرکے معاشری بہبود پر وسیع کی گئی ہے مگر صرف اس وجہ سے کہ آخر الذکر کو اس کی مدد کی ضرورت ہے ۔

تعلیق ۔ مل اور اسپنسر کے اُن تصانیف کے علاوہ جن کا ذکر تیسرے باب کی تعلیق (الف) میں ہو چکا ہے افعال سلطنت کے تحدیدات کے متعلق انگریزی کی کتب ذیل میں بھی مختلف نقطۂ نظر سے بحثیں کی گئی ہیں ۔

برگس علم السیاست (Political science) حصہ اول کتاب دوم باب چہارم ۔ کننگہم سیاسیات و اقتصادیات (Politics and Economics) ڈانستھراپ "انفرادیت" (Individualism) گرین "خطبات دربارہ ذمہ داری سیاسیہ" (در تصانیف جلد دوم) اور خطبہ دربارۂ آزادانہ وضع قانون و آزادی معاہدہ (در تصانیف جلد سوم) گوشن خطبہ عدم مداخلت و دست اندازی حکومت (اڈمبرا فلاسفیکل انسٹیوٹ) فیرر "سلطنت بہ تعلق تجارت" جیونز "سلطنت بہ تعلق مزدوری" (یہ دونوں انگلش سنٹرن سیریز میں ہیں) میکے (مدیر) عذر حریت (A plea for Liberty) (مع تمہید از اسپنسر) مانٹیگو ۔ تحدیدات آزادی افراد (Limits of Individual Liberiy) "حچی اصول مداخلت سلطنت" (Principles of State Interference) لوک "علم الاقتصاد" (Political Science) کتاب سوم ۔ مبادی سیاسیات حصہ اول جے ۔ ایف اسٹفن حریت مساوات و قوت (Liberty, Equality. Faternity) وولزی "علم السیاست" حصہ دوم باب پنجم ۔ انگریزی مترجم ۔

# چھٹا مقالہ

## سلطنت کی شکلیں

# پہلا باب

## ارسطو کی تقسیم

ارسطو کی تقسیم

دو ہزار برس سے زیادہ ہوگئے کہ ارسطو نے اشکال سلطنت کی تقسیم کی تھی جو آج بھی عموماً مسلم مانی جاتی ہے۔ اس تقسیم کے قائم کرنے میں اُس نے فرمانروائی بلکہ حکومتی اقتدار کے تصور سے ابتدا کی۔ اُس نے یہ قرار دیا تھا کہ ہر سلطنت میں ایک سب سے بڑا کارکن ایسا ہوتا ہے جو طاقت کا مرکز ہو، اور تمام دوسرے کارکن اس کے تابع ہوں۔ اس اعلےٰ کارکن کی ہیئت، سلطنت پر اپنا خاص نقش قائم کردیتی ہے بس یہ قرین فطرت اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہی سلطنتوں کی تقسیم کی بنیاد قرار دیا جائے۔

جائز سلطنتیں

ارسطو سلطنت کی جائز شکلوں میں اُن سب کو شمار کرتا ہے جنکا مقصد جماعت (یا ملت) کی بہبودی ہے۔ بہ خلاف اسکے جو سلطنتیں صرف حکمرانوں کے مطلب پر نظر رکھتی ہیں انھیں وہ "فاسد" قرار دیتا ہے۔

اس خیال کی بنا پر اسے سلطنت کی صحیح بنیادی شکلیں صرف تین ملتی ہیں اور اُن میں ہر ایک کے ساتھ ایک فاسد شکل بھی لگی ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اعلیٰ طاقت یا تو کسی ایک فرد واحد میں مرکوز ہوگی یا چند افراد (قلت) یا متعدد افراد (کثرت) کے ہاتھ میں ہوگی۔ اس سے حسب ذیل صحیح قسمیں پیدا ہوتی ہیں:۔

۱۔ بادشاہی یعنی فرد واحد کی حکومت جسے ارسطو "بادشاہی" کہتا ہے آج کل کے محاورے میں اُسے شاہی حکومت (Monarchy) کہتے ہیں۔

۲۔ اعیانی حکومت یعنی چند (قلیل التعداد) ممتاز ترین افراد ملک کی حکومت۔

۳۔ کثرت یا عوام کی حکومت کو ارسطو نے حکومت عامہ (پالٹی Polity) کہا ہے اسکے زمانے میں یونانی شہروں اور خاصکر ایتھنز کی عمومی حکومت ذلیل ہو گئی تھی اس لئے وہ کثرت کی اس حکومت کے لئے جو اغراض عامہ کو مد نظر رکھے "حکومت عمومی" کا لفظ استعمال کرنے سے بچنا چاہتا ہے اور اس لفظ کو اس حکومت کی فاسد صورت کے لئے مقرر کرتا ہے مگر بعد کو اس تیسرے طریقہ حکومت کیلئے حکومت عمومی کا لفظ پھر عام طور پر استعمال ہونے لگا، اور ہم اسی مفہوم میں اسکا استعمال کریں گے۔

فاسد صورتیں

تین فاسد صورتوں کو ارسطو نے حسب ذیل بیان کیا ہے۔

۱۔ حکومت خود سری، یعنی ایک فرد واحد کی حکومت جسکی مقدم غرض خود اپنے ذاتی اغراض ہوں۔

۲۔ عدیدیت، اہل ثروت کی حکومت خاص اپنے فائدہ کے لئے۔

۳۔ ازدحامیت، یعنی غریب (اور غیر تعلیم یافتہ) عوام الناس کی بے قید حکومت اسکو ارسطو "عمومیہ" (Democracy) کا نام دیتا ہے۔

کمیت کے بہ نسبت کیفیت زیادہ اہم ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس تقسیم میں ارسطو نے صاحبان اقتدار کی تعداد پر خاص زور دیا ہے مگر یہ امر خود اسی کے اس بنیادی اصول کے خلاف پڑتا ہے کہ سلطنت کی شکل حکمرانوں کی کیفیت سے متعین ہونا چاہیئے نہ کہ کمیت سے۔ ارسطو نے خود اس لغزش کو محسوس کر لیا تھا[۱] اور اس لئے اس نے یہ جتا دیا تھا کہ تعداد کا فرق بالطبع حکمران طاقت کے خصائص سے تعلق رکھتا ہے اور اس آخر الذکر صفت کو آخری منبع قرار دینا چاہیئے، تاہم اصول کیفیت کی قطعیت کو اُس نے کافی طور پر ظاہر نہیں کیا ہے۔

[۱] ارسطو، سیاسیات اس مسئلے کے متعدد جدید بیانات سے غلطی میں پڑ کر سب پہلے اسے نظر انداز کر گیا تھا اور اسلئے اس سیاسی فلسفی اعظم پر بیجا اعتراض کیا تھا۔ اسپارٹا میں اگرچہ دو بادشاہ ایک ساتھ حکومت کرتے تھے مگر وہ حکومت شاہی تھی دگر ارسطو کی رائے کے موافق ایسا نہیں تھا کیونکہ وہ اسے "اعیانیت" اس پست تر مفہوم میں کہتا ہے جس مفہوم میں یہ لفظ مرکب سلطنت کی شکل پر عاید ہوتا ہے۔ اسپارٹا کی بادشاہیت کو وہ صرف "موروثی حین حیات سپہ سالاری" خیال کرتا ہے اور یہ ایک عہدہ تھا جو حکومت کی ہر شکل سے مطابقت پیدا کر سکتا تھا) وینس میں اعیانیت تھی، گوکہ سلطنت کا سرگروہ "ڈوج" ہوا کرتا تھا۔

ارسطو کی تقسیم نامکمل ہے

ایک اور اعتبار سے بھی ارسطو کی تقسیم میں اصلاح کی ضرورت ہے یہ تقسیم نامکمل ہے کیونکہ تاریخ میں بہت سی ایسی سلطنتوں کے حالات ملتے ہیں جو اسکی ان تینوں جائز اشکال میں سے کسی شکل کی تحت میں نہیں آسکتیں۔ ان تینوں شکلوں میں اعلیٰ طاقت کا تعلق انسان سے ہے، خواہ وہ ایک شخص سے ہو یا چند افراد سے یا تمام قوم سے مگر ایسی سلطنتیں بھی ہوگزری ہیں جن میں کسی قسم کا انسانی اقتدار نہیں تسلیم کیا گیا ہے بلکہ اعلیٰ طاقت خدا، یا کسی دیوتا، یا کسی دوسرے فوق الانسان ہستی یا کسی تخیل کے تابع سمجھی گئی ہے۔ حکمرانی کرنیوالوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ خود اپنے اختیار سے حکومت نہیں کرتے بلکہ وہ کسی غیر مرئی حکمران کے خادم یا نائب ہیں جو انسان کی فطری کمزوریوں سے مبرا ہے۔

سلطنت کی یہ چوتھی شکل جب رعایا کے بہبود کی جانب مائل ہو تو اصطلاح میں حکومت مذہبی ہوسکتی ہے اور اسکی فاسد صورت "حکومت ادہامیہ" ہوگی۔

تعلیق۔ اشلائیر ماخر نے یہ دعوی کیا ہے کہ سلطنت کی یہ تین قدیم قسمیں یعنی حکومتہائے شاہی و اعیانی و عمومی، سب کی سب ہمیشہ ایک دوسرے میں ملی رہتی ہیں۔ مثلاً حکومت عمومی میں سربرآوردہ اشخاص کو اعیان حکومت سے تشبیہہ دیجاسکتی ہے اور بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ پریکلیس کی طرح ایک شخص بادشاہ کا انداز اختیار کرلیتا ہے۔ حکومت شاہی پر بھی یہی امر صادق آتا ہے اور مرابو کا یہ کہنا بجا تھا کہ "ایک اعتبار سے جمہوریت شاہی ہے اور ایک اعتبار سے شاہی جمہوریت ہے" تاہم یہ قدیم تقسیم بے معنی نہیں ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ اعلیٰ طاقت کی ہیئت ظاہری کا قطعی اثر تمام نظام سلطنت پر پڑتا ہے اور نہایت ہی اہم سیاسی اصول کا اس سے قریب ترین واسطہ ہوتا ہے۔

---

# دوسرا باب

## نام نہاد ممزوج سلطنت

جمہوریہ روما

قدیم زمانے میں بھی یہ کوشش کیگئی تھی کہ ارسطو کی تقسیم میں ایک چوتھی شکل ممزوج سلطنت کی بڑھا دیجائے۔[الف] سسرو کا یہ خیال تھا کہ روما کی سلطنت ایک ایسی سلطنت ہے جو اس چوتھی شکل کا نمونہ ہے، یعنی وہ بادشاہی، اعیانی اور جمہوری، سب شکلوں کا ایک مجموعہ مرکب ہے اور سسرو کا یہ دعوے ہے کہ چاروں میں یہی شکل سب سے بہتر ہے۔

سلطنت ممزوج سے کیا مقصد ہے

سلطنت ممزوج کا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ اس میں بادشاہی، اعیانی اور عمومی اشکال حکومت معتدل کردئے گئے ہیں یا دوسرے سیاسی عناصر نے اُن کی وسعت کو محدود کردیا ہے، مثلاً اعیانی سینات (یعنی ایوان اعلیٰ) یا نیابتی مجلس عوام کے قیام سے حکومت شاہی کے اختیارات محدود کردئے جائیں۔ اس صورت میں یہ صحیح ہے کہ اس قسم کا تقسیم شدہ نظام سلطنت اُس سے بہتر ہے کہ ایک شخص واحد، یا چند افراد یا فریق غالب بلا روک ٹوک مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرے، مگر اس قسم کے امتزاج سے سلطنت کی کوئی نئی شکل نہیں پیدا ہوتی۔ کیونکہ حکمرانی کی اعلیٰ طاقت بہر نوع بادشاہ، اعیان مملکت یا عوام کے ہاتھ میں مرکوز ہوتی ہے۔

برخلاف اسکے، اگر اس سے یہ سمجھا جائے کہ اعلیٰ حکمران طاقت بنفسہٖ بادشاہ، اعیان مملکت اور عوام میں تقسیم کردی گئی ہے اور اس طرح دو اعلیٰ اجزا کو تین پہلو بہ پہلو قائم ہوگئی ہیں اور اُن میں سے ہر ایک دوسرے سے آزاد ہے تو اس صورت میں ٹاسی ٹس کا یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ اس قسم کی مرکب سلطنت کا خیال ہی ترک کردینا چاہئے اُسکا دعوے ہے اور صحیح دعوے ہے کہ اول تو اس قسم کی سلطنت کا وجود میں آنا ہی ناممکن ہے اور اگر ایک وقت کیلئے وجود میں آ بھی جائے تو اسکا برقرار رہنا کسی صورت سے نہیں ہوسکتا۔

---

(الف) ارسطو نے خود بھی ممزوج نظامہائے سلطنت کو تسلیم کیا ہے۔ انگریزی مترجم)

زمانہ مابعد کے لوگوں نے انگلستان کو اسی قسم کی ایک ممزوج سلطنت خیال کر لیا ہے جہاں حکمرانی بادشاہ، امرا، اور عوام کی تین اعلیٰ طاقتوں میں منقسم ہے اور ان لوگوں نے یہ دعوے کیا ہے کہ انگریزی نظام سلطنت ہر طرح پر مکمل ہے محض اسوجہ سے کہ اس ممزوج شکل کی عملی صورت کی یہ انتہائی حد ہے مگر یہ خیال کرنا غلطی ہے کہ انگریزی نظام سلطنت، اعلیٰ طاقت حکمرانی کی تقسیم سے پیدا ہوا ہے[ب] قدیم زمانہ میں یہاں کی سلطنت کی مخصوص شکل بادشاہی کی تھی اور یہی بادشاہی اولاً امرا کے ذریعے سے اور بعد ازاں عوام کے شمول سے بتدریج محدود کر دی گئی ہے سلطنت کی خارجی شکل ہمیشہ شاہی رہی ہے اور نہ صرف اعلیٰ طاقت حکمرانی (یعنی عاملانہ طاقت) بلکہ جماعات قانون سازی (یعنی پارلیمنٹ) میں بھی بلند ترین منصب بادشاہ ہی کی جانب منسوب رہا ہے۔

خیال کرنیکی شے حکومت ہے نہ کہ مجلس وضع قوانین

علاوہ اسکے بالعموم اسکا خیال نہیں رکھا جاتا کہ ارسطو کا اصول تقسیم تشریعی اختیار کی نوعیت وترکیب پر مبنی نہیں ہے، کیونکہ ہر ایک ترقی یافتہ سلطنت میں قانون سازی میں بالعموم تمام قوم کے خاص عناصر کی نمائندگی ہوا کرتی ہے، اسکے بجائے اس اصول کا انحصار حاکم ومحکوم کے تخالف باہمی اور اس امر کے تصفیے پر ہے کہ اعلےٰ انتظامی قوت کس کے اختیار میں ہے۔ یہ انتظامی طاقت تقسیم نہیں ہو سکتی حتیٰ کہ ایک بادشاہ اور اسکے وزرا کے درمیان بھی اسے منقسم نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے دوعملی یا سہ عملی پیدا ہو جائیگی اور یہ امر بجائے خود سلطنت کی خصوصیت حقیقی کے خلاف ہوگا اس لئے کہ ایک زندہ جسم کے مانند سلطنت کو اتحاد کی ضرورت ہے تمام ذی حیات موجودات میں مختلف قویٰ اور مختلف اعضائے عمل ہوتے ہیں مگر اس تعدد کے باوجود سب کے سب

(ب) (کسی حکومت کا ممزوج ہونا اور کسی حکومت کا اجزائے مرکبہ سے پیدا ہونا ایک ہی بات نہیں ہے۔ ایتھنز میں سولن کے ترتیب دادہ نظام حکومت کے متعلق ارسطو نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں انھیں دیکھنا چاہیئے۔ انگریزی مترجم)

(ج) (اس تمام کتاب میں بنجلی نے انگریزی نظام حکومت میں بادشاہ کی طاقت کو جس مبالغے سے بیان کیا ہے اُس میں اُسے مغالطہ ہوا ہے۔ اسکے بارے میں زیادہ صحیح خیال معلوم کرنے کے لئے بجہٹ کی کتاب "نظام سلطنت انگلشیہ" دیکھنا چاہیئے۔ انگریزی مترجم)

متحد ہوتے ہیں، بعض اعصاب عملیہ اعلیٰ (رئیس) ہوتے ہیں اور بعض ادنیٰ (خادم)
مگر ہمیشہ ایک اعلیٰ عضو ہوتا ہے اور وہی کار فرمائی کی تمام قوت کا مرکز ہوتا ہے سر اور جسم
زندگی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے علیحدہ اور آزاد نہیں ہیں مگر وہ دونوں ہم مرتبہ
بھی نہیں ہیں اسی طرح سلطنت میں بھی ایک اعلیٰ کارفرما کا ہونا اسکی ہستی کے لئے لازمی
شرط ہے اور اگر اتحاد سلطنت کا قائم رکھنا مقصود ہو تو اعلےٰ قوت کو مختلف اجزاء میں
منتشر نہیں کر سکتے۔

پس سلطنت کی کوئی ایسی چوتھی شکل نہیں ہے جسے سلطنت ممزوج کا نام دیا جاتا ہے اور
امتزاج جہاں تک ممکن ہے اُس پر انھیں تین مذکورۂ بالا مجرد سلطنتوں کے بیان میں
بحث کیجا چکی ہے۔

تعلیق۔ ہمارے اس زمانے میں "جمہوریت نما شاہی" کا بہت چرچا ہو رہا ہے
اور اس قسم کی سلطنتوں کا قائم کرنا اس زمانے کا مابہ الامتیاز کام سمجھا گیا ہے، اگر اس
فقرے کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ نوں شاہی کی بنیاد پسندیدگی جمہور پر قائم ہونا چاہئے اور
شاہی کو جمہور سے قریبی تعلق ہونا چاہئے تو یہ خیال صحیح ہے مگر اس قسم کی سلطنت خالص
شاہی حکومت ہوگی۔ کسی اعتبار سے وہ ممزوج سلطنت نہیں ہوگی۔ اگر اسکا مفہوم
یہ ہے کہ شاہی جمہوری تنظیمات سے محدود ہو۔ جیسے فرانس میں ۱۸۳۰ء میں جولائی والی
بادشاہی تھی جو "جمہوری تنظیمات سے گھری ہوئی تھی" تو اسکا بھی ایک مطلب ہے
مگر تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس صورت میں یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ دونوں طریقوں
کے اصول ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے اور ترقی کن عمومیت جمہوریت شاہی کو
الٹ دیگی، لیکن اگر اس قسم کی سلطنت کا مفہوم یہ ہو کہ اعلیٰ اختیار عاملانہ اس طرح پر
مخلوط یا منقسم ہے کہ نصف شاہی اور نصف عمومی ہے تو اسکا کوئی قرین عقل مطلب نہیں
معلوم ہوتا اور باغلب وجوہ ایسی سلطنت قائم نہیں رہ سکتی۔ ۱۷۸۹ء کے فرانسیسی مجلس
واضع نظام سلطنت کا بہ شمول روسو یہ خیال تھا کہ اقتدار شاہی کا دو برابر حصوں میں
تقسیم کرنا ممکن ہے تا کہ اس میں سے ایک قوم کے اختیار میں ہو اور دوسرا بادشاہ
کے اختیار میں، مگر عمل میں آتے ہی معلوم ہو گیا کہ یہ طریقہ بر خود غلط اور ناقابل
انضباط تھا پیرو فریڈرا نے اصول حقوق عامہ (Principes du droit public)

میں یہ ظاہر کیا ہے کہ شاہی میں جب امتیازات برطرف کر دئے جائیں تو وہی جمہوریت ہے مگر امتیازات کے تحت میں اُسنے ہر طرح کے اعیانی اعزاز کو بھی داخل کیا ہے، پس اُسکے نزدیک اس فقرے کے مفہوم میں صرف وہ بادشاہی داخل ہے جس میں عمومی جماعات ہوں مگر اعیانی جماعات نہ ہوں یعنی یہ ایک ناکمل صورت سلطنت کی ہوگی جس میں اعیانی اجزا اکا لحاظ نہ کیا گیا ہو یا اُسے دبا دیا ہو۔ مقابلہ کرو اسی مقالے کے باب ۱۴، ۱۵، ۱۶ سے جن میں آئینی بادشاہی سے بحث کی گئی ہے۔

---

# تیسرا باب

## نظریہ ارسطو کے ترقیات مابعد

مونٹیسکیو

مونٹیسکیو نے اگرچہ اصلاً ارسطو کی تقسیم کی پیروی کی ہے مگر اُس نے بادشاہی، اعیانی اور عمومی تینوں حکومتوں کے لئے (حکمرانوں کی تعداد سے قطع نظر) روحانی اور اخلاقی اصول کا پتا لگا کر ایک نمایاں علمی ترقی دکھائی ہے۔ یہ ایک دوسرا سوال ہے کہ اس مقصد میں اسے کامیابی ہوئی یا نہیں، اسکی رائے میں نیکوکاری (صلاح) جمہوریت کا، اعتدال اعیانیت کا اور اعزاز بادشاہی کا اور خوف، حکومت خودسرانہ کا اصول ہے۔ اُس نے اسطرح خودسرانہ حکومت کو سلطنت کی ایک چوتھی قسم قرار دیدیا ہے۔ مگر ارسطو کے نزدیک وہ معتدل حکومت کی فاسد شکل ہے اور یہی زیادہ بہتر ہے۔

اشلائیر ماخر

اشلائیر ماخر نے قابل قدر کوشش یہ کی ہے کہ سلطنت کی متعدد شکلوں کو سیاسی احساس کے ارتقائی مدارج کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔ سلطنت کی ابتدا اُس وقت ہوتی ہے جب لوگوں میں "حکومت اور رعایا" کے امتیاز لازمی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ اس جانب پہلا قدم اُس وقت اُٹھایا جاتا ہے جب کسی چھوٹی سی قوم (People) یا کسی قبیلے میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے اور یہ نیا جذبہ بالعموم "اُس تمام جماعت میں جو سیاسی زندگی کے لئے تیار ہوتی ہے سرایت کر جاتا ہے" اسکے بعد اس امتیاز کا خیال سب میں نشو و نما پاتا ہے۔ وہ سب کے سب حکومت کے بنانے میں متحد ہو جاتے ہیں اور پھر اُس سے الگ ہو کر رعایا کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ یہ ابتدائی حکومت جمہوریت ہوتی ہے جس میں جذبات عامہ اور اغراض شخصیہ کے درمیان تخالف بہت ہی خفیف صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگرچہ تمام جماعت سیاسی زندگی کے لئے تیار ہو مگر سلطنت قائم کرنیکی تحریک سب پر یکساں اثر نہ ڈالے بلکہ سیاسی احساس اولاً کسی ایک فرد یا چند افراد میں نشو و نما پائے۔ اس سے نامساوات پیدا ہو جاتی ہے اور اسکا نتیجہ شاہی یا اعیانی حکومت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس درجے میں جب تک کہ

سلطنت چھوٹی رہتی ہے، تینوں شکلیں ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہوتی ہیں اور بہت آسانی سے ایک دوسرے کی صورت اختیار کر سکتی ہیں مگر فطری میلان ہمیشہ عمومیت کی طرف رہتا ہے کیونکہ عوام بہت جلد اُس ایک شخص یا اُن چند اشخاص کے برابر ہوجاتے ہیں جن میں سب سے پہلے سیاسی احساس پیدا ہوا تھا۔

دوسرے درجے میں متعدد قومیتیں شامل ہوجاتی ہیں اُن میں سے کوئی ایک قبیلہ باقی دوسرے قبیلوں پر حکمرانی کرنے لگتا ہے۔ جسطرح سابقہ درجے میں سلطنت کی شکل اصلاً جمہوری ہوتی ہے، اُسی طرح اس درجے میں اُسکی شکل اصلاً اعیانی ہوتی ہے۔ اُسکا جمہوری ہونا ممکن نہیں ہے کیونکہ تمام قبیلے ایک حکمران قبیلے کے تابع ہوتے ہیں اور اسلئے ان میں مساوات نہیں ہوتی۔ خارجی حیثیت سے یہ بادشاہی کی شکل اختیار کرسکتی ہے مگر بادشاہ لازماً حکمراں قبیلے کا ہوگا اور اسطرح وہ اعیان میں شامل سمجھا جائیگا۔

اس آخرالذکر درمیانی درجے سے گزر کر تیسرا اور آخری درجہ اُسوقت آتا ہے جب ایک بڑی قوم (People) پوری طرح قومی اتحاد کو محسوس کرنے لگتی ہے۔ پہلے درجے کی عمومی خصوصیت میں حاکم و محکوم کا سیاسی امتیاز پوری طرح نشوونما نہیں پاسکتا۔ اور نہ اس حالت میں ایک بڑی قوم کی وسعت پیدا ہوسکتی ہے۔ دوسرے درجے کی اعیانی حکومت میں حکمران قبیلے کے اغراض ہمیشہ اوروں سے علحدہ ہوتے ہیں اور قومی اتحاد اس سلطنت کا اصول نہیں ہوسکتا مگر تیسرے درجے میں اگر صحیح معنوں میں بادشاہی پورا نشوونما حاصل کرتی ہے اور بادشاہ اپنی ذات سے سلطنت کے اتحاد اور حکومت کی پوری طاقت کا مظہر بن جاتا ہے۔

اشلائیر ماخر کا یہ خیال سلطنت کی تینوں مسلمہ شکلوں کو ایک ذہنی بنیاد پر قائم کرتا اور سیاسی خیال کے ارتقا کے مدارج کے ساتھ انھیں متحد کرتا ہے۔ جمہوریت سب سے پہلے درجے میں اور بادشاہی سب سے آخری درجے میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں اگرچہ کوئی نیا اصول تقسیم نہیں پیش کیا گیا ہے بلکہ اُنھیں مختلف شکلوں کی تہ میں نظر غائر سے کام لیا گیا ہے مگر اشلائیر ماخر کے اس منطقی ارتقا سے تاریخ کا دور کسی طرح پر موافقت نہیں کرتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخی ترتیب اکثر اسکے برعکس ہوتی ہے۔ پہلے شاہی پھر اعیانی پھر عمومیت واقع ہ،

یہی زیادہ فطری ترتیب معلوم ہوتی ہے کیونکہ سوسائٹی کے اعلےٰ طبقات جو زیادہ بہتر حالات میں ہوتے ہیں انھیں میں اولاً احساس سیاسی اپنا زور رکھتا ہے اور اُن سے گزر کر بتدریج وسعت حاصل کرتا ہوا اونٰے حلقوں میں پہنچتا ہے۔

---

# چوتھا باب

## سلطنت کی چار بنیادی شکلوں کے اصول

سلطنت کی چار شکلیں

ارسطو کے قیاس کے مطابق سلطنت کی مختلف شکلوں کی تقسیم تعینی کا انحصار حکومت اور رعایا کے بابت مختلف خیالات امتیازی پر ہے۔ اُس میں خاصکر حکمرانی کی کیفیت کو (نہ کہ اُسکی کمیت کو) زیادہ دخل ہے۔

تصوری حکومت

۱۔ پہلی شکل تصوری حکومت ہے جسکا اعلیٰ ترین نمونہ مذہبی حکومت ہے اُس میں لوگ اپنے حکمران کو ایک مافوق الانسان ہستی سمجھتے ہیں جو از روئے فطرت ان سے بالاتر ہے۔ خود خدا سلطنت کا حقیقی حاکم سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ تصوری حکومت کے بالکل برعکس عمومی حکومت ہے۔ اول الذکر میں لوگ اپنے سے کسی خارج و برتر بیرونی طاقت کے تابع ہوتے ہیں، اور موخر الذکر میں لوگ خود اپنے اوپر حکومت کرتے ہیں۔ یعنی مجموعۃً وہ حاکم ہوتے ہیں اور منفرداً رعایا۔

۳۔ اعیانی حکومت میں حاکم و محکوم کا امتیاز خصایص انسانی کے تابع اور قوم کے حدود کے اندر ہے۔ کوئی اعلیٰ طبقہ یا قبیلہ حکمران ہو جاتا ہے اور دوسرے طبقات و قبائل محکوم ہو جاتے ہیں۔ درانحالیکہ موخر الذکر طبقات کو حکمرانی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا مگر حکمران طبقے کے افراد بھی اپنی انفرادی حیثیت سے رعایا ہی میں شمار ہوتے ہیں۔

۴۔ شاہی میں حاکم و محکوم کا امتیاز کامل ہو جاتا ہے مگر پھر بھی وہ انسانی ہی حد کے اندر رہتا ہے۔ حکومت ایک فرد واحد میں مرکوز ہو جاتی ہے، وہ صرف حکمران ہوتا ہے، اُسکا شمار کسی حیثیت سے رعایا میں نہیں ہوتا گر وہ ہمہ تن سلطنت سے متعلق ہوتا ہے اور اسکی شخصیت اتحاد قوم کا مظہر ہوتی ہے۔

انکے ابتدائی نمونے

یہ چاروں بنیادی شکلیں ایک ایک ابتدائی نمونے کے پرتو ہیں۔

مذہبی حکومت، خدا کی حکومت عالم کی قائم مقام ہے مگر یہ حکومت براہ راست ہوتی ہے اور ایک اعتبار سے سخت و علی الاطلاق حکومت ہے۔

شاہی، ایک فرد واحد کے وسیلے سے نوع انسان کے اتحاد کی شان و شوکت کو بڑھاتی ہے۔ حکمران تمام سلطنت کا نمایندہ ہوتا ہے اور بادشاہ کی ذات میں قومی اتحاد کا جلوہ نظر آتا ہے۔

عمومیت، قوم یا افراد کی جماعتی حیثیت کو ظاہر کرتی ہے اور سلطنت کو ایک مذہبی حلقے یا کمیون کے رنگ میں دکھاتی ہے۔

اعیانی حکومت قوم کے اعلیٰ اور ادنےٰ اجزا کے امتیاز پر مبنی ہوتی ہے اور حکومت اول الذکر کے ہاتھ میں دیدی جاتی ہے۔ جسطرح عمومیت کا نمونہ کمیون ہے اسی طرح اعیانی حکومت کا نمونہ عالی خاندان اور بلند رتبہ امرا ہیں۔

ان شکلوں پہ غور و فکر

ایک نقطہ خیال کے موافق مذہبی اور شاہی حکومت، اعیانیت اور عمومیت کے مقابل معلوم ہوتی ہیں۔ دو اول الذکر صورتوں میں حکومت کا اعلیٰ اختیار و اقتدار اس درجہ مجتمع ہوگیا ہے کہ حکمران میں کسی نوع سے رعایا کی حیثیت باقی نہیں رہتی اور وہ کسی قسم کے شخصی اغراض کا نہیں بلکہ صرف سلطنت کے اغراض کا نمایندہ ہوتا ہے۔ مذہبی حکومت میں حکمرانی کی وقعت و عظمت ربّانی ہوتی اور اس وجہ سے وہ حکومت علی الاطلاق ہوتی ہے۔ شاہی میں جلالت و شوکت انسانی ہوتی ہے، اور اس لئے اس میں نسبت باہمی قائم رہتی ہے۔ اسکے خلاف اعیانی اور عمومی حکومتوں میں حاکم و محکوم کے درمیان کوئی ایسا قطعی فرق ظاہر نہیں ہوتا۔ وہی لوگ ایک وقت میں حکمران ہوتے ہیں اور دوسرے وقت میں مطیع احکام۔ اُنکے اغراض عام و خاص دونوں ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اکثر اُن دونوں کو ایک ہی نام رپبلک (جمہوریہ) کے تحت میں شامل کر دیتے ہیں۔ عمومیت میں فرائض کا یہ امتزاج تمام قوم ( People ) میں وسیع ہوتا ہے اور اعیانیت میں حکمران طبقے تک محدود رہتا ہے۔ آخر الذکر، دوسرے افراد قوم کے مقابلے میں محض حکمران ہوتے ہیں اور باخود ہا انکا نظم بالعموم عمومیت کا ہوتا ہے اور اس لئے وہ ایک ہی وقت میں حاکم بھی ہوتے ہیں اور محکوم بھی۔ پس اعیانیت ایک طرح پر عمومیت اور شاہی کے بین بین ہوتی ہے۔

لیکن ایک دوسری نظر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہی اور اعیانیت ایک دوسرے سے تعلق رکھتی ہیں اور بقیہ دو شکلوں کے خلاف ہیں۔ ان میں حاکم و محکوم کا امتیاز منجانب انسان

ایسے طور پر مرتب ہوا ہے کہ حکمران اس امر کو محسوس کرتے اور جانتے ہیں کہ وہ آزاد ہیں قوم انھیں ایسا ہی سمجھتی ہے، وہ اپنے ہی نام اور اپنے ہی آزادانہ اختیار سے حکومت کرتے ہیں، البتہ اعیانیت کی بہ نسبت شاہی میں یہ حالت زیادہ کامل ہوتی ہے۔
برخلاف اسکے جب خدا یا قوم کو حکمران سمجھا جائے تو لازماً اونکا اختیار کسی وسیلے سے عمل میں آئے گا خواہ کاہنوں کے وسیلے سے عمل میں آئے، یا دنیاوی حکام کے وسیلے سے۔
یہ لوگ بذات خود طبقہ رعایا سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ خدا یا قوم کے خادموں کی حیثیت سے صرف مفوضہ اختیار کو عمل میں لاتے ہیں، اس لئے انھیں حقیقی حکمران نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ ان حقیقی حکمرانوں کی جانب سے جو بذات خاص کار حکومت کو انجام نہیں دے سکتے صرف انتظام کرتے ہیں۔ انھیں ہمیشہ ایک اعلی طاقت کی طرف رجوع کرنیکے لئے مجبور رہنا پڑتا ہے جو خود اُن پر حکومت کرتی ہے اور جو اُنھیں وہ اختیارات تفویض کرتی ہے جنھیں وہ براہ راست خود نہیں حاصل کر سکتے۔

اشکال حکومت کے اعتبار سے سلطنتوں کا فرق نظام سلطنت کے قوانین کی بنیاد ہے، اور اسکا تعلق قانون عامہ سے ہے۔ یہی فرق اُنکی سیاسی زندگی کے میلانات میں بھی پایا جاتا ہے اور یہ میلان اُنکے نظام سلطنت کی ظاہری شکل کے مخالف بھی ہو سکتا ہے۔ ایسا ہونا ممکن ہے کہ کوئی سلطنت کلیسائی فرمانروا یا قسیسوں کی کسی جماعت کے بجائے کسی انسانی حکمران کو تسلیم کرتی ہو، مگر اسکے ساتھ اسکا انداز حکومت مذہبی کی جانب مائل ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی سلطنت اعیانیت کی طرف مائل ہو اگرچہ اُسکا قانون عام کسی قسم کی اعیانیت کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ اسکی مثال سلطنت انگلستان ہے جسکی شاہی شکل اعیانی روح سے مملو ہے۔ ایسی بھی سلطنتیں ہیں جو اصولاً عمومی نہیں ہیں مگر عمومیت کی جانب مائل ہیں۔ جیسے ناروے۔ اسی طرح بعض سلطنتوں میں اگرچہ کوئی واقعی بادشاہ نہیں ہوتا مگر اُنکا میلان بادشاہی کی طرف ہوتا ہے جیسے جمہوریہ فرانس۔

**تعلیق۔** ف۔ رومر ("اصول فرق سیاسیہ" فقرہ ۲۱۶ وغیرہ میں) انسان کی زندگی کے موافق سلطنت کو چار مدارج میں تقسیم کرتا ہے اور اس تقسیم میں وہ سلطنت کی شکل کا خیال نہیں کرتا بلکہ اس کے سیاسی جذبات یعنی خصوصیت فرق کا خیال کرتا ہے۔ اُسکی

چار تقسیمیں حسب ذیل ہیں :۔

نموذجی سلطنت (اڈول اشٹاٹ Idolstaat) جسکا سیاسی جذبہ استیصالی (Rodical) ہوتا ہے۔
افرادی سلطنت (انڈوڈوال اشٹاٹ Individualstaat) جسکا سیاسی جذبہ آزادخیال (Libral) ہوتا ہے۔
قبائلی سلطنت (راسے اشٹاٹ Rassestaat) " " مستقط (Conservative) ہوتا ہے۔
شخصی سلطنت (فورمن اشٹاٹ Formenstaat) " " مطلق العنان (Absolutist) ہوتا ہے۔

پس ایسا ہوسکتا ہے کہ کوئی شاہی ان سیاسی جذبات کے تمام مدارج سے سلسلہ وار گزر کر آخری درجے پر پہنچے۔ ر۔ فون موول نے (''علم سلطنت'' ج ۱ ص ۲۶۲ ببعد) اس نظریے پر یہ اعتراض کیا ہے کہ قوم نہ جوان ہوسکتی ہے نہ بوڑھی، کیونکہ قوم میں بچے بھی ہوتے ہیں اور بوڑھے بھی مگر اُسکا یہ اعتراض اس نظریے کے غلط سمجھنے پر مبنی ہے۔ قدما نے صاف طور پر یہ محسوس کر لیا تھا کہ اقوام مجموعۃً ذی حیات ہونیکے لحاظ سے افراد کے مانند جوانی اور بڑھاپے کے دور زندگی سے گزرتی ہیں، اور فون سوینی نے جرمانیا کے قانونی حلقوں میں اس خیال کو بہت واضح طور پر سمجھا دیا تھا، مگر کسی قوم کی تاریخ میں ان دوران کے بیہم گزرنیکے علاوہ یہ بھی خیال کرنا ضروری ہے کہ ہر قوم کی اپنی خاص اندرونی خصوصیت ہوتی ہے، جسطرح بعض افراد کا مزاج فطرتاً بچوں کا سا ہوتا ہے اور زیادہ عمر پہ پہنچکر بھی انکی یہی کیفیت رہتی ہے اور اسکے برخلاف بعضوں کے مزاج میں پختگی ہوتی ہے اور یہ پختگی سن بلاغت میں بھی نمایاں رہتی ہے، بالکل اُسی طرح بعض قوموں میں فطرتاً بچپن اور بعض میں پختگی ہوتی ہے۔ کئی ہزار برس گزر جانے پر بھی حبشی قوم کا مزاج ابتک بچوں کا سا ہے۔ برخلاف اسکے امریکہ کے اصلی باشندوں نے کئی صدی تک پختگی سن کے خصوصیات کا اظہار کیا ہے۔ براعظم یورپ جہاں متعدد قومیں آباد ہیں وہاں بلا اس خیال کے کہ ہسپانیوں نے کتنے مدارج طے کر لئے ہیں اُن سے پختگی سن کا اظہار ہوتا ہے اور جرمانیا سے تو جوانانہ جوش کا۔ بہرحال جوانی ہو یا بڑھاپا اور یہ جوانی اور بڑھاپا فطری خصوصیت کے باعث ہو یا حسب معمول، دورہائے تاریخی کے گزرنے کے باعث، ہر قوم کی حالت کا اثر اُس سلطنت پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا جس میں وہ رہتے ہیں آئینی شاہی کی مردانہ وضع قوم ہائیتی میں پہنچکر محض بچوں کا کھیل ہوجاتی ہے۔

# پانچواں باب

## سلطنت کے اشکال ثانوی کا اصول

سلطنتوں کی تقسیم باعتبار حقوق رعایا

سرگروہ سلطنت کی حیثیت پر سلطنت کی کل شکل کا دارومدار ہے لیکن نظام سلطنت کی قانونی حیثیت کو پوری طرح منضبط کرنے اور ارسطو کی تقسیم کی تکمیل کیلئے یہ ضروری ہے کہ دوسرے درجے میں رعایا کے حقوق پر بھی بحث کیجائے۔

جسطرح حکومت کی بحث میں حکمران جماعت پر نظر پڑتی ہے اسی طرح رعایا یعنی محدود معنی میں قوم کی بحث میں اس امر پر نظر کرنا پڑتا ہے کہ انھیں حکومت پر کس حدتک نگرانی حاصل ہے اور قانون سازی میں انکا کیا حصہ ہے۔

تقسیم کے اس اصول کی پیروی کرنے سے حسب ذیل تین (یا چار) ثانوی شکلیں حاصل ہوتی ہیں۔

غیر آزاد

۱۔ رعایا محض جسم بے جان سمجھی جاتی ہے اور بغیر کسی شرط کے اس پر حکمران جماعت کی اطاعت فرض ہوتی ہے، انھیں نہ نگرانی کا کوئی حق ہوتا ہے، نہ قانون سازی میں انکا کوئی حصہ۔ اس قسم کی سلطنت میں مطلق العنان حکومت ہوتی ہے اور ہم اسے غیر آزاد شکل کہہ سکتے ہیں۔ سلطنت صرف اسی صورت میں غیر آزاد نہیں ہے جب وہ کسی خودسر بادشاہ کی خودرایانہ آزو حرص کی شکار ہو (یعنی خودسر بادشاہی قائم ہو) بلکہ اس صورت میں بھی وہ غیر آزاد ہے جب کہ حکمران قانون کی پابندی کو تسلیم کرتا اور شخصی ملک و شخصی آزادی کی حفاظت کرتا ہو (یعنی حکومت علی الاطلاق ہو)

نیم آزاد

۲۔ رعایا کا کچھ حصہ یعنی طبقات اعلیٰ، نگرانی کا حق رکھتے ہوں اور معاملات عامہ میں انھیں دخل یا ہو اور اس طرح حکومت محدود ہو جائے لیکن رعایا کا باقی حصہ اور خاصکر ادنیٰ طبقوں کو کسی قسم کا سیاسی حق اور آزادی نہ حاصل ہو۔ یہ سلطنتیں نیم آزاد ہیں۔ انکی مثال ازمنہ وسطیٰ کی وہ سلطنتیں ہیں جو جاگیردارانہ اصول یا طبقاتی حقوق پر مبنی ہیں۔

آزاد

۳۔ تمام طبقات کو سیاسی حقوق حاصل ہوں۔ تمام ملک و قوم کو حکومت پر نگرانی

اور قانون سازی میں شرکت حاصل ہو۔ یہ آزاد سلطنت، یا اس لفظ کے وسیع مفہوم میں جمہوریت ہے (اسی کو "قوم کی سلطنت" بھی کہہ سکتے ہیں)۔

حکومت میں اس شرکت و نگرانی کا عملدرآمد یا تو (الف) اہل شہر کی مجالس کی توسط سے براہ راست ہوتا ہے جیسا قدیم زمانہ کی جمہوری سلطنتوں میں تھا۔ یا (ب) بالواسطہ مجالس و نائبین کے ذریعے سے ہوتا ہے جیسا موجودہ زمانے کی نیابتی سلطنتوں میں رواج ہے۔

اب اگر ہم بنیادی شکلوں اور ان ثانوی تقسیموں کو یکجا کریں تو نتائج ذیل حاصل ہونگے۔

سلطنت کے چار بنیادی اشکال اور تقسیم

۱۔ مذہبی حکومت اپنے اصول کے لحاظ سے غیر آزاد سلطنت کی طرف مائل ہوتی ہے گو یہ ضروری نہیں کہ وہ خودسر حکومت ہو کیونکہ ممکن ہے کہ کار فرما خدا، یا صاحب الہام کاہن (یا روایت) ملت کے قانون کو تسلیم کرتا اور اسکی عزت کرتا ہو اسلئے اس خدائی حکومت میں جس حد تک اعیانی جماعت یا قومی مجلس کی شرکت ہوگی اس حد تک ممکن ہے کہ وہ دوسری یا تیسری شکل تک پہنچ جائے۔ اس لحاظ سے یہودیوں کی مذہبی حکومت جمہوری تھی۔

۲۔ اعیانی حکومت بالطبع دوسری صنف یا نیم آزاد سلطنت کی طرف مائل ہوتی ہے، لیکن جب عوام کو مطلق کسی قسم کے سیاسی حقوق نہ حاصل ہوں تو اسے غیر آزاد سمجھنا چاہئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب روما کی طرح عوام کو حقیقی نیابت کا موقع دیا جائے تو یہ سلطنت ایک آزاد قومی سلطنت تک ترقی کر جائے۔

۳۔ عمومیت فطرتاً تیسری صنف سے تعلق رکھتی ہے، لیکن یہ ممکن ہے کہ قلت کیلئے عمومیت خودسرانہ حکومت کی حیثیت اختیار کرلے یا شہریوں کیلئے فرداً فرداً وہ ایک مطلق العنان حکومت بن جائے۔ ماسوا اسکے مملوک طبقے کے لئے (جیسے قدیم زمانے میں غلام اور نیم غلام تھے یا اس زمانے میں امریکہ میں حبشی ہیں) یہ نیم آزاد سلطنت کی شکل اختیار کرسکتی ہے۔

۴۔ شاہی جو سلطنت کے تمام اصناف میں سب سے زیادہ مختلف النوع ہے وہ ان تینوں صنفوں سے ملکر بہت سی شکلیں پیدا کرلیتی ہے۔ مشرق کی خودسر حکومتیں اور مغرب کی مطلق العنان حکومتیں بدیہی طور پر غیر آزاد ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کی بادشاہتیں اور امارتیں جن پر پادریوں اور ملکی امیروں کی روک قائم تھی وہ نیم آزاد تھیں۔ روما کی بادشاہت کو (جس صورت سے کہ اسے سرویس تولیس نے ترتیب دیا تھا) اور قدیم فرانسیسیوں اور جدید اہل ناروے کی بادشاہتیں آزاد شاہی کے مثال کا کام دے سکتی ہیں، کیونکہ ان سب

بادشاہتوں میں قومی مجلس کو حکومت میں صرف حصہ دیا گیا تھا۔ زمانۂ حال کی آئینی بادشاہت
اُس آزاد سلطنت کے بہت ہی قریب پہنچ گئی ہے جس میں نیابتی نظام سلطنت رائج ہو۔
ارسطو کی تقسیم اوپر سے شروع ہوتی ہے اور یہ بالکل بجا ہے۔ ہم نے اس تقسیم کو
نیچے سے شروع کرکے اس پر بحث کی ہے۔ جب ارسطو کی تقسیم کو اس سے ملا کر اسکی تکمیل کردیگئی تو
اسکے تمام اعتراضات رفع ہو گئے۔ اب یہ دعویٰ کرنا ممکن نہیں ہے کہ اس میں قطعیت نہیں
ہے یا وہ زمانۂ حال کی نیابتی عمومیت اور آئینی بادشاہت کے باہمی تعلقات یا مطلق العنان
بادشاہت اور ازمنۂ وسطیٰ کی محدود بہ حقوق طبقات بادشاہت کے حقیقی فرق کے
مباحث سے عاجز ہے۔

تعلیق۔ سلطنتوں کی ان ثانوی شکلوں کو قائم کرنیکا خیال مجھے گیئورنگ وائتس کی سلطنتوں
کی مختلف شکلوں کی دلچسپ تحقیق سے پیدا ہوا۔ (سیاسیات Politik صفحہ ۱۰۰ وغیرہ)
وائتس جمہوریت، اس سلطنت کو کہتا ہے جس میں حکومت کا انحصار یا تو قوم پر ہو یا قوم کے
منتخب کردہ قائم مقاموں پر ہو۔ برخلاف اسکے، بادشاہت وہ ہے جہاں ایک شخص
واحد اپنی ذاتی قوت کے بل پر قوم سے بالکل آزاد ہوکر حکومت کرتا ہو۔ وائتس کے خیال میں
ارسطو کی تقسیم ثانوی تقسیم ہے اور خود اُسکی تقسیم اولین تقسیم ہے۔ اس کی رائے کی رو سے
روما کی شہنشاہی جمہوریت قرار پاتی ہے اور جرمانی شہنشاہی بادشاہت۔ قدیم رومی سلطنت
اعیانی بادشاہت ٹھہرتی ہے اور نپولین کی شہنشاہی جمہوریت ہوجاتی ہے لیکن اس ترتیب
سے دونوں تقسیموں کے اندر خوبی کے بجائے ابتری پیدا ہوجاتی ہے۔ اوپر جو ترتیب دیگئی ہے
اور جسکی بنا حکمران کے اوصاف اور رعایا کے حقوق دونوں پر رکھی گئی ہے نہایت ہی صاف
و واضح ہے، اور ارسطو کی تقسیم کے مکمل کرنیکے لئے ضروری ہے۔ اس سے قابل اطمینان طور پر
یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کیوں آئینی بادشاہت مطلق العنان بادشاہت کے بجائے نیابتی
عمومیت سے زیادہ قریب ہے۔

---

# چھٹا باب

## تصوری یا مذہبی حکومت

مذہبی حکومت کا ابتدائے عالم میں طبعی ہوتا

مذہبی حکومت سلطنت کی وہ شکل ہے، جسکا تعلق نوع انسان کے عہد طفولیت سے ہے سیاسی ارتقا کو سب سے پہلے ایشیا اور شمالی افریقہ میں نشوونما حاصل ہوا اور یہیں پہلے پہل مذہبی سلطنتیں دکھائی دیں۔

نوع انسان کے زمانۂ طفولیت میں امداد ربانی اور فطرت کی پراسرار قوتوں پر انحصار کرنا بہت نمایاں نظر آتا ہے اور انسان کی زندگی یا تعلیم پر خدا یا فطرت کا اثر اُس سے زیادہ بلا واسطہ اور قوی تھا، جیسا اسکے بعد رہا ہے۔ قدیم زمانے کے تمام قصّے کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کے ایک یا زائد دیوتاؤں کے ساتھ شخصی تعلقات قائم تھے۔ افلاطون نے یونانی قوم کی جو ابتدائی حالت بیان کی ہے وہ تمام دوسری قدیمی اقوام کی حالت سے متفق ہے۔ اُس نے مفصل لکھا ہے کہ کیونکر اسوقت کے انسان کی کمزوری اور ناقابلیت پر خیال کر کے کرونوس نے آدمیوں کے بجائے انسان سے بالاتر اور خدائی نسل کے دیوتوں کو بادشاہ اور حکمران مقرر کیا۔" افلاطون خود بھی اس مذہبی تصور کا جانبدار تھا اور اس قدیم ربانی حکومت کی طرف لوگوں کو مائل کرنیکے لئے اس نے اپنے نظریۂ سلطنت میں طرح طرح کے حیلے استعمال کئے ہیں۔

اس سے قسیسوں کی حکومت لازم ہوجاتی ہے

خداؤں اور دیوتوں کو سلطنت کا اصل حکمران سمجھنے کے اعتقاد کا نتیجہ یہ تھا کہ قسیسوں کا اثر سب پر حاوی ہو جائے کیونکہ فانی انسانوں میں یہی وہ برگزیدہ لوگ تھے جو خداؤں کی خدمت کیلئے وقف ہوتے تھے اور وہی اُنکی مرضی اور اُنکے کلام کو سمجھ سکتے تھے۔ لامحالہ اس قسم کی قوموں میں قسیسوں کو سب سے اعلیٰ مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ بعض قوموں میں قسیس براہِ راست ایک یا زاید خداؤں کے نام سے حکومت کرتے ہیں بعض میں سلطنت کی زمام حکومت بادشاہوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے مگر اُن کی حکمرانی صرف خدا کے نائب اور اُس کے عامل کی حیثیت سے ہوتی ہے اور یا تو وہ خود قسیس اعظم ہوتے ہیں یا دوسرے

قسیسوں کے اثر و اقتدار میں ہوتے ہیں۔ اول الذکر کو خالص سلطنت قسیسی اور ثانی الذکر کو محدود سلطنت قسیسی کہہ سکتے ہیں اور اس سے حکومت مذہبی سے گزر کر شاہی کی طرف قدم آگے بڑھتا ہے۔

میروئے

میروئے میں اہل حبش کی سلطنت خالص قسیسی سلطنت تھی۔ قسیسوں کی ذات سب ذاتوں سے بلند مرتبہ تھی، وہ اپنے گروہ میں سے چند بہترین افراد کو نامزد کرتے تھے اور باوقار رسومات کے ساتھ خدا اُن میں سے ایک کو منتخب کرلیتا تھا۔ لوگ خدا کے اس نامزد کردہ شخص کے سامنے فوراً اظہار اطاعت کرتے اور نائب خدا کی حیثیت سے اُسکی وقعت کرتے تھے مگر خدائی قوانین اور قسیسوں پر مرضی خدا کے انکشافات کے ذریعے سے اس سردار کے اختیار ہر طرف سے محدود ہوگئے تھے۔ نہایت سخت رسومات نے اسکے جملہ حرکات کو منضبط کردیا تھا اور اسکے لئے آزادانہ روش کا کوئی موقع باقی نہیں چھوڑا تھا۔ قسیس ہر جگہ اسکے ہمراہ اور اسکے کاموں میں شریک رہتے تھے۔ اُسکی زندگی تک محفوظ نہیں تھی اگر وہ خدا کو ناخوش کرتا تو خدا قسیسوں پر اُسکو منکشف کردیتا تھا اور وہ خدائی غضب سے اُسے مطلع کردیتے تھے اور اسکے لئے کوئی چارہ کار سوا اسکے باقی نہیں رہتا تھا کہ وہ خودکشی کرکے خدا کے غصّے کو فرو کرے۔[۵۲]

مخلوط قسیسی سلطنت کی مثال مصر کی سلطنت میں ملتی ہے۔ عام روایت یہ ہے کہ اولاً دیوتا براہ راست حکومت کرتے تھے۔ چند صدی بعد انسان بادشاہ ہونے لگے مگر وہ بھی یا خدا ہی سمجھے جاتے یا خدا کی اولاد سمجھے جاتے تھے اور اُنکے اختیارات خدائی قانون، معینہ رسوم و آداب اور ایک اعلیٰ فرقہ قسیسین کے اثر سے محدود تھے۔ خدائی احکام اس قدر جزئیات پر حاوی تھے کہ بادشاہ اپنا کھانا تک خود پسند نہیں کرسکتا تھا بلکہ اُس کی قلیل غذا ہمیشہ کیلئے مقرر ہوجاتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اُسکی زندگی میں قسیس یہ جرأت نہیں کرسکتے تھے کہ اُس پر کوئی حکم صادر کریں مگر اُس کے مرنیکے بعد وہ ایک عام عدالت قائم کرکے اُسکے متعلق فیصلہ صادر کرتے تھے اور اُسی فیصلے پر اخلاف میں اُس کی عزت کا دار و مدار ہوتا تھا اور دوسرے عالم میں اسکی روح کو اُس کے موافق جزا و سزا ملتی تھی بلکہ اُسکا

---

[۵۲] ڈیوڈورس۔

حشر ثانی بھی اُسی پر منحصر ہوتا تھا۔ اہل مصر کو حیات بعد از ممات پر اسقدر قوی اعتقاد تھا کہ وہ مردے کے جسم کو خراب ہونے سے بچانیکے لئے بے انتہا کوشش کرتے تھے۔ اُسکی تزئین میں نہایت اسراف کرتے اور اُسکے رکھنے کیلئے ایسا محل بناتے تھے جس میں تمام ضروریات زندگی کا لحاظ ہوتا تھا۔ پس ظاہر ہے کہ اُس فیصلے پر کیسی کچھ امید و بیم کی حالت رہتی تھی اور اس ذریعے سے قسیسوں کے ہاتھ میں کیسی مہیب طاقت آگئی تھی۔

ہندوستان

قدیم ہندوستانی سلطنت بھی مصر کی سلطنت سے مشابہ تھی اور بالکل تصوری سلطنت تھی۔ ذات کی ترتیب میں بادشاہ، برہمن سے نیچے درجے پر تھا۔ برہمن اپنی لڑکی بادشاہ کو دینا اپنی اور اپنی لڑکی کی ذلت سمجھتا تھا۔ بایں ہمہ شاہی عظمت کا پایہ اس قدر بلند خیال کیا جاتا تھا کہ اُس میں ایک حد تک الوہیت کا شمول سمجھ لیا گیا تھا۔ منو کے قوانین کے موافق بادشاہ کا جسم پاک اور متقدس ہے کیونکہ اسکی ترکیب اُن عناصر سے ہوتی ہے جنکی تخلیق دنیا کے آٹھ خدائی محافظین سے ہوتی ہے" وہ آفتاب کی طرح آنکھ اور دل کو خیرہ کر دیتا ہے اور کوئی شخص اُسے رو در رو دیکھنے کی جراءت نہیں کرسکتا۔ خدا نے اُسے تمام مخلوقات کے محفوظ رکھنے کیلئے پیدا کیا ہے۔ بچپن میں بھی کوئی اسکی تحقیر نہیں کرسکتا اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایک معمولی انسان ہے کیونکہ ایک بہت بڑی خدائی قوت اسکے اندر موجود ہوتی ہے[۴]۔

ہندوستانی بادشاہ کے گرد پروہتوں کا مجمع رہتا تھا۔ تخت نشینی کے وقت لازم تھا کہ وہ اسکی تقدیس کریں۔ سات یا آٹھ وزرا جن سے تمام معاملات میں صلاح لینا اُس پر لازم تھا وہ تقریباً سب کے سب برہمن ہوتے تھے۔ ذی علم برہمنوں کی صلاح لئے بغیر وہ کوئی اہم کام نہیں کرسکتا تھا۔ نہایت سخت رسوم و رواج نے اُسے پابند بنا رکھا تھا اور اگرچہ منو کے قوانین اسکی ذمہ داری کو بہت قطعی الفاظ میں ظاہر نہیں کرتے تاہم وہ نہایت پرہیبت الفاظ میں اسکی ذمہ داری اُسے یاد دلاتے رہتے ہیں "وہ بیوقوف جو اپنی ناانصافی سے اپنی رعیت کو پریشان کرے بہت جلد وہ خود اور اُسکا سارا خاندان اپنی سلطنت اور اپنی جان کھو دیگا"[۵]۔

---

[۴] "منو کا دھرم شاستر" (انگریزی ترجمہ۔ سر ولیم جونس۔ ۵-۹۶-۹۷،۴۰، ۳، ۸)

[۵] " " ۷، ۴۵ وغیرہ

پھر بھی ہندوستانی سلطنت چونکہ اعلیٰ آریائی خصوصیات رکھتی تھی اس وجہ سے وہ مصر کی سلطنت سے زیادہ آزاد تھی۔ ہیروئے اور مصر کی سست اور کاہل سلطنتوں کے مقابلے میں یہاں شاہی عظمت و سطوت زیادہ کامل طور پر ترقی کر گئی تھی مگر ان سب سلطنتوں میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ذات کا طریقہ سختی کے ساتھ قائم تھا اور قسیسوں کو بہت بڑے امتیازات حاصل تھے۔ قوم کی آئینی زندگی بالکل انھیں کے قبضے میں تھی اور دنیاوی ساز و سامان سے بھی وہ بافراط بہرہ اندوز تھے۔ مصر میں وہ ایک تہائی زمین کے مالک تھے[۵۶] اور ہندوستان کا قانون یہ تھا کہ "بادشاہ اگر تنگدستی کی وجہ سے مر بھی رہا ہو تو بھی کتب مقدسہ کے عالم برہمنوں پر کسی قسم کا محصول نہیں لگا سکتا اور نہ وہ اسکا روادار ہو سکتا تھا کہ ایک ایسا برہمن فاقہ کشی کی تکلیف اُٹھائے"[۵۷] نیچے طبقے کے لوگ ہر طرح پر پریشان کئے جاتے اور قابل نفرت سمجھے جاتے تھے اور شخصی ترقی کے ذریعے سے اپنی اس سخت قسمت کو آسان بنانیکا ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ مصر کے کسان محض وابستۂ اراضی غلام تھے جنکا کام صرف یہ تھا کہ وہ قسیسوں، بادشاہوں اور جنگجویوں کی زمین کی کاشت کریں۔ گڈرئے اور دستکار اپنے موروثی پیشے کا کام کرنے پر مجبور تھے۔ ان پر بیدریغ محصول لگائے جاتے اور سیاسی تنظیمات میں انھیں کسی قسم کا عملی حق حاصل نہیں تھا۔ ہر قسم کی جبری مزدوری (بیگار) اُن ممالک میں عام تھی۔

صدیوں تک مذہبی حکومت کی خصوصیت ایشیا کی سلطنتوں میں قائم رہی۔ اور اب بھی مشرقی ممالک میں اسکا اثر برابر محسوس ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ملکی حکمرانوں نے جب وسیع ممالک کے فتوحات سے اپنی طاقت بڑھالی تو مذہبی پیشواؤں کا اقتدار ماند پڑگیا اور انکی منزلت گھٹ گئی، مگر ان حالتوں میں خود حکمران ہی خدا بن گئے اور اسطرح ہر سلطنت کا مذہبی طریق حکمرانی بدستور قائم رہا۔ البتہ اسکی قدیم شکل میں فرق پڑگیا۔ اولاً خدا بذات خود حکمرانی کرتا تھا اور بادشاہ اور مذہبی پیشوا اُسکے کارکن تھے اُس کے بعد حکمرانی آہستہ آہستہ کر کے مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں آنے لگی اور انھیں میں سے یا فوجی لوگوں میں سے

---

[۵۶] ڈیوڈورس ج ۱ صفحہ ۷۳۔
[۵۷] منو کا دھرم شاستر۔ ۷/ ۱۳۳۔

کوئی شخص اُنکے سرگروہ کے طور پر بادشاہ ہونے لگا۔ آخر میں بادشاہ نے خود خدائی عظمت و منزلت حاصل کرلی اور فوق انسانی مطلق العنانی پیدا ہوگئی۔ ایرانیوں کی شہنشاہی میں یہی صورت پیش آئی اور یہانتک کہ موخر زمانے کے مسلمان سلاطین عہ اور شاہان چین کی بھی کچھ ایسی ہی روش تھی۔

ایران

گشتاسپ (وشتاسپ) جو سنہ ۱۰۰۰ کے قریب ایران کا بادشاہ تھا اور جسکے زمانے میں زردشت کا ظہور ہوا تھا وہ اپنے کو "مئوید بادشاہ" کہتا تھا اور ایران کی کتب مقدس "زند و اوستا" عہ میں ہندوستان کی طرح بادشاہ اہل سیف کی ذات سے نہیں ہوتا تھا بلکہ اسکا شمار مئوبدوں (یعنی عالمان قانون و مذہب) میں کیا جاتا تھا۔ ۸ہ تمام سیاسی نظم و نسق مذہبی اصول پر تھا قانون اور اخلاق کے درمیان کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ یزدان اور اہرمن کا غیر مرئی عالم انسان کے عالم مرئی سے ہمہ وقت تعلق رکھتا ہے، مگر جب ایران میں فرقہ مذہبی سے باہر بادشاہ ہونے لگے تو سلطنت یوماً فیوماً خود سرانہ ہوتی گئی اور مئوبدوں کا اثر اگرچہ پھر بھی بہت کچھ باقی رہا مگر قدیم زمانے کا اُتنا نہیں رہا۔ بادشاہ کو ویسی ہی ہمہ گیر طاقت حاصل ہوگئی جیسے خود اُس خدا کو تھی جس نے اُسے بادشاہ بنایا تھا۔ اُسکا دربار دنیا میں یزدان کے آسمانی دربار کی نقل تھا۔ خدا کے مانند اُسکی تعظیم و تکریم کیجاتی تھی۔ وہ سرخ لباس پہنکر اور سرپر طرہ لگاکر اپنے بلند سونے کے تخت پر بیٹھتا تھا اُس کے ہاتھ میں سونے کا عصا ہوتا تھا اُسکی بغل میں آفتاب کی سی چمک دار تلوار ہوتی تھی اور غیر ملک کے سفیر اسکے سامنے اس طرح زمین بوس ہوتے تھے

---

عہ۔ (مسلمان بادشاہوں سے متعلق مصنف کا یہ خیال مبالغے پر مبنی ہے۔ اردو مترجم۔)

عہ (یہاں ہونا چاہئے تھا: "ایران کی مقدس کتاب اوستا"۔ بلنجلی کے زمانے تک تقریباً سارے مصنف یہ غلط خیال رکھتے تھے کہ زند اور اوستا دو کتابیں ہیں حقیقت میں "اوستا" اصل مقدس کتاب ہے اور "زند" اور "پازند" اسکے ترجمے اور تفسیریں ہیں۔ اردو مترجم)

۸ہ فلرس کی تصنیف "چند اوراق زردشت کے مذہب کے متعلق" (Fragmente ueber die Religion des Zonoastro) صفحہ ۳۳ تا ۶۹۔ مقابلہ کرو اشپیگل تصنیف "اوستا" لائپتسگ سنہ ۶۳-۱۸۵۲ء۔

جیسے کوئی غلام اپنے آقا کے سامنے یا عبادت کرنیوالا اپنے خدا کے سامنے سر بسجود ہو۔ اسکے سامنے نذریں اس طرح پیش ہوتی تھیں جیسے خدا کے سامنے قربانی پیش ہوتی ہے اور جب وہ مرجاتا تو اصطخر (Persipolis) کے شاندار مقبرے کے اندر رکھا جاتا تھا کہ وہاں وہ (ظاہری موت کے بعد بھی) اپنی متبرک زندگی کا سلسلہ قائم رکھے۔ بادشاہ مقدس مراسم اور معینہ رسوم سے موقر ہوتا مگر درحقیقت یہ مراسم اُسے ایک زرین جال کی طرح سے گھیر لیتے تھے۔ اسکی تمام آزادی جاتی رہتی تھی اور اُسکا پر فخر امتیاز مطلق ایک مضحکہ بن جاتا تھا۔

بایں ہمہ، مذہبی فرقے سے نکل کر مطلق العنان شاہی کی طرف بڑھنا ترقی کا ایک قدم آگے بڑھنا تھا۔ ستاروں کی گردش کو مذہبی فرقے کے لوگ خدائی الہام جانتے تھے اور اسی سے امور سلطنت کو بھی طے کرتے تھے اور سلطنت کے احکام کو خدائی احکام سمجھ کے ایسا اٹل بنا دیا تھا کہ اُن میں ایک نقطے کی کمی بیشی ممکن نہ تھی۔ اُنکی ان سخت بندشوں کو اس تغیر نے شکست کر دیا۔ مطلق العنانی ہی سہی مگر معاملہ عامہ میں ایک آزاد انسانی رائے اپنا عمل کرنے اور سیاسی حالات کے تغیر اور قوم کی نئی ضروریات پر توجہ کرنے لگی اس طرح ذات کی آہنی بیڑی ایران میں بہت پہلے ٹوٹ گئی۔

یہودیوں کی حکومت مذہبی

قدیم مذہبی حکومتوں میں سب سے زیادہ نمایاں حکومت یہودیوں کی حکومت تھی جو حضرت موسیٰؑ کے ارشادات کے بموجب قائم ہوئی تھی۔ موسوی مذہب کی پاکیزگی اور دنیا کے بنانے اور قائم رکھنے والے خدائے واحد پر پکا ایمان وہ مستحکم بنیاد تھی جس پر یہودیوں کی مذہبی حکومت کی عمارت تعمیر ہوئی تھی۔

یہودیوں میں خود خدا یاوے یا یہووا (Gehovah) کے نام سے بادشاہ تھا، وہ ایک فانی مگر برگزیدہ قوم کا غیر فانی رب تھا وہ مقنن بھی تھا اور حکمران بھی تھا۔ وہ تمام نظام قانون جسے ہم موسوی قانون کہتے ہیں، اُس خدا کا الہام کردہ قانون سمجھا جاتا تھا جس سے حضرت موسیٰؑ قلہ کوہ کی تنہائی میں ہمکلام ہوتے جس کے احکام کو وہ خوف و دہشت کے ساتھ قبول کرتے، اور اپنے رب کے حکم کے مطابق حرف بحرف اپنی اُمت میں انھیں شائع کرتے تھے۔ کوہ سینا پر رعد و برق سے خدا کی موجودگی کا اظہار ساری اُمت پر ہوتا تھا۔

اس ربانی حکومت سے تمام قوم کی سطح بلند ہو گئی تھی، مگر مصر میں لوگ ہنوز

اُس سے نفرت کرتے اور ہر اعلیٰ ذات والا مصری یہودیوں کو مردود سمجھتا اور یقین کرتا تھا کہ اُن سے میل جول رکھنے سے انسان نجس ہو جاتا ہے۔ اب انکے خیالات اس تصور سے بلند ہو گئے تھے کہ وہ خدا کے برگزیدہ اور پسندیدہ لوگ (امت) ہیں۔ اگرچہ وہ خاندانی قبائل میں منقسم تھے اور ان میں سے لیوی (Leuvi.) قبیلہ خاص طور پر مذہبی قبیلہ تھا اگروہ سب کے سب حضرت ابراہیمؑ اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کی اولاد میں سے تھے اور ساری قوم مذہبی پیشواؤں کی ایک قوم مانی جاتی تھی۔ معہذا ذاتوں کا بین امتیاز اصولاً اٹھ گیا تھا اور قبائل کی برادری نے ایک اصول کی حیثیت حاصل کر لی۔

خدا کا قانون ایک تابوت کے اندر رکھا ہوا تھا جس پر سونا چڑھا ہوا تھا اور اسکے اوپر زریں عرش رحمت تھا دو کروبیاں اسکی حفاظت کرتے تھے اور الہامات ربانی کے مقام کے طور پر لوگ اُسے مقدس سمجھتے تھے تابوت اور "عرش رحمت" دونوں مقام اقدس کے اندر قبتہ العہد (Tabernaell) میں ایک پردے کے پیچھے رکھے ہوئے تھے اور یہ قبہ گویا خدا کا قیام گاہ سمجھا جاتا تھا اور احبار نہایت احتیاط کے ساتھ اسکی حفاظت کرتے تھے۔ یہیں پر ربی اعظم، یاوے کے احکام حاصل کرتا اور اُنھیں لوگوں کو سناتا تھا۔ ربی اعظم موسیٰؑ کے بھائی ہارونؑ کی اولاد میں ہونیکے باعث مرضی خدا کے اظہار کا طبعی ذریعہ تھا اور خدا کے حضور میں اپنی قوم کا نائب بھی تھا۔ مستثنیٰ طور پہ نازک وقتوں میں یاوے، نبی بھیجتا تھا تاکہ وہ اسکے احکام کی طرف سے لوگوں کی غفلت کو دفع کریں۔ بادشاہوں یا خود امت کے خوابیدہ ایمان کو بیدار کریں، مذہب کے ترک کرنیکی سزا دیں، استغفار اور کفارے کی تاکید کریں اور امت کی آئندہ قسمت کا اظہار کریں۔ قبائل میں عدل رسی کے انتظام کے لئے جو قضاۃ مقرر ہوتے تھے وہ یاوے کے نام سے احکام نافذ کرتے تھے کیونکہ "عدالت خدا ہی کی ہے" اسلئے اُن پر لازم تھا کہ "فیصلہ میں کسی کے رتبے کا خیال نہ کریں بلکہ ادنیٰ و اعلےٰ سب کی سنیں اور کسی انسان سے خائف نہ ہوں"!

اگر کوئی مقدمہ انکی قوت فیصلہ سے باہر ہوتا تو اُن کو لازم تھا کہ "قبتہ العہد" کی طرف رجوع کریں اور وہاں سنیں کہ خدا ربیوں کی زبان سے کیا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ اُنکا فرض تھا کہ اس فیصلہ کی تعمیل کریں ورنہ اپنی جان دیدیں۔

جسطرح کہ قوم یاوے کی سخت مگر بابرکت حکومت کی رعایا تھی اسی طرح سے ارض موعودہ کی

تمام اراضی یاوے کی ملک تھی، اور مختلف خاندان محض مستاجر کے طور پر اس پر قابض تھے۔ خدا کی ملکیت کے اقرار میں زمین اور مویشی کی پیداوار کا دسواں حصہ ربیوں کی گزراوقات کے لئے قبتہ العہد میں پیش کرنا لازم تھا جس طرح انسان کیلئے ہر ساتواں دن آرام کا دن تھا اسی طرح زمین کے لئے ہر ساتواں سال آرام کا سال تھا۔ اس سے وہ زمین بھی مستثنیٰ نہیں تھی جس پر کاشت نہ ہوتی تھی۔ جب اسی طرح ساتواں برس سات مرتبہ ہو چکتا تو جشن کا زمانہ آتا اور زمین از سر نو تقسیم کیجاتی، اور افلاس زدہ خاندانوں کو انکی زمینیں واپس ملجاتیں اور جن لوگوں نے دولت جمع کرلی ہوتی انھیں اپنی دولت کا زائد حصہ چھوڑنا پڑتا تھا۔ کوئی یہودی کسی حال میں غلام نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ اگر افلاس کی وجہ سے وہ خود اپنے کو فروخت کرنے پر مجبور ہوتا تو وہ ایک اجرتی خادم یا مزدور سمجھا جاتا اور جشن کے سال میں آزاد ہو جاتا تھا۔ یہودیوں میں غلام ہمیشہ غیر نسل کے ہوا کرتے تھے۔

بعد کے زمانے میں جب یہودیوں نے اپنے میں ایک بادشاہ ہونیکی خواہش کی "تاکہ وہ بھی دوسری قوموں کی ہمسری کرسکیں" تو یاوے نے اُن کے قاضی القضاۃ شموئیل (سموئل)[1] نبی کی زبان سے انکی اس خواہش کے پورے ہونیکی انھیں اطلاع دی۔ اور خود نبی کو ان الفاظ میں تسلی دی کہ "قوم کے لوگ تم سے جو کچھ کہیں اُسے سنو۔ کیونکہ انھوں نے تم سے نہیں بلکہ مجھ سے انکار کیا ہے تاکہ میں اُن پر حکمرانی نکروں"۔ پس اسطرح سلطنت خالص مذہبی حکومت سے گزر کر شاہی بن گئی، مگر یہ شاہی ہمیشہ ایک حد تک مذہبی رہی اور قوم یہود کی سرتاپا مذہبی طبیعت اور مقصد کا اُس پر اثر پڑتا رہا۔

یورپ میں اس قدیم حکومت مذہبی کا اثر کہیں خال خال نظر آجاتا ہے اور وہ بھی کمزور۔ رومی قیصر کا نیکولا سونے کی ڈاڑھی لگائے ہوئے اور بجلی کی ہتھیار کے ساتھ جوپیٹر (مشتری) کی حیثیت سے عوام میں ظاہر ہوتا۔ ہیلیوگبالس ایک قسیس کی حیثیت سے آفتاب کو نذر چڑھاتا ہے۔ سوئزرلینڈ کے حصوں میں گیسلر آزاد پہاڑیوں کو حکم دیتا ہے کہ شہنشاہ کی ٹوپی کی تعظیم کریں۔ یہ سب ایک سلطنت کی تباہ شدہ شکل کے

[1] سموئیل ۸ ہشتم

سہو (عبرانی شموئیل (شن ساکن اور یائے مجہول) کا معرب ہے سموئل۔ اردو مترجم)

صرف خدا کے ہیں اور انھیں دوام حاصل ہونیکا کوئی حق نہیں ہے مگر حکومت مذہبی کے کچھ آثار رومی شہنشاہی میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً زندہ شہنشاہوں کے مجسموں اور انکے مندروں کا بننا۔ مرنیکے بعد انھیں "خدا" کے نام سے یاد کرنا۔ زمانہ ما بعد کے بزنطینی دربار کے آداب و رسوم بھی اسکے شاہد ہیں۔

ازمنۂ وسطیٰ میں پادریوں کے اثر نے عیسوی سلطنتوں کو ایک طرح کی مذہبی حکومت کا رنگ دیدیا تھا کیونکہ یہ لوگ ہمیشہ مذہبی حکومت کے اصول کے قائل رہے اور اُس پر زور دیتے رہتے تھے۔ یہ رنگ دنیاوی اور مذہبی دونوں قسموں کی امارتوں میں نمایاں تھا لیکن آخرالذکر پر طبعاً یہ رنگ زیادہ گہرا چڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ شہنشاہ کیلئے ضروری تھا کہ وہ اہل مذہب کے ہاتھ سے تقدیس حاصل کرے[ب]۔

لیکن ازمنۂ وسطیٰ میں لوگ ہر قسم کے استحقاق و اقتدار کو خدا کی طرف منسوب کرنیکے کیسے ہی شائق کیوں نہ رہے ہوں، اُنھوں نے اپنے حکمرانوں کو کبھی انسان سے زیادہ نہیں سمجھا اور اُنھوں نے انکے اختیار پر بے شمار انسانی قیود عائد کردئے تھے۔

یورپ میں حقیقی مذہبی حکومت کلیسائے عیسوی ہے، جسے پادریوں نے اپنی "حکومت مقدس" بنا لیا ہے۔ دنیاوی حکمرانوں اور حکومتوں کو کلیسا ہمیشہ انکی انسانی حیثیت یاد دلاتا رہتا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنتوں کی بنیادی شکل درحقیقت مذہبی حکومت کے بجائے اعیانی یا شاہی حکومت کی ہے۔

برخلاف اسکے ازمنۂ وسطیٰ میں جو اسلامی سلطنتیں قائم ہوئیں انکی نوعیت کے لحاظ سے ہم انھیں مذہبی حکومت کہہ سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمان، یہودیوں کی طرح یقین نہیں رکھتے تھے کہ خدا براہ راست اور باقاعدہ حکمرانی کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موسوی مذہبی حکومت کو دوبارہ قائم نہیں فرمایا مگر قرآن شریف نے یہ تعلیم دی ہے کہ

(ب) سات الکٹر (انتخاب کنندے) جب ایک حکمران کو منتخب کر دیتے تھے تو وہ "شاہ رومیاں" کا لقب اختیار کرتا تھا۔ وہ باضابطہ اُسوقت تک شہنشاہ نہیں ہوتا جبتک کہ پوپ اُسے تاج نہ پہنائے اور اس میں اکثر تاخیر ہوا کرتی تھی۔ چارلس پنجم آخری شہنشاہ تھا جس نے پوپ کے ہاتھ سے تاج پہنا۔ اسکے جانشینوں نے انتخاب کے ساتھ ہی "شہنشاہ" کا لقب اختیار کرلیا۔ ۱۸۰۶ء میں فرانسس ثانی کے دست کش ہوجانے پر مقدس رومی "شہنشاہی" کا خاتمہ ہوگیا۔

خدا جسے چاہتا ہے حکومت عطا فرماتا ہے اور اسکی رو سے سلطنت کا حکمران خدا کا مقرر کیا ہوا عامل اور نائب خدا ہوتا ہے۔ اسلام کے سیاسی نظم کا منتہائے خیال خلافت ہے اس میں امام اور بادشاہ دونوں کے فرائض داخل ہیں۔ گویا خلیفہ شہنشاہ بھی ہے اور پوپ بھی مذہب اور قانون کے درمیان اور دینیات اور فقہ میں کافی امتیاز نہیں کیا جاتا جو علمائے دین ہیں وہی فقیہ بھی ہیں۔ عیسویت کی بہ نسبت اسلام مذہبی حکومت سے زیادہ موافق ہے۔

دنیائے جدید، سلطنت کے اس مذہبی انداز اور اس سے مشابہت پیدا کرنیوالی تمام چیزوں کے علانیہ خلاف ہے۔ مذہبی امارات کا توڑ دینا۔ اور ۱۸۷۰ء میں پوپ کے دنیاوی اختیارات کا سلب کر لینا اس زمانے کے میلان کے شاہد عادل ہیں۔

مذہبی رنگ کی سلطنتوں کے عام خصوصیات حسب ذیل ہیں:—

۱۔ اُن میں مذہب اور قانون، مذہبی اور سیاسی تنظیمات و اقوال بہت ہی خلط ملط ہو جاتے ہیں اور وہ اسطرح پر کہ مذہبی جزو کو غلبہ حاصل رہتا ہے۔ حیات بعد ممات کا خیال دنیاوی زندگی پر اس قدر طاری ہو جاتا ہے کہ اسکے آزادانہ نشو و نما میں خلل پڑ جاتا ہے۔

۲۔ اصولِ اقتدار، فوق انسانی حد تک بلند ہو جاتا ہے اور از خود اس میں مطلق العنانی پیدا ہو جاتی ہے۔ تمام معاشری و سیاسی زندگی اُسی پر منحصر ہو جاتی ہے۔ حاکم و محکوم کے درمیان انسانی تعلق باقی نہیں رہتا۔ مشترک حب الوطنی، مشترک قومیت اور مشترک نسل کا واسطہ جاتا رہتا ہے۔ حکمران کی وقعت و عظمت کو کوئی پہنچ نہیں سکتا، اور وہ حاکم علی الاطلاق بن جاتا ہے۔

۳۔ جب یہ اقتدار ایسے وحی و الہام پر مبنی ہو جاتا ہے جسکا سلسلہ مدتوں قبل منقطع ہو چکا ہے۔ جیسے یہودیوں میں موسوی احکام اور مسلمانوں میں قرآن شریف، تو اس میں ایک مستحکم مگر ناقابل تغیر نظم قائم ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر اسکے خلاف یہ صورت سمجھی جائے کہ تغیر پذیر حالات اور وقتی ضروریات کیلئے خدا نئے احکام جاری کرتا رہتا ہے تو اُس کے انسانی قائم مقاموں کے لئے اُس خدائی مرضی کے سمجھنے کے صرف دو طریقے ہوتے ہیں یا تو اسکے اظہار کی کوئی معینہ ظاہری علامت ہوتی ہے یا اسکا علم باطنی انکشاف سے ہوتا ہے۔ کلدانیوں نے اول الذکر طریقے پر چل کر ستاروں کی شناخت سے کام لیا۔ یہودیوں نے طلوع آفتاب کی حالت پر

نظر کی۔ رومی کاہنوں اور پیشین گویوں نے قربانی کے جانوروں کی آنتوں اور چڑیوں کے اڑنے سے شگون لئے۔ یونانیوں نے خاص خاص مقامات میں الہامی قوت سمجھکر ان مقامات سے سوال کئے اور جرمانیوں نے پانسوں سے کام لیا۔ اس سے ہمیشہ وہم پرستی اور فریب وہی کا زور رہا۔ دوسری جانب انکشاف پر اعتماد کرنے سے قوائے ذہنی اپنے فعل سے معطل ہو جاتے ہیں، اور متوقع انکشاف پر ایک غیر معمولی اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مذہبی حکومت میں قوائے انسانی جو قانون وحکومت کے معاملات کے فیصلے کے لئے لازمی ہیں، بہت ہی ناکمل طور پر ترقی کرتے ہیں اور کبھی اُن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ دنیاوی حکام قسیسوں کے تابع ہوتے ہیں جو اپنے کو خدا سے زیادہ قریب سمجھتے ہیں۔ اگر وہ خود براہ راست حکومت کرتے ہیں تو سلطنت صاف طور پر مذہبی سلطنت ہے اور اگر کوئی دنیاوی بادشاہ بھی اُنکے ساتھ شریک کار ہوتا ہے تو بھی پس پردہ قوت اُنھیں کو حاصل رہتی ہے اور مذہبی سلطنت کی صرف صورت پوشیدہ ہو جاتی ہے۔

ہر ایک مذہبی گروہ میں عورتوں کی سی کچھ نہ کچھ کمزوری ضرور ہوتی ہے، اس لئے لامحالہ مذہبی سلطنت میں مردانہ قوتیں زنانہ قوتوں کے تابع ہو جاتی ہیں اور خود اعتمادی وآزادی کبھی پوری طرح نشو ونما نہیں حاصل کرتی۔ اہل مذہب کی حکمرانی میں عام لوگوں کو ہمیشہ دقتیں پیش آئیں گی اور وہ پس پشت ڈالدئے جائیں گے۔

۵۔ جرم کے قوانین سخت اور سزائیں ظالمانہ ہوتی ہیں۔ انسانی عدالت کا حکم خدا کے غضب کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے۔ عقل انفرادی کو کام میں لانا ایک فعل شنیع تصور ہوتا ہے۔ اور ادنی سا تعرض بھی اجلالِ خداوندی کی ہتک سمجھا جاتا ہے۔

۶۔ قوم کی تعلیم تمامتر فرقہ مذہبی کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ مدارس مذہبی اغراض کے حاصل کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ علوم وفنون اور تمام مذہبی کمالات کی وہیں تک ہمت افزائی کی جاتی ہے جہاں تک وہ مذہبی اغراض کو پورا کریں اس کے سوا عام طور پر علوم وفنون مشتبہ نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور اُن سے اغماض ہوتا جاتا ہے اور اگر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اُن سے مذہبی

اقتدار پر کوئی اثر پڑے گا تو وہ حکماً ممنوع قرار دیدئے جاتے ہیں اور اُن کے پڑھنے پڑھانیوالوں کو سزائیں دیجاتی ہیں علم و ہنر میں فی نفسہ کوئی خوبی نہیں سمجھی جاتی نہ وہ ذہن انسانی کی آزادانہ تخلیق خیال کئے جاتے ہیں بلکہ وہ محض مذہب کے غاشیہ بردار متصور ہوتے ہیں۔

---

# ساتواں باب

## شاہی کی بڑی بڑی قسمیں

روئے زمین کی مختلف قوموں میں سلطنت کی سب سے زیادہ مسلمہ شکل شاہی ہے۔ یہ شکل تمام براعظموں میں پائی جاتی ہے۔ ایشیا اور یورپ میں تقریباً ہر جگہ یہی شکل ہے اور تاریخ کے شروع ہونے سے اسوقت تک یہی حالت رہی ہے مگر شاہی کا تخیل اور اُسکی صورتیں ایک دوسرے سے اسقدر مغائر ہیں کہ اُنھیں جنسی اصناف میں منضبط کرنا مشکل ہے۔

۱۔ سلطنت نے جب مذہبی طریق حکومت سے گزرکر انسانی بادشاہت کی شکل اختیار کی تو اُس نے خودسری کی شکل اختیار کی۔ یہ شکل ایشیا میں بالتخصیص زیادہ مروج ہوئی۔ خودسر حکومت کا خاص نشان یہ ہے کہ تمام حقوق بادشاہ کی ذات واحد میں اس طرح جمع ہو جائیں کہ اُس سے علٰحدہ یا اُسکے مخالف کوئی حق باقی نہ رہے۔ ممکن ہے کہ وہ خود اپنے اوپر مذہبی یا اخلاقی فرایض کے قیود کو تسلیم کرے یا اپنے کو خدا کا ذمہ دار سمجھے مگر رعایا کے حقوق سے اسکی طاقت پر کسی طرح کا حصر نہ ہو کیونکہ رعایا اسکے آزادانہ رحم و کرم کے بندے اور اسکے تابع ہیں۔

اس قسم کی خودسر حکومت خود کو حق بجانب ثابت کرنیکے لئے کسی حد تک خدا کے اقتدار مطلق کی طرف رجوع کرتی ہے۔ خودسر حکمران کو مذہبی حکومت سے بہت گہرا تعلق ہے اور باوجود حکمران کے انسانی حیثیت کے اُس میں مذہبی حکومت کے نقائص موجود ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کی اسلامی سلطنتوں میں خودسری کی جانب یہ میلان موجود تھا اور صرف اب ہمارے زمانے میں وہ ایک گونہ بقیہ یورپ کی انسانی شاہی کی حد کے قریب پہنچی ہے۔

۲۔ خودسرانہ حکومت کو شاہی کی وحشیانہ شکل کہہ سکتے ہیں۔ آریائی نسل کی قوموں نے اسے ذلیل سمجھکر مدت سے ترک کر دیا اور بادشاہوں اور حکمرانوں سے علٰحدہ طبقات وافراد کے حقوق کو تسلیم کر لیا ہے۔ رعایا اپنے کو غلام نہیں بلکہ آزاد سمجھتی رہی ہے جب کبھی

ایسا ہوا کہ اقتدار شاہی خود سری کی حد کو پہنچتا معلوم ہوا تو رعایا نے اُسے ناانصافی خیال کیا اور پہلا ہی موقع ملنے پر انھوں نے بادشاہ کو اپنے حقوق کی وقعت کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس لئے مہذب شاہی حقوق عامہ کی حفاظت کے لئے ہمیشہ عدالتی انتظام سے مشروط و محدود رہی ہے۔ اس سے بادشاہ کی منزلت و طاقت گھٹنے کے بجائے بڑھ جاتی ہے کیونکہ ایک غلامانہ انبوہ کی حقیرانہ اطاعت کی رہبری کرنیکے بجائے ایک آزاد قوم کی سیاسی قوتوں کی رہنمائی کرنا زیادہ معزز اور شریفانہ کام ہے۔ سلطنت میں جس قدر زیادہ لوگوں کا اتحاد اور زور شامل ہوگا اور جس قدر اسکے ارکان کو آزادانہ ترقی کا موقع حاصل ہوگا، اسی قدر اسکا نظم ونسق کمل ہوگا۔ مگر یہ صرف مہذب شاہی میں ممکن ہے، خود مختار حکومت میں بالکل ناممکن ہے۔

انسان نے اپنی عقل کے مطابق مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں اُن قطعی حدود کے تعین کی کوششیں کی ہیں جو شاہی پر عائد ہونا چاہئے۔

ایک قدیم ترین شکل خاندانی یا پدر سری بادشاہت کی ہے۔ بادشاہ کسی خاص خاندان کا سرگروہ اور تمام نسل کا بزرگ اور باپ سمجھا جاتا ہے یہ قدیم وسادہ انتظام جو ہندوستانی اقوام کے ورثہ پائی ہیں اور جرمانی قبائل کے کوننگ میں پایا جاتا ہے اسکا انضباط خاندانی تعلقات وخیالات سے ہوتا ہے۔

اسی طرح ازمنۂ وسطیٰ کی موروثی امارتیں خواہ وہ جاگیری طریق کی ہوں یا براہ راست حکمرانی کرتی ہوں، شخصی ملک وحفاظت کی تنظیمات سے مقید نہیں۔ خاندانی حقوق اور سلسلہ حکمرانان کے خیالات کا اُن پر اثر پڑتا تھا مگر اُن میں بھی سلطنت کے ساتھ ملک ارضی خلط ملط ہو جاتی ہے اور حکمران کی ملکیت کا حق بھی داخل ہو جاتا ہے۔

یہ دونوں شکلیں جن میں سیاسی ادراک نے ابھی پوری طرح نشو ونما نہیں پایا ہے شاہی کی ناکمل صورتیں کہی جا سکتی ہیں۔

۳- جب کہ سیاسی ادراک میں صرف جزوی بیداری پیدا ہوئی ہو اور اُسکا رجحان حکمران قوت کے صرف ایک فرض کی انجام دہی کی طرف ہو تو اُسے شاہی کی یکطرفہ شکل کہہ سکتے ہیں۔ اس صورت میں جب مقدم خیال فوجی ضرورت کی طرف ہو تو اُسے فوجی ولایت کہیں گے اور جب حاکم انصاف ہی حکمران ہو تو اُسے عدالتی ولایت

کہیں گے۔ اول الذکر زیادہ مطلق العنان اور زور دار ہوتی ہے اور ثانی الذکر نسبتاً زیادہ مفید اور با امن ہوتی ہے۔

۴۔ جب حکمران میں سیاسی اور اک بہت زیادہ ترقی کر جاتا ہے تو مرکزی قوت بغلبۂ تمام اُسکے ہاتھ میں آجاتی ہے اور رعایا کو کسی قسم کے سیاسی حقوق نہیں حاصل ہوتے یہ شاہی علی الاطلاق، وحشیانہ خود سری کے مقابلے میں حکومت کی ایک مہذب شکل ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس شکل میں بادشاہ ایک عدالتی تنظیم کو تسلیم کرتا اور کم از کم اصولاً اُسے موقر سمجھنے پر رضامند ہوتا ہے۔ موجودہ سلطنتوں کی بہ نسبت رومی شہنشاہی میں یہ قوت زیادہ مطلق العنان تھی بلکہ ازمنۂ وسطیٰ تک میں آزادی کی نشوونما اور عیسائیت سے اس مطلق العنانی میں روک پیدا ہوگئی تھی۔

۵۔ محدود شاہی زیادہ معزز ہونیکے ساتھ ہی زیادہ متناسب بھی ہوتی ہے۔ اس میں مرکزی قوت کی وحدت و فوقیت قائم رہتی ہے اور اُسکے ساتھ ہی قوم کے تمام طبقات و افراد کی آزادی بھی شامل ہوجاتی ہے۔ اس قسم کی شاہی جسطرح زمانہ حال میں نیابتی اور آئینی صورتوں سے محدود ہے اُسی طرح ازمنۂ وسطیٰ میں امرا اور طبقات رعایا کے حقوق خاص سے مقید تھی۔

۶۔ شاہی کی بحث میں یہ ضروری ہے کہ بادشاہی اور شہنشاہی میں فرق کیا جائے یہ فرق ترقی کے تمام مدارج میں پایا جاتا ہے۔ خواہ ایشیا کی وحشیانہ خود سر حکومت ہو یا یورپ کی مہذب سلطنت۔

بادشاہی کے خیال کا تعلق قوم سے ہے۔ شہنشاہی کا تعلق انسان سے ہے بادشاہی نام ہے، ایک واحد قومی سلطنت کی تنظیم اعلیٰ کا۔ برخلاف اسکے شہنشاہی دنیا کی حکمرانی ہے۔ جس طرح نوع انسان کو مجموعاً منفرد اقوام پر فوقیت حاصل ہے، اسی طرح شہنشاہ کا درجہ بادشاہوں سے بلند ہے۔ مشرقی شہنشاہوں کے حکمران ہمیشہ بادشاہوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ قیصر جولیس نے یہ خیال پیدا کیا کہ روما کی عالمگیر سلطنت قائم ہو اور تاریخ نے سلطنت کے اس اعلیٰ خیال کو اسی کی جانب منسوب کر کے اُسکا نام "قیصریت" رکھ دیا، لیکن اس خیال کی پوری تعبیر اُس وقت تک نہیں ہوسکتی، جب تک کہ دنیا اس درجے تک ترقی نہ کر جائے کہ تمام بنی نوع انسان کا ایک عالمگیر نظم قائم ہوجائے جب تک یہ نہو،

اُس وقت تک شہنشاہی کے دوبارہ قائم کرنیکی تمام کوششیں مثل سابق کے جزوی اور ناکمل ہوں گی [1]

---

[1] "قیصریت" کے تخیل و تاریخ کے متعلق "جرمانی قاموس سیاسیات" (Deutsches staatswoerterbuch) میں اُسکے متعلق مضمون کو دیکھنا چاہئے۔

# آٹھواں باب

## (الف) یونانیوں اور جرمانیوں میں خاندانِ بادشاہی

یونان اور جرمانیا کی ابتدائی زمانے کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان دونوں قوموں کے قبیلوں اور سلطنتوں کی باگ بادشاہوں کے ہاتھ میں تھی اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان قوموں میں سلطنت کا تخیل کیا تھا اور وہ اسے کسطرح چلاتی تھیں اور یہ کہ ان دونوں قوموں کے تخیل اور عمل میں کیسی تعجب خیز یکسانیت تھی۔ برخلاف اسکے قدیم رومیوں میں (جو زمانے کے اعتبار سے ان دونوں قوموں کے درمیان ہیں) بادشاہی کا خیال اپنی اہم خصوصیات میں ان دونوں سے مغائر ہے۔

یونانیوں اور جرمانیوں کی باشاہی سلطنت کی ایک ایسی شکل تھی جو مشرق کے شخص واحد کی مذہبی حکومت کی صورت سے منقلب ہو کر انسانی اور سیاسی تنظیم کی شکل میں آگئی تھی۔ اسکے بادشاہ اپنے نسب کا سلسلہ عموماً دیوتاؤں سے ملاتے تھے، یونانی زیادہ تر زیےاُس سے اور جرمانی ووڈن (یا اوڈن) سے، اور عوام بھی اس عقیدے کو مانتے تھے؛ مگر باوجود اس خدائی رشتہ داری کے بادشاہ خود انسان تصور کئے جاتے تھے اور انسانی پابندیوں کے بھی تابع تھے۔

اس لئے بادشاہ کی جس قدر عزت کیجاتی تھی وہ اسکے اختیارات سے بہت بڑھی ہوئی تھی۔ وہ دیوتاؤں کے سامنے قوم کا قائم مقام ہوتا تھا اور قربانی اور عبادت کی انجام وہی جب کسی خاص فرقہ کے پروہت سے متعلق نہیں ہوتی تھی تو قوم اور دیوتاؤں کے درمیانی ہونیکی حیثیت سے ان کاموں کو بھی بادشاہ ہی انجام دیتا تھا[1]

---

[1] ارسطو، "سیاسیات"، اسکینڈینوی ممالک میں یہ خصوصیات جسقدر نمایاں ہیں اسقدر کسی جرمانی سلطنت کی معلومہ تاریخ میں نظر نہیں آتے ہاکون (شاہ ناروے) اگرچہ عیسائیت کی جانب مائل تھا مگر ہنوز کافر کاشتکاروں کی وجہ سے مجبور ہو کر اُسے قدیمی طرز پر تھنگ میں قربانی کرنا، جام مقدس میں شراب پینا اور گھوڑے کا گوشت کھانا پڑتا تھا۔

چنانچہ ایتھنز میں جب شاہی کا خاتمہ ہوگیا۔ تب بھی وہ ارخون (عہدہ دار) جسکے سپرد قربانی (یا نذر نیاز) کا کام تھا، بادشاہی کے لقب سے موسوم تھا۔

بادشاہوں کی مالی قدر و قیمت دوسرے ارکان ملت کے بہ نسبت بہت زیادہ سمجھی جاتی تھی۔ جبرمانیا میں بادشاہ کی دیت بالعموم امرا کی دیت سے چند در چند زیادہ ہوتی تھی۔ دولت کے اعتبار سے بھی وہ اپنی رعایا سے بہت بڑھے ہوئے ہوتے تھے۔ زمین کا بہت بڑا حصہ ان کی ملک میں ہوتا تھا اور مفتوحہ علاقے میں انھیں سب سے بڑا حصہ ملتا تھا۔ اُنکی قیام گاہ یا محل اور مکانوں کے مقابلے میں زیادہ بلند، زیادہ وسیع زیادہ خوبصورت اور زیادہ آراستہ و پیراستہ ہوتے تھے۔ اُنکے خزانے جواہرات اور زیورات سے مالا مال ہوتے تھے۔ اُنکے شاہی منصب کیلئے خارجی علامات بھی ہوتے تھے۔ مثلاً یونانیوں کے ہاں عصائے شاہی اور جرمانیوں کے ہاں جریب شاہی، انکے بیٹھنے کیلئے ایک بلند تخت ہوتا تھا۔ جرمانی بادشاہوں کے آگے آگے جھنڈا بھی ہوتا تھا جس سے اُنکی جنگی طاقت کا اظہار مقصود تھا۔ یونانیوں کے ہاں بادشاہ کے برآمد ہونیکے وقت نقیب اعلان کرتے اور لوگوں کو خاموشی کا اشارہ کرتے تھے۔ فرانکی بادشاہ زیبائش کے طور پر کاکلیں رکھتے تھے۔ بادشاہ کا لباس ہمیشہ شاندار اور چمکدار ہوتا تھا۔ ہندوستان اور چین کے قدیم بادشاہ ہمیشہ لمبی زرتار قبائیں پہنکر نکلتے تھے اور ایک زرد رنگ کا چھتر اُنکے ساتھ ہوتا تھا۔

شاہی خاندانوں کی موجودگی اور اُنکے دیوتاؤں کے نسل سے ہونیکے خیال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قدیم زمانے کی شاہی موروثی تھی، تاہم جانشینی کا کوئی معین قاعدہ نہیں تھا۔ یونانیوں میں شخصی ہمت و قابلیت کا لحاظ کیا جاتا تھا۔ عورتیں اور بچے اس سلسلے سے تقریباً ہمیشہ خارج کر دئے جاتے تھے اور چونکہ امرا اور عوام کی منظوری کی شرط تھی اس لئے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ موروثی سلسلہ ترک کر دیا جاتا تھا۔ [۵]

---

[۵] یہاں ہم کو اڈیپڈلیس کا قصہ یاد آتا ہے۔ ہندوستانیوں میں بھی ہم (بہ سلسلۂ خلف اکبر) حکمران کے اس قسم کے موروثی حق کو رائے اور انتخاب کے ساتھ ممزوج دیکھتے ہیں۔ دیکھو فون ہولٹس من کی "ہندوستانی کہانیاں" (Indische sagen) جلد ۲ - صفحہ ۱۸۴ -

جرمانیوں میں یہ طریقہ رائج تھا کہ امرا انتخاب کرتے اور عوام اُس پر منظوری دیتے تھے مگر جانشینی بالعموم موروثی ہوتی تھی اور یونان کے بہ نسبت وہاں بچے زیادہ کثرت سے وارث تاج و تخت ہو جاتے تھے لیکن کوئی ایسا قاعدہ نہیں تھا کہ اگر ایک آزاد قوم شاہی خاندان کے کسی بعید ہی رکن کو حکمرانی کے زیادہ قابل سمجھ کر اُسے ترجیح دینا چاہے تو ایسا نہ کر سکے۔

ان بادشاہوں کی سیاسی طاقت بہت زیادہ تھی مگر اُس پر چند اہم قیود بھی عائد تھے۔

ا۔ بادشاہ، مجلس حکمراناں اور جمعیت قومی دونوں کا صدر ہوتا تھا اور دونوں کی کارروائی کی رہبری کرتا، لیکن بقول ٹاسی ٹس ان دونوں مجموعوں میں اُسکے اقتدار کا انحصار ترہیب سے زیادہ ترغیب پر ہوتا۔

۲۔ وہ انصاف کا حاکم اعلیٰ ہوتا تھا اور اگرچہ وہ خود فیصلہ نہیں کرتا تھا مگر وہ قانون کے قیام و دوام کی حمایت کرتا تھا۔ اُسکا اختیار بھی بالکل خود مختارانہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ عدالت کے فیصلے کے ماننے پر مجبور ہوتا تھا۔

۳۔ وہ فوجی تنظیم کا صدر ہوتا تھا اور بالعموم فوج کا پیشرو بھی وہی ہوا کرتا تھا۔ جنگ ہی سے اُسکی طاقت میں اضافہ ہوتا تھا لیکن چونکہ یونانیوں کی بہ نسبت جرمانی موروثی حق کا زیادہ خیال کرتے تھے اس لئے اگرچہ نابالغی کے زمانے میں فوج کا قائدِ اعظم بادشاہ ہی سمجھا جاتا تھا مگر اکثر بوجہ مجبوری عملی کام کیلئے کسی متولی کا تقرر ہو جاتا تھا۔

۴۔ یونانیوں اور جرمانیوں میں اگرچہ حکومت کے تخم بادشاہ کے مذکورۂ بالا اوصاف میں مضمر تھے مگر حقیقی حکومت کو اُن میں بہت کم ترقی ہوئی تھی۔

۵۔ دونوں قوموں (نسلوں) میں بادشاہ کا وجود اور اُسکے حقوق دیوتاؤں اور انسانوں کے حقوق سے گھرے ہوئے تھے۔ یونانی خصوصیت کے ساتھ اس امر پر زور دیتے تھے کہ اُنکے بادشاہ خدائی احکام اور قومی قوانین و مراسم کی پابندی کریں اور اُسی کو ایشیا کے مطلق العنان بادشاہوں کے مقابلے میں اپنے بادشاہوں کا مابہ الامتیاز وصف سمجھتے تھے۔ بادشاہ عدالتی نظم کے اندر ہوتا تھا۔ اُس سے بالاتر نہیں تھا۔ وہ عموم کا صدر ضرور تھا مگر قوم سے خارج نہیں تھا۔ جرمانی بادشاہ سارے گروہِ احرار کے حقوق سے

اور بھی زیادہ گہرے ہوئے تھے۔

لیکن جرمانی بادشاہی کی ایک خصوصیت خاص تھی جس سے اُسکی قوت بہت بڑھ گئی تھی۔ جرمانی بادشاہوں کے جلو میں ایک گروہ ایسے چیدہ و ممتاز اشخاص کا ہوتا تھا جو بادشاہ کی ذات سے وابستہ ہوتا تھا۔ یہ لوگ بادشاہ کی ذات کے ساتھ وفاداری کی قسم کھاتے تھے، اور انکا مستقل کام یہ ہوتا تھا کہ ہر ایک مخالف کے مقابلے میں بادشاہ کی عزت و طاقت کی حمایت کریں۔ بعد کو ازمنۂ وسطیٰ میں جو جاگیرداری تنظیم پیدا ہوئی اُس کا تخم یہی ہے اور اس جاگیرداری تنظیم نے قدیم نظام سلطنت کو اکثر توڑ دیا اور اس میں بہت کچھ دست اندازی کی اور ایک بڑی حد تک اُسے بدل دیا۔

---

# نواں باب

## (ب) قدیم روما کی قومی شاہی

بعض خصوصیات میں قدیم روما کی بادشاہی کو یونانیوں اور جرمانیوں کی بادشاہی سے بہت قریبی تعلق معلوم ہوتا ہے لیکن اور حالات کے اعتبار سے اُن میں اس قدر اہم تفاوت ہے کہ ہم اُسے بادشاہی کی ایک نئی اور زیادہ ترقی یافتہ صورت خیال کرنے پر مجبور ہیں۔ خود بادشاہوں کے تقرر میں دو خصوصیات اخلاقی طور پر قابل لحاظ ہیں ایک یہ کہ نامزدگی اور تقرر کے مقابلے میں موروثی جانشینی کم نمایاں نظر آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ عام اعتقاد میں بادشاہ دیوتاؤں کی نسل سے نہیں سمجھے جاتے۔

یہ صحیح ہے کہ روما کے بانیوں کی نسبت یہ اعتقاد تھا کہ انکی رگوں میں دیوتاؤں کا خون دوڑ رہا ہے اور روموکس مرنے کے بعد دیوتاؤں میں شامل کر دیا گیا تھا لیکن اسکے بعد سے بادشاہوں کے انتخاب اور تمام دوسرے معاملات میں دیوتاؤں کا اثر شگون کے آثار، روح کی غیر مرئی تحریک اور قسمت کی اٹل قوت سے ظاہر ہوتا تھا۔ پس اگرچہ خدائی اثر کا خیال قائم رہا، مگر روما کی بادشاہی خالص انسانی بادشاہی تھی، شخصی دوربینی اور مرضی کا خیال نسل و خاندان سے زیادہ کیا جاتا تھا[1]

روما کے بادشاہ کا انتخاب یا تو اُسکا پیشرو کر جاتا تھا یا سینیٹ کی مدد اور خداؤں کی پسندیدگی سے متولی سلطنت اُسکا انتخاب کرتا تھا۔ یہ انتخاب صرف اُسکی زندگی بھر کیلئے ہوتا تھا اسلئے کوئی موروثی سلسلہ نہیں قائم ہوا اور انکا انحصار نسل کی بہ نسبت افراد کی ذاتی قابلیت پر زیادہ رہا۔ بادشاہ خود اپنا "قانون شاہی" تجویز کرتا تھا جسکے موافق اُسے شاہی اختیار اور شگون کی برکتیں دی جاتی تھیں[2]

---

[1] یہی حال رومیوں میں وراثت کا تھا۔ وراثت کا انحصار خاندانی تعلق پر اُسقدر نہیں ہوتا تھا جسقدر وصیت کرنیوالے کی شخصی مرضی پر تھا کیونکہ ہر شخص اپنا وارث مقرر کرنیکے معاملے میں آزاد تھا۔

[2] یہ وہی قانون شاہی (lex regia) ہے جسکی تجدید شہنشاہی کے زمانے میں ہوئی۔

یہ بالکل وہی صورت تھی جس طرح مابعد کی جمہوریت میں حکام (ناظموں) کو اختیار اعلیٰ (imperium) عطا ہوتا تھا۔ پس اس طرح رومی بادشاہی اول ہی سے ایک طرح کی شخصی نظامت تھی۔

شاہی کا یہ تصور صاف طور پر یونانیوں اور جرمانیوں کے خیال سے بالکل مغائر ہے علیٰ ہذا اختیار شاہی کی کیفیت میں بھی اہم تفاوت نظر آتا ہے۔ بعض امور میں دونوں میں مماثلت ہے۔ بادشاہ ہی وہ مذہبی مقتدیٰ ہوتا تھا جو قوم کی طرف سے نذریں چڑھاتا تھا وہی سینیات اور مجلس عام کو طلب کرتا اور اُنکی رہبری کرتا وہی انصاف کا حاکم اعلیٰ ہوتا تھا، البتہ بعض صورتوں میں اسکے حکم کے خلاف قوم سے مرافعہ کیا جا سکتا تھا، وہ فوجی قیادت کا حقدار اور فوج کا سپہ سالار ہوتا تھا۔ اراضی وآمدنی کے اعتبار سے وہ دولتمند ہوتا تھا۔

لیکن اسکے اختیارات یونانی بادشاہوں کی بہ نسبت زیادہ زور دار اور زیادہ مکمل ہوتے تھے اگرچہ یونانی بادشاہ موروثی بادشاہ اور دیوتاؤں کی اولاد ہوتے تھے؛ تاہم رومی اپنے حاکموں کو اس غرض سے کہ وہ بہبود عامہ کی حفاظت میں پر زور کارروائی کر سکیں جس قدر وسیع انتظامی اختیارات عطا کرتے تھے اُس سے اُنکی سیاسی معاملہ فہمی اول ہی سے نمایاں نظر آتی ہے اختیار اعلیٰ (imperium) کے طریقے کی ابتدا خالصتا رومیوں سے ہوئی اور اُنکی بادشاہی اور سابق کی بادشاہیوں میں یہی امر مابہ الامتیاز ہے۔

رومی بادشاہوں کی خارجی علامات بھی ویسی ہی اثر افگن تھیں جیسی یونانی یا جرمانی بادشاہوں کی علامات تھیں، مگر انکی وسعت اختیار سے بھی اُن علامات کا اظہار ہوتا تھا۔ بارہ عصابرداروں کا کوڑے لئے ہوئے اُنکے آگے آگے چلنا محض علامات کے طور پر نہیں تھا بلکہ یہ فی الحقیقت نافرمانی کرنیوالوں کی تادیب کیلئے تھا۔ اختیار اعلیٰ اور عصابرداروں کے کوڑے عملاً وخیالاً رومیوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

اختیار اعلیٰ جو شگونوں کے ساتھ بادشاہ کی جانب منتقل کر دیا جاتا تھا، اُس سے بادشاہ کو فرمان نافذ کرنے اور قانون کے اُصول معین کرنے دونوں امور کا حق حاصل ہو جاتا تھا۔ اسے ہرگز بھولنا نہ چاہئے کہ روما کی سلطنت ایک بادشاہ نے قائم کی تھی اور روایتاً اُسی کے اختیارات اسکے جانشینوں کی طرف منتقل ہوتے رہتے تھے۔

مستقل قوانین کے لئے سینیٹ کی منظوری کی ضرورت تھی۔ اور سروئیس ٹولیس کے وقت سے عوام کی رضامندی کا حاصل کرنا بھی ضروری ہوگیا تھا، مگر اُسکے ساتھ ہی بادشاہ کی مرضی بھی لازمی اور بالعموم قطعی ہوا کرتی تھی۔ صرف بادشاہ ہی قانون تجویز کرسکتا تھا اور جس قانون کے متعلق وہ چاہتا بحث کرنے اور رائے دینے کی ممانعت کرسکتا تھا۔ ان قوانین کے علاوہ بادشاہ اپنے فرمان میں بغیر کسی شورے یا منظوری کے اُن قانونی اصولوں کو معین کرسکتا تھا جن کی وہ متابعت کرنا چاہتا تھا۔ یہ فرمانی قوانین (Jus edicendi) بلابحث وحجت بادشاہوں کے حقوق میں داخل تھے۔ اگرچہ اُن پر عملدرآمد کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی۔ یہ قاعدہ اول اول زمانہ مابعد کے حاکموں کے لئے وضع نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان کے پیشروں سے دست بدست اُن تک پہنچا تھا۔

عدالتی اختیار

پس رومی بادشاہوں کا عدالتی اختیار جرمانی بادشاہوں کے اختیار سے بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔ دونوں اولاً بذات خاص عدالتوں کی صدارت کرتے تھے مگر بادشاہ اپنے اسیسروں کی رائے کا پابند نہیں تھا وہ نہ صرف مقدمہ کی کارروائی کی ہدایت کرتا تھا بلکہ وہ خاص اصول معین کرتا تھا جسکے مطابق کسی مخصوص مقدمے میں کارروائی ہونا چاہئے۔ ابتدائی زمانے میں وہ اکثر خود فیصلہ سناتا تھا۔ معاملات وجرائم کے قوانین کے تقریباً تمام انتظام کا دار و مدار اُسی پر ہوتا تھا۔

فوجی اختیار

رومی بادشاہوں کا فوجی اختیار بہت وسیع تھا۔ میدان جنگ میں بادشاہ کو افسروں اور سپاہیوں دونوں کی زندگی وموت کا کامل اختیار ہوتا تھا۔ ہم جمہوری زمانہ تک میں یہ دیکھتے ہیں کہ نہ صرف آمر مطلق، جنگی طاقتیں بادشاہوں کے برابر ہوتی تھیں بلکہ قنصل بھی فوج کی التجا کے باوجود افسروں کو موت کی سزا دیتے تھے بلکہ پورے پورے فوجی دستے میں ہر دسویں آدمی کو قتل کردیتے تھے۔

عہدہ دار

بادشاہ تمام سیاسی اور مذہبی عہدوں کا سرچشمہ ہوتا تھا (tribunus celerum) وہی یعنی امیرالامرا، والئی شہر یعنی نائب السلطنت (praefectus urbi) کا تقرر کرتا تھا جو اُسکی عدم موجودگی میں شہر کا حکمران ہوتا تھا، اسی سے فال گو اور پیشوایان مذہبی اپنے ادائے فرائض کا اختیار اور اپنے مقدس قانون کا علم حاصل کرتے تھے۔

رومی بادشاہ کی اہم حیثیت

اختیار اعلیٰ (imperium) کا لبّ لباب یہ تھا کہ وہ ایک زبردست انتظامی قوت تھی،

جو سیاسی ضروریات اور ہنگامی حالات کے محل و موقع کے لحاظ سے حتمی وقطعی کارروائی کرسکتی اور بہبود عامہ کی کارروائیوں کو بزور رائج کرسکتی تھی۔ یونان کے بادشاہ اس قسم کے اختیار کا استعمال صرف ایک خفیف حد تک کرسکتے تھے اور جرمانی بادشاہوں میں تو اسکا مذکور تک نہیں تھا مگر رومی سلطنت میں اس اختیار نے اول ہی سے نہایت اہم حیثیت پیدا کرلی تھی۔ اہل روما جسطرح اپنے خاندان اور اپنی جائداد پر کامل حکمرانی چاہتے تھے اسیطرح وہ سیاسی اختیار اعلیٰ (imperium) کو بھی کامل و اکمل دیکھنا چاہتے تھے۔ انکے بادشاہ حالت امن میں صرف حاکم انصاف ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ مملکت کے حکمران یا والی بھی ہوتے تھے۔ "رکس" اور "ریگیرے" کے لفظوں ہی سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے۔

اسطرح یہ بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے کہ دور شاہی میں سلطنت روما کی تمام طرز عمل شاہی مرضی کے تابع تھی۔ تمام تنظیمات کا تعلق بادشاہ سے تھا اور ان میں ایسے ایسے کاموں کے شروع کرنے اور انھیں تکمیل کو پہنچانے کا اختیار تھا، جو اس زمانے میں بھی بہت عظیم الشان معلوم ہوتے ہیں۔ بادشاہ کو غذا کی فراہمی اور کاشت اراضی پر نظر رکھنا پڑتی تھی اہل شہر کے اخلاق کی نگرانی کرنا پڑتی تھی اور بہت وسیع احتسابی اختیارات کو عمل میں لانا ہوتا تھا، وہ تمام فرائض جو بعد میں قنصل، نائب قنصل، محتسب اور میر تعمیرات کے درمیان تقسیم ہوگئے تھے ابتداً صرف ایک بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ تاریخ میں روما ہی وہ پہلی سلطنت ہے، جس نے انسانی اور قومی شاہی کا شیوع کیا اور اُس شاہی میں کامل سیاسی اقتدار اور تقریباً علی الاطلاق انتظامی اختیار جمع کردیا۔

---

# دسواں باب

## (ج) رومی شہنشاہی

شہنشاہی طرف جمہوری عہدے کے مجموعے کا نام نہیں تھا

وہ رومی شہنشاہی جسکی بنا قیصر جولیس نے ڈالی، جسے آگسٹس نے استوار کیا اور جس نے بعد کے تمام سیاسی نشو و نما پر اس قدر قوی اثر ڈالا۔ وہ شہنشاہی (جیساکہ بعض وقت خیال کیا جاتا ہے) محض جمہوری حکمرانوں کے اختیارات کو یکجا جمع کر لینے سے نہیں پیدا ہو گئی تھی بلکہ وہ درحقیقت زیادہ وسیع پیمانے پر قدیم شاہی اختیارات کی تجدید تھی جس میں درمیانی زمانے کے تغیرات مدنظر رکھے گئے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ شہنشاہوں نے بہت سے وہ فرائض اختیار کر لئے تھے، جو جمہوریت کے حاکموں سے متعلق تھے مثلاً صدارتی (تریبیونی) اقتدار کی بنا پر اُنکی ذات ہر طرح کے الزام سے بری تھی۔ اُنھیں قوانین کی نامنظوری کا حق حاصل تھا اور وہ ادنی الطبقوں کے حامی کی حیثیت اختیار کر سکتے تھے۔ احتسابی اختیار(ب) کی رو سے اُنھیں اخلاقیات کی نگرانی کا حق حاصل تھا اور وہ سینات کے ارکان اور امرا (یعنی جاگیرداروں) کی فہرست پر نظرثانی کر سکتے تھے، مقتدائے اعظم (pontifex maximus) کے رتبے کے باعث وہ مذہبی قانون کے اہم مسائل کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ وقتاً فوقتاً وہ قنصل کے عہدے کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، مگر شہنشاہوں کے اختیار کا خیال ان عہدوں کے اجتماع پر مبنی نہیں ہے، بلکہ ایک نئی مرکزی حکومت یعنی ایک حقیقی شاہی کے قائم ہو جانے پر

---

(ب) (آگسٹس کو احتساب کا اختیار اپنے قنصل ہونیکی حیثیت سے حاصل تھا گر احتساب کا منصب ایک علٰحدہ عہدے کی حیثیت سے بدستور قائم رہا اور بعد کے شہنشاہوں نے بھی اُس منصب کو اختیار کیا جن میں کلاڈیس ویٹلیس ویسپاسیان اور ٹیٹس داخل ہیں۔ ڈومیٹیان نے اُسے منسوخ کر دیا اور اُسکے فرائض کو شہنشاہ کے نامحدود اختیارات میں شامل کر دیا گیا۔ دیکھو موتزین کی تصنیف: "رومی قانونِ سلطنت" جلد ۲، صفحہ ۳ نقرہ ۶ - انگریزی مترجم)

مبنی ہے ۔ ظاہرا جمہوری حیثیت کے باعث یہ تغیر ایک زمانے تک پوشیدہ رہا مگر ارباب فہم و ذکا کو آگسٹس ہی کے زمانے میں یہ تغیر صاف نظر آنے لگا تھا ٹیبریس کی تخت نشینی کے وقت اسینیس گالس نے شاہی کے اصول کو صاف طور پر اپنے اس دعوے میں ظاہر کر دیا کہ "ناقابل تقسیم شئے کو تقسیم کرنا غیر ممکن ہے ۔ سلطنت ایک جسم واحد ہے اور صرف ایک ہی شخص کا دماغ اس پر حکمرانی کر سکتا ہے "۔

شہنشاہی کیلئے انتخاب

شہنشاہوں نے صرف پرنسپ ( princeps senatus ) کا منکسرانہ لقب اختیار کیا تھا مگر اُنکے اختیارات اس قدر وسیع تھے کہ اُنکے بیجا استعمال کی طمع سے بہت کم شہنشاہ اپنے کو محفوظ رکھ سکتے تھے اور اکثر اُن میں سے ذہنی یا اخلاقی حیثیت سے تباہ ہو گئے ۔ شہنشاہی موروثی نہیں بلکہ انتخابی تھی ۔ اول اول جو لوگ اس منصب پر فائز ہوئے اُنکا انتخاب دس برس کیلئے ہوتا تھا مگر حقیقتاً اُسے زندگی بھر کیلئے سمجھنا چاہئے ۔ وہ خدائی نسل سے نہیں سمجھے جاتے تھے اور وہ قوم کی فوقیت کو تسلیم کرتے تھے ۔ اُن کے اختیارات انھیں قوم کے ایک قانون کے موافق عطا ہوتے تھے لیکن اگرچہ شہنشاہ کے انتخاب میں نسل اور خاندانی تعلق کا لحاظ اصولاً نہیں کیا جاتا تھا مگر عام طور پر عملاً اسکا بہت بڑا اثر پڑتا تھا اور منتخب شدہ بادشاہ کو اپنی ذات سے وہ تمام وسیع اختیارات حاصل ہو جاتے تھے جو جمہوریت کے زمانہ میں تمام رُومی قوم کو حاصل تھے ۔ یہ اختیار جب ایک بار عطا ہو جاتا تھا تو پھر نہ اُس میں کمی ہو سکتی تھی اور نہ وہ واپس لیا جا سکتا تھا ۔

شہنشاہی اختیارات

علاوہ اُن خاص ناظمانہ اختیارات کے جو بالعموم شہنشاہ کو حاصل ہوتے تھے شہنشاہی اختیارات کا تجزیہ حسب ذیل طریقہ پر ہو سکتا ہے :-

۱ ۔ سلطنت کی تمام فوجی طاقت اور شہر کی حفاظت کرنیوالی سپاہ کا نظم و نسق اور اعلیٰ اختیار ۔ حدود سلطنت کی وسعت کے باعث مستقل فوج کا قیام بھی ضروری ہو گیا اس سے شہنشاہی کی بقا کی طرف سے اطمینان ہو گیا اور بزور اطاعت حاصل ہونے لگی ۔ اپنے اس فرض کی وجہ سے شہنشاہوں کا لقب امپراتور ( imperatores ) ہو گیا جس کے معنی اُس ابتدائی زمانے میں اس سے بہت مختلف تھے جو اب سمجھے جاتے ہیں ۔

۲ ۔ نہایت ہی زرخیز اور اہم صوبوں کی حکومت علی الاطلاق جن سے شہنشاہوں کو بے اندازہ دولت و قوت حاصل ہوتی یہ حیثیت مجموعی نظام سلطنت کے اس تغیر سے صوبے

بہت فائدے میں رہے۔ ان صوبوں کے ذی رتبہ اشخاص کو شہنشاہ، شہنشاہیت میں داخل کر لیتے اور اُن کو اعلیٰ منصبوں پر فائز کرتے تھے۔ معہذا شہنشاہی عمال کی جبر و زیادتی اور استحصال، جمہوریت کے ہمیشہ بدلنے والے حکام اور سپہ سالاروں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ شہنشاہوں کے زیادہ مستقل اغراض کے ساتھ نظم و نسق میں نسبتاً زیادہ رحمدلی اور انتظام سے کام لیا جانے لگا۔

۳۔ تمام غیر ملکی معاملات کا فیصلہ، صلح و جنگ اور معاہدہ کرنیکا حق۔

۴۔ مجلس سنیات کے جمع کرنے، بحث طلب امور کے تجویز کرنے اور مجلس کے فیصلوں کو قانونی قوت عطا کرنیکا حق۔ یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ سنیات ان شہنشاہوں کی کسقدر خوشامد کرتی اور انکی کس درجہ مطیع تھی۔

۵۔ نظامت اور تمام اہم عہدوں کے تقررات کا آخری فیصلہ، مجلس عام (comitia) جو کچھ مدت تک بہ حسب ظاہر قائم رہی اور مجلس سنیات، دونوں از روئے قانون امید واروں کی بابت شہنشاہ کی سفارش کا لحاظ کرنے پر مجبور تھیں۔

۶۔ سلطنت کی بہبود و عزت کیلئے ہر ایک کارروائی کا قطعی اختیار۔ درحقیقت یہی اختیار شہنشاہی قوت کی اصلی بنا تھا۔ اس اختیار کی بدولت نہ صرف اُسکے فرمان بلکہ فیصلے اور اسکی قانونی ہدایت تک کو قانون کی پوری قوت حاصل ہو جاتی تھی اور اس طرح وہ قانون سازی کی تمام وسعت پر حاوی تھا۔

مخالفانہ اعتراض و مقاومت کے روکنے کے لئے صاف طور پر یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ شہنشاہ کا قانون تمام دوسرے قوانین پر فائق ہے، خواہ وہ سنیات کا قانون ہو خواہ خواص کا ہو، خواہ عوام کا۔ نیز یہ کہ شہنشاہی قانون کی بجا آوری میں ان آخر الذکر قوانین کے توڑنے پر کوئی شخص جوابدہ نہیں ہو سکتا۔ شہنشاہ کی عدم ذمہ داری صرف اُسکی ذات تک محدود نہیں تھی بلکہ اُسکے تمام وزرا و عمال تک وسیع تھی یہ طریقہ موجودہ زمانے کے بالکل مغائر تھا۔

درحقیقت شہنشاہ کا اختیار بالکل مطلق العنان اور غیر محدود تھا۔ سلطنت میں اُسے وہی حیثیت حاصل تھی جو خانگی زندگی میں ملک ذاتی کی اور جو ایک خاندان میں اقتدار پدری (patria potesta) کی ہے، گویا روما کی عالمگیر سلطنت ایک فرد واحد کے ہاتھ میں مجتمع ہو گئی تھی۔ اسکا تخیل اصول بہبود عامہ تھا مگر یہ اصول خیال سے نکلکر عمل میں بہت کم آتا تھا

رومیوں کا یہ عظیم سیاسی اصول (کم از کم ازمنہ مابعد میں) سلطنت کے تمام معاملات میں شخصی حق سے زیادہ اہم ہوگیا تھا اگرچہ شخصی قانون کے حدود میں آخر الذکر کو بہت ترقی ہوگئی تھی۔

شہنشاہی روما کی تاریخ اگرچہ جزاً جزاً نہایت عظیم الشان معلوم ہوتی ہے مگر دنیا کو وہ یہ سبق دے گئی ہے کہ ایسا نامتناہی اختیار نہ حکمران کیلئے مفید ہے اور نہ اسکی رعایا کے لئے۔

شہنشاہی کے اسباب

شہنشاہی کے عروج کی تعبیر یہ کیجاسکتی ہے کہ عام خرابی اور کمزوری کی وجہ سے اُسکا قیام ایک ناگوار ضرورت تھی۔ روما کے امرا میں وسیع سلطنت کے کام کو سرانجام دینے کی اہلیت و قابلیت نہیں رہی تھی۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے سابقہ اختیار و اثر کے حاصل کرنیکی کوششیں کیں مگر بالعموم حالات زمانہ کے سامنے انھیں خاموشی کے ساتھ سر جھکا دینا پڑا۔[۱] عوام کو حکومت کا کوئی دعوی نہیں رہا تھا۔ سپہگری کے بھی اب وہ دعوے نہیں رہے تھے بلکہ لوگ پرامن زمانے کے کاروبار اور خوشیوں میں غرق تھے۔ انھوں نے سنیات کی حکومت کے بجائے ایک شہنشاہ کی حکومت کو ترجیح دی اور امرا کی ذلت سے اپنی کمزوری کی تسلی کرلی۔ رومی قوم کا اخلاق اُسکے قابلیت کے بہ نسبت جلدتر خراب ہوگیا اور خود اُن کی غلامی اُس نہ سیر ہونیوالی حرص کا عوض تھی جو انھیں فتوحات کے پیچھے لئے پھرتی تھی۔

---

[۱] کلاؤڈیس کی تخت نشینی کے وقت جو واقعات پیش آئے اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ روما کے ادنی طبقوں کو جمہوری نظام سلطنت سے زیادہ الفت نہیں رہی تھی۔

# گیارھواں باب

## (د) فرانکی شاہی

سلسلۂ شارلمین کی شاہی

جرمانیوں کے فرانکی قبیلے نے رومی سرزمین پر ایک بہت بڑی شہنشاہی قائم کرلی۔ انکی شاہی میں رومی اور ابتدائی دونوں عناصر شامل تھے اور اسی وقت سے قدیم دنیا کی تنظیم وترتیب از منۂ وسطیٰ کی تنظیم وترتیب کی طرف مبدل ہونا شروع ہوئی۔ فرانکی بادشاہ اپنے جرمانی پیشروں کے بہ نسبت بہت زیادہ صاحب اختیار تھا مگر رومی شہنشاہوں کے مقابلے میں اسکا اختیار مطلق کم تھا۔ کارل (چارلس) اعظم کے وقت میں جو شاہی قائم تھی اس میں جرمانیوں کی آزادی اور اُنکے قانون کے خیال کے ساتھ سلطنت کے قوت وغلبہ کے متعلق رومیوں کا تصور بھی ملا ہوا تھا۔

اسکی قوت کے اسباب

کارولنگی (یعنی سلسلۂ شارلمین) کے بادشاہوں کی طاقت کے بڑھانے میں بہت سے اسباب مجتمع ہوگئے تھے، ازانجملہ قابل اور خوش اقبال بادشاہوں کی پیہم جانشینی اُن کی وسعت مملکت کی عاجلانہ ترقی، جس سے ایک پر زور اور حاوی حکومت کی ضرورت پیدا ہوگئی ایک ایسی مضبوط فوجی طاقت کی بھی حاجت پیش آئی جو ہمہ وقت آمادۂ پیکار ہو اور اپنی جگہ پر اُس فوج نے فتوحات حاصل کیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ اُنکی رعایا کا بیشتر حصہ رومی شہنشاہی کے زیر اثر رہ چکا تھا اور اس وجہ سے وہ رومیوں کے خیالات اور اُنکی پرزور تنظیمات کا عادی تھا۔

موروثی جانشینی

ایک اعتبار سے فرانکوں میں شاہی کا قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ملک شخصی کی حیثیت میں موروثی اصول قائم ہوگیا اور قدیم انتخاب کا طریقہ بالکل بے معنی ہوگیا، یہی امر اس کا موجب ہوا کہ شہنشاہی مختلف بیٹوں میں تقسیم ہوگئی، جس سے سلطنت اور قوم دونوں کو سخت نقصان پہنچا۔ تخت کی جانشینی کا تعلق صحیح معنی میں سیاسیات اور قانون عامہ سے ہے اور اُنکا تقاضا یہ ہے کہ سلطنت میں اتحاد قائم رہے لیکن فرانکی طریق نے حکومت کے فرائض کے ساتھ بالکل شخصی یا خاندانی ملک کا سا معاملہ کیا اور اس اعتبار سے اُس خیال کی

موافقت کی جسے ہم اوپر آبائی اصول سے تعبیر کر چکے ہیں۔

فرانکون نے شاہی اختیار میں جو خاص تغیرات کئے وہ حسب ذیل ہیں :-

فرانکون میں قانون سازی کا طریقہ

۱۔ منفرد جرمانی قبائل کے محدود حلقے میں قانون سازی کو جو درجہ حاصل تھا فرانکی شہنشاہی میں اسکی اہمیت بہت بڑھ گئی اور اسکے ساتھ قانون سازی پر بادشاہوں کا اثر سابق کے بہ نسبت زیادہ غالب آگیا، رومیوں کا یہ اصول کہ شہنشاہ کی مرضی قانون کے مثل ہے جرمانی الاصل قوم کے لئے بالطبع ناقابل قبول تھا لیکن فرانکون میں قانون کے تجویز کرنیکا حق بادشاہ اور اسکی مجلس کو حاصل ہوگیا تھا اور یہ حق علی العموم قطعی سمجھا جاتا تھا قانون کو جائز قرار دینے کے لئے بادشاہ کی منظوری کی شرط تھی اور اسی کے نام سے قانون کی اشاعت ہوتی تھی۔

لیکن یہ یاد رکھنا بھی نہایت ضروری ہے کہ رواج اور قانون دونوں کی رو سے مذہبی اور ملکی رؤسا کی جماعت کا مشورہ اور اُنکی منظوری بھی ویسی ہی لازمی تھی جیسی بادشاہ کی منظوری، گر رعایا کی منظوری کچھ ایسی اہم نہ تھی اور اُن معاملات کے سوا جن میں کلیسا یا سلطنت کے یا خود رعایا کے حقوق کسے بحث ہوتی تھی دیگر معاملات میں اسکا لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔

امرا کی یہی شرکت طبقات کی اُس نیابت کا پہلا قدم تھی، جس نے بعد کی صدیوں میں اس قدر نشو ونما حاصل کیا اور جس سے نیابتی سلطنت کا ظہور ہوا۔

حکومت

۲۔ حکومت۔ سلطنت کی وسعت اور مسلسل سیاسی تغیرات کی اہمیت کے باعث ایک ایسی انتظامی قوت کی ضرورت پیش آئی، جس سے قدیم جرمانی ناآشنا تھے۔ اب صرف امن و قانون کے قائم رکھنے ہی کا سوال نہیں تھا بلکہ بہبود عامہ کا بھی کچھ لحاظ کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ رومیوں کے اختیار اعلیٰ (imperium) کا خیال فرانکون کے لئے بہت بعید از فہم تھا اس لئے اُنھوں نے اپنی نئی حکومت کے لئے ایک اپنا خاص اصول صیانت (mundium) قائم کیا یہ صیانت شاہی، رومیوں کے اختیار اعلیٰ سے وہی نسبت رکھتی ہے جو جرمانی باپ یا شوہر کے اختیار کی روما کے بزرگ خاندان کے اختیار کے مقابلے میں تھی۔ یہ اختیار خود مختارانہ یا علی الاطلاق نہیں تھا، بلکہ اُسکے خاص فرائض رعایا کے حقوق کی حفاظت اور بہبود عامہ کی ترقی تھے۔ درحقیقت اس میں امتیاز کے ساتھ

ادائے فرائض کا خیال ناقابل انفکاک طور پر منتظم تھا۔ یہ جدت طرازی ہنوز پوری واضح نہیں ہوئی تھی مگر اسکے اندر ایسی صحتور طاقت کا تخم موجود تھا جس میں حقیقی سیاسی ترقی کی قابلیت تھی۔

فوجی اختیار

شاہی کی اس صورت میں بادشاہ کو فوج کی سرکردگی کا اختیار تھا اور اس پر لازم تھا کہ وہ خود فوج کی سربراہی کرے۔ اسکے احکام بین (ban) کے نام سے نافذ ہوتے تھے، جو انی نوعیت میں عدالتی و فوجی دونوں ہوتے تھے۔ وہ اپنے فوجی حکم کی رو سے سلطنت کی تمام مسلح قوت کو جسطرح چاہتا کام میں لاسکتا تھا، اگرچہ بھی رسم ورواج اور خدمات کے معینہ قواعد سے اسکے اختیارات محدود تھے لیکن طاقتور بادشاہوں اور خاصکر چارلس اعظم نے اپنی جارحانہ جنگوں کے لئے بھی اپنے جاگیرداروں کے علاوہ رعایا کے پورے پورے مسلح ڈویزن طلب کئے اور تعمیل حکم نہ کرنے والوں کو ساٹھ شلنگ جرمانے کی دھمکی دی۔

عدالتی اختیار

عدالتی حکم جو ملک کے انتظام کے لئے اس قدر اہم تھا، وہ بھی بادشاہ سے متعلق تھا، مگر بالعموم اسکا نفاذ اضلاع کے کاؤنٹوں کے ذریعے سے ہوتا تھا جنھیں بادشاہ کی جانب سے اختیار حاصل ہوتا تھا۔ سلطنت کا نظم ونسق جب ترقی کر گیا تو تنازعات حقوق اور واقعات جرمانہ میں ذاتی جنگ کے قدیم اختیار پر روک قائم ہوئی اور تمام ملک میں اُنکا انتظام بادشاہ کی جانب سے ہوگیا اور قدیم قومی امن کا طریقہ جسے لوگ آسانی سے شکست کر دیتے تھے منسوخ ہوگیا۔

بادشاہ کے صرف خاص اور خزانۂ عامہ کی آمدنی بہت بڑھ گئی تھی اور یہ کل آمدنی کلیۃً بادشاہ کے اختیار میں تھی۔ رومی صوبوں کے فتح ہونے اور بادشاہیوں اور امارتوں کے منعدم ہونے سے شاہی جاگیروں میں بہت اضافہ ہوگیا تھا اور تمام ملک میں جابجا شاہی فرودگاہیں اور شاہی محلات بنے ہوئے تھے اور اُنکے اردگرد بہت بڑی بڑی جاگیریں تھیں۔ صوبوں کی اراضی اور اشخاص کے محصول بدستور قائم رکھے گئے تھے۔ مال واسباب پر جو محصول رومیوں کے وقت میں عاید ہوتا تھا وہ بڑھا دیا گیا تھا۔ مفتوح اقوام پر خراج لگایا جاتا تھا اور بطور تاوان جنگ کے اُن سے بہت بڑی بڑی رقمیں وصول کیجاتی تھیں۔

انتظامی عمال

۳۔ عمال کا ایک منتظم طریقہ قائم ہوگیا تھا، یہ تمام عمال بادشاہ کے تابع ہوتے تھے اور انھیں کے وسیلے سے بادشاہ کی قوت، انتظام کے ہر صیغے میں محسوس ہوتی تھی بیزنطینی دربار کے طرز پر ان عمال میں سے اعلیٰ عمال بادشاہ کے قصر میں حاضر رہتے تھے ان میں حسب ذیل عہدہ دار شامل تھے۔ (۱) حاجب یا اعلیٰ حاکم انصاف و نائب السلطنت (۲) بادشاہ کا پیش نماز جو دربار کے تمام پادریوں کا سرگروہ ہوتا تھا اور مذہبی معاملات کی اطلاع دہی اسی سے متعلق ہوتی تھی۔ خزانہ دار جو خزانہ شاہی کا صدر ہوتا تھا اور دوسرے ممالک سے مراسلات کی خدمت بھی انجام دیتا تھا۔ ناظر تشریفات جو دربار کی شان و شوکت اور ساز و سامان کو درست رکھتا تھا، داروغہ محل جو ملازموں کا نگران اور خانگی معاملات کا منتظم ہوتا تھا۔ داروغہ توشہ خانہ (میر سامان) جو اجناس وصول کرتا اور شاہی میز کے لئے شراب مہیا کرتا، داروغہ اصطبل۔ میر سفر جس کا کام یہ ہوتا تھا کہ سفر میں بادشاہ کی مناسب قیامگاہ کا انتظام رکھے۔ چار میر شکار اور بازدار۔

بادشاہ کے گشتی عہدہ دار سلطنت کے مختلف صوبوں کے معائنے کے لئے سال بسال روانہ کئے جاتے تھے۔ انھیں کے توسط سے بادشاہ کو صحیح حالات معلوم ہوتے اور رعایا کی شکایات و خواہشات اس تک پہنچتی تھیں۔ جہاں کہیں قانون کی اطاعت یا نظم عامہ کی حفاظت کی ضرورت ہوتی وہاں انھیں کے توسط سے یہ کام بھی انجام پاتا تھا۔

ضلعوں کے کاؤنٹوں کو اعلیٰ عدالتی اختیارات حاصل ہوتے تھے اور حلقوں کے کاؤنٹوں کے اختیارات محدود ہوتے تھے چونکہ روئے زمین پر سب سے اعلیٰ حاکم انصاف بادشاہ ہوتا تھا، اس لئے ان دونوں قسموں کے کاؤنٹوں کو عدالتی اختیارات اسی سے حاصل ہوتے تھے۔ اول الذکر کو براہ راست اور ثانی الذکر کو بالواسطہ۔ اُنکے فوجی اختیارات کا سرچشمہ بھی بادشاہ ہی ہوتا تھا۔ فرانکی شاہی کے ابتدائی زمانے میں کاؤنٹ کی حیثیت موروثی نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ ایک ذاتی عہدہ تھا اور بادشاہ کو اس پر تقرر کا حق حاصل تھا لیکن چارلس اعظم کے تحت میں موروثی جانشینی کے طبعی میلان نے بہت جلد عہدے کی حیثیت کو پوشیدہ کر دیا اور اس منصب پر ایک موروثی حق پیدا ہوگیا۔

بتدریج گشتی عہدہ دار قصۂ پارینہ ہوگئے۔ امارتیں پھر قائم ہوگئیں اور بادشاہت کے عہدے خاندانی ملک بن گئے۔ اس طرح اُس رومی جرمانی شاہی کی طاقت فنا ہوگئی

اور اسکے بجائے شہزادوں اور امیروں کی اعیانی حکومت قائم ہوگئی ۔

شہنشاہی اور کلیسا کے قریبی تعلقات

۔ فرانکی شاہی کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت مغربی شہنشاہی سے اُس کا گہرا تعلق ہے جسے چارلس اعظم نے قائم کیا تھا اور پھر عیسائیت اور کلیسا کی وسعت کے ساتھ ساتھ شاہی اور شہنشاہی دونوں کے تعلقات کا مدوجزر بھی قابل ذکر ہے ۔

سلطنت نے مذہب عیسوی قبول کر لیا تھا اور بادشاہ نے بھی ایک قسیس کے ہاتھ سے تبریک قبول کی تھی ۔ بادشاہ اپنے کو مامور سمجھتا تھا کہ وہ اپنی مملکت میں خالص مذہب عیسوی کو قائم رکھے اور اسے وسعت دے ۔ اسکے ساتھ ہی بہ حیثیت شہنشاہ کے اُسکا فرض تھا کہ جہاں تک اُسکا اختیار چل سکے وہ کفر و ارتداد کی بیخ کنی کرے ۔ چارلس اعظم نے اس فرض کو بہت وسیع پیمانے پر اور بہت سختی کے ساتھ پورا کیا ۔ تمام عالم عیسوی ایک جسم سمجھا جاتا تھا جسکے دو نظام تھے ایک قسیسی اور ایک شاہی یعنی کلیسا اور سلطنت ۔ بادشاہ اگرچہ سلطنت کا صدر تھا مگر اُس نے پادریوں میں بھی مسلمہ عیسوی انضباط و ترتیب کو بزور رائج کر دیا تھا ۔ وہ مجالس مذہبی کو طلب کرتا، اسافقہ اور صوامعہ کے طور و طریق پر نظر رکھتا، کلیسائی معاملات کے متعلق متعدد قوانین و احکام جاری کرتا رہتا تھا ۔ علیٰ ہذا، سیاسی تنظیمات اور ملکی نظم و نسق کے قانونی اصول پر حکومت مذہبی کا بھی نمایاں اثر پڑتا تھا ۔

# بارھواں باب

## (ھ) جاگیری شاہی اور شاہی محدود بہ حقوق طبقات

### (۱) جاگیری شاہی۔

خاندان پیپانیس کی شاہی کا زوال

فرانکی شاہی میں ایک صحیح شاہی کے تمام لازمی شرائط موجود تھے اور اس لحاظ سے وہ جدید سلطنت کے لئے ایک نئی شاہراہ ترقی تھی مگر قوم میں مخالف قوت و جذبات اس قدر قوی تھے اور جرمانی امرا اور آزاد اشخاص کی روایات ایک مضبوط مرکزی انتظام کے اس قدر مخالف تھیں کہ صرف غیر معمولی ہی قوت کے حکمران اپنے شاہی اقتدار کو پوری طرح عمل میں لاسکتے اور سلطنت کی اصلی خصوصیت کو ظاہر کرسکتے تھے ورنہ کمزور بادشاہ بالکل بے بس تھے۔ انکے عہد میں یہ میلان صاف ظاہر ہوجاتا تھا کہ اتحاد سلطنت مٹا دیا جائے مرکزی قوت محدود اور بے اثر کردی جائے اور مقامی حکومتوں کو آزادی دیدیجائے۔

جاگیری شاہی

خاندان چارلس کے زوال و انقطاع سے شاہی اقتدار بالکل معدوم ہوگیا اور حاکمانِ ملک اور امرا نے علٰحدہ علٰحدہ قوموں اور حصوں کے انتظامات پر قبضہ کرلیا۔ رومی جرمانی عالمگیر شاہی کے بجائے جاگیری شاہی قائم ہوگئی۔ یہی طریقہ ازمنۂ وسطیٰ کی خاص سیاسی خصوصیت ہے۔

اسکی خصوصیات

اسکی بنا تعلقات پر ہے

جاگیری شاہی کی نہایت نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اس سے پہلے کی ہر ایک شاہی کی بنا یا تو قبیلے پر یا قوم پر یا متحدہ نسل پر رہی اور اس لئے اُسے ایک قومی یا نسلی تنظیم کہہ سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے جاگیری شاہی اگرچہ بادشاہ کی ذات کی وجہ سے کسی خاص قوم سے متعلق رہی ہو مگر اسکی اصلی بنیاد اُس شخصی عہد و فاداری پر تھی جو بادشاہ اور اسکے تابعین کے درمیان ہوتا تھا۔ بادشاہ ملک کا مالک اعلیٰ ہوتا تھا اور تابعین کو اختیار منصب و جائداد سب اسی سے حاصل ہوتے تھے۔ عام رعایا چونکہ جاگیری زنجیر میں وابستہ نہیں ہوتی تھی اسلئے اُسکی حیثیت کمتر

اور اُسکا تعلق بعید ہوتا تھا، پس اسطرح شاہی بجائے قوم کے گویا ایک خاص درجے یا طبقے کی تنظیم ہو جاتی تھی۔ اُسکا انحصار قوم پر اُس قدر نہیں ہوتا تھا جسقدر جاگیردار کا تابعین پر۔

وفاداری اور اطاعت

۲۔ شخصی وفاداری میں عزت کے خیال سے شرف اور زور پیدا ہو گیا تھا اور سیاسی نقطۂ خیال سے اب اسکی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ تابعین جب اپنے آقا سے جاگیر حاصل کرتے تھے تو اسکی وفاداری اور اطاعت کا حلف اٹھاتے تھے۔ اس حلف اور جاگیرداری طریق کی تمام کیفیت انگلستان کی بادشاہت کے سکسونی نورمانی قانون میں بہت واضح اور نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ بادشاہ کے تابعین گھٹنوں کے بل جھک کر بادشاہ کی اطاعت کا حلف اٹھاتے تھے اور پھر کھڑے ہو کر انجیل پر ہاتھ رکھکر وفاداری کی قسم کھاتے تھے۔ اساقفہ اور رؤسائے خانقاہ اس سے مستثنیٰ تھے۔ اُنکے لئے صرف انجیل اٹھانا کافی تھا۔ اطاعت کے حلف کا تعلق خصوصیت کے ساتھ جاگیر کے قبضے سے ہوتا تھا۔ وفاداری کا حلف نسبتاً زیادہ عام تھا اور دوسرے افراد رعایا سے بھی جو جاگیرداری تعلق سے مربوط نہ ہوں، یہ حلف لیا جاسکتا تھا۔ اسکی مثالیں خاندان چارلس کے بادشاہوں کے وقت میں بھی ملتی ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ اسکا سبب وہی جاگیری خیال کا اثر تھا۔

وفاداری کی اس قسم کی پابندی دونوں جانب عاید ہوتی تھی۔ تابع کی طرح آقا بھی وفاشعاری کا پابند تھا مگر اطاعت کی پابندی صرف تابعین پر عاید ہوتی تھی۔

قبضۂ اراضی

۳۔ جاگیری شاہی کی اس کوشش سے کہ تمام رعایا تابعین کے ضمن میں آجائے، قبضۂ اراضی پر بہت بڑا اثر پڑا۔ انگلستان کے نورمانی بادشاہوں نے یہ کوشش کی کہ وہ ملک کی تمام زمین کے مالکِ اعلیٰ سمجھے جائیں تاکہ صرف جاگیریں نہیں بلکہ وہ ریاستیں بھی جو حلف اطاعت سے قائم نہیں ہوئی تھیں، بادشاہ کی عطا کردہ سمجھی جانے لگیں پس اسطرح آزادانہ جائداد کا حق قومی تابعانہ قبضے کے جاگیری حق میں بدل گیا[^5]۔ یہ طریق جاگیرداری کی یہ عام خصوصیت ہے مگر انگلستان کی تاریخ قانون میں یہ خاص طور پر نمایاں ہے۔

---

[^5]: دیکھو دوسرا مقالہ، دوسرا باب، تعلیق۔

بادشاہ سے حاصل شدہ اختیارات

۴۴۔ اس مطابقت سے بتدریج یہ بھی خیال کیا جانے لگا کہ تمام سیاسی اختیارات بادشاہ سے حاصل ہوئے ہیں اور بادشاہ کا اختیار خدا کا عطیہ ہے[1] جس طرح سیاروں کو آفتاب سے روشنی حاصل ہوتی ہے، اسی طرح امرا کو حکمرانی کا حق آقائے بلند و برتر یعنی بادشاہ سے حاصل ہوتا تھا لیکن وہ محض سلطنت کے عہدہ دار یا عامل کے طور پر حکومت نہیں کرتے تھے بلکہ جس طرح وہ اپنی جائداد پر قابض ہوتے تھے اسی طرح وہ اپنے حق کی بنا پر اور اپنے حسب دلخواہ حکومت کرتے تھے۔ سیاسی حکمرانی کے ساتھ شخصی آزادی کا یہ اجتماع اور بعض خاندانوں اور ریاستوں کے ساتھ مختلف مدارج کے اختیارات کا موروثی حق حاصل ہوتا تھا، انھیں اختیار عطا کرنے سے بادشاہ انکار نہیں کرسکتا تھا، نہ وہ اُنکے اختیار کے نفاذ میں مداخلت کرسکتا تھا، نہ اسکے لئے کوئی پابندی یا حد قائم کرسکتا تھا۔ نظم و نسق کا ہر ایک حصہ حقیقتاً ایک دوسرے سے ممیز و آزاد تھا۔

امرا کے اختیارات

پس سلطنت کا اتحاد محض ظاہری تھا۔ قوت رائے سے کام کرنیکی ہر ایک کوشش میں نا قابل حل ہوسکنے والی مشکلات کا سامنا ہوتا تھا۔ چھوٹے اور بڑے سب امرا مرکزی قوت کے کارکن کی طرح کام کرنیکے بجائے دقتیں حایل کرتے اور روک پیدا کرتے تھے۔ قومی زندگی مختلف انفرادی حصوں میں منتشر اور ایک ایک سلطنت متعدد شاہیوں میں منقسم ہوگئی تھی۔ افراد اور بالخصوص امرائے عظام کی مرضی اور خیال کے اظہار کے لئے وسیع مواقع حاصل تھے مگر مجموعۃً کوئی مشترک سیاسی کارروائی ممکن نہ تھی۔ صرف امرا کا طبقہ زور دار اور آزاد تھا۔ بادشاہ کی صرف توقیر تھی اُسے کوئی قوت نہیں حاصل تھی۔ رعایا اپنے قوتوں کے فطری نشو و نما کے لئے ہر طرف سے راستے بند پاتی تھی۔ ادنیٰ طبقے جسقدر مرکزی قوت یعنی بادشاہ سے دور تھے اُسی قدر اُن کے درمیانی آقا یعنی امرا ان پر بے روک ٹوک ظلم کرتے تھے۔

[1] "سکسونی آئینہ" (Sachsenspiegel) جلد ا صفحہ ا کے بموجب خدا نے دنیاوی حکومت کی تلوار صرف شہنشاہ کو دی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ بادشاہوں کو اختیارات صرف شہنشاہ کے توسط سے حاصل ہوئے ہیں، مگر یہ رائے عام طور پر قبول نہیں کیگئی اور بادشاہ اگرچہ شہنشاہ کے بلند مرتبے کا احترام کرتے تھے مگر وہ یہ کہتے تھے کہ انھیں اختیارات براہ راست خدا سے حاصل ہوئے ہیں۔

جرمانی اقتدار شاہی کے دو خاص اجزا یعنی فوجی اور عدالتی اختیارات اسی طرح پر بیشمار تابعین و امرا کے درمیان تقسیم ہو گئے تھے۔ عاملانہ حکومت فرانکی بادشاہوں کے مقابلے میں بہت زیادہ کمزور اور محدود تھی۔ شاہی اگرچہ زیبائش کے طور پر باقی تھی مگر تمام نظام سلطنت آئینی ہو گیا تھا۔ کپٹنگی خاندان کے بادشاہوں کو امرائے عظام پہ کچھ ایسا امتیاز نہیں حاصل تھا۔ جرمانی بادشاہ تک اکثر اندرونی معاملات میں والیانِ ملک کی کارروائی سے پریشان ہو جاتے تھے، صرف مستثنیٰ طور پر (جب کہ حالات خصوصیت سے موافق ہوں یا خطرات بالتخصیص خوف دلانیوالے ہوں) یہ ہوتا تھا کہ بادشاہ مضبوطی کے ساتھ اپنی مرکزی قوت کو کام میں لا سکتے تھے۔ نورمانی فتح کے بعد انگلستان میں اس حالت کے پیش آنیکی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ نورمانی امرا بادشاہ کے ساتھ متحد ہی رہنے میں اپنی حفاظت سمجھتے تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ نئے خاندان کو تخت پر قائم رکھنے کے لئے ایک مضبوط حکومت کی ضرورت تھی۔

۵۔ گیزو نے اس سوال کو اٹھایا کہ کیوں جاگیرداری طریقہ ہمیشہ رعایا کو ناپسند رہا ہے۔ یہ نفرت صرف تنزل ہی کے زمانے کے متعلق نہیں تھی بلکہ جب یہ طریق اپنے معراج کمال کو پہنچا ہوا تھا اُس وقت بھی یہی کیفیت تھی اُس نے اسکی خاص وجہ یہ بیان کی ہے کہ جاگیرداری طریقہ چھوٹے چھوٹے بادشاہوں بلکہ مطلق العنانوں کا ایک اتحاد تھا۔ اُن میں باہم مساوات نہیں تھی، وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حقوق و فرائض کے پابند تھے مگر اپنے اپنے حدود میں انھیں اپنی اپنی رعایا پر کامل مطلق العنانی حاصل تھی ظالمانہ حکومتوں میں سب سے بدتر حکومت وہ ہے جو اس طرح اپنی رعایا کا شمار کر سکے اور اپنے مستقر سے اپنے حدود حکمرانی کو دیکھ سکے۔ یہاں انسانی خود رائی کے تلون کا اظہار ناقابل برداشت طریقوں سے اور ایسی شدت کے ساتھ ہوتا تھا کہ اُسکا مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ وہ طریقہ تھا جس میں حالات کی نامساوات بہت بُری طرح نمایاں کیجاتی تھی۔ دولت، اختیار، آزادی ہر طرح کے منافع اور حقوق ایک طرف ہوتے تھے اور عین اُنھیں کے مقابلے میں افلاس، کمزوری اور غلامی کا منظر دوسری طرف نگاہوں کے سامنے ہوتا تھا۔ خود مختاری اس حد تک بڑھی ہوئی تھی جیسی کسی خالص بادشاہی میں ہونا چاہئے، امتیازات اُس حد تک ترقی کر چکے تھے جسقدر کسی منتظم اعیانی سلطنت میں

ہوسکتے ہیں اور ان دونوں کا اظہار نہایت ہی برے اور تکلیف دہ طریقے سے ہوتا تھا۔ تختگاہ کی دوری اور بلند پایگی کی وجہ سے مطلق العنانی میں جو کمی ہوجاتی ہے اُس کا یہاں وجود نہیں تھا۔ امتیازات پر کسی عظیم الشان مجلس کی عظمت کا نقاب نہیں ڈالا جاتا تھا۔ اُن دونوں کا تعلق ایک ایسے شخص سے ہوتا تھا جو بروقت موجود رہتا تھا۔ کوئی اسکا شریک کار نہیں تھا اور وہ ہمیشہ اپنی رعایا کے پاس ہی پاس ہوتا تھا۔

یہ طریقہ تمامتر باعث تکلیف ہی نہیں تھا۔

اس بیان میں کچھ سچائی ضرور ہے مگر اسکا کلی اطلاق صرف فرانس پر ہوسکتا ہے از منہ وسطیٰ کی سب سلطنتوں پر نہیں ہوسکتا۔ جاگیرداری طریق ہر جگہ نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور کسانوں تک کے امیروں سے رضامند ہونیکی مثالیں کم نہیں ہیں۔ اس طریقے کے لئے یہ بھی لازمی نہیں تھا کہ امرا کو اپنے تابعین پر کامل مطلق العنانی حاصل ہو۔ جہاں اس قسم کے اختیار پر عمل ہوتا تھا جیسے فرانس، اور اکثر دوسرے ممالک میں بھی، وہاں یہ اختیار اُس طریقے کے بالکل مخالف تھا، جس نے اوپر سے نیچے تک انتظامی حلقے قائم کردیے تھے جن میں اختیارات ایک دوسرے سے بالاتر آزاد قوت سے حاصل ہوتے تھے۔ نیم غلاموں تک کے موروثی حقوق معین تھے انکی ذمہ داریوں میں محض آقا کی مرضی سے اضافہ نہیں ہوسکتا تھا۔ نہ رسم ورواج کے خلاف آقا اُن کو بیچ سکتا تھا۔ ادنیٰ طبقے کے لئے، تعلقے کا قانون اُسی طرح معین ومروج تھا جس طرح اعلیٰ طبقے کے لئے جاگیرداری قانون رائج تھا۔

لیکن ان حالات سے قطع نظر بھی جہاں آقا اپنے حقوق سے تجاوز کرجاتے تھے اس میں شک نہیں ہوسکتا کہ حکومت کی یہ مختصر وسعت اور اس شخصی ظلم وجور سے بچنے کے مشکلات جو اس قدر قریب ہوتا تھا، جاگیرداری طریقے کی بدترین خصوصیات میں سے ہیں۔

سیاسی حقوق کی موجودگی۔

۶ - جاگیری سلطنت سب سے مقدم ایک قانونی سلطنت تھی، اگرچہ مفاد عام کا اصول نظروں سے غائب تھا مگر مختلف سیاسی حقوق بہت صاف طور پر معین ومشخص تھے۔ ذاتی اور شخصی حقوق کی طرح یہ سیاسی حقوق بھی حسب خواہش فروخت، مبادلہ، ہبہ اور وراثت وغیرہ کے معمولی قانونی کارروائی کے ذریعے سے علیحدہ کئے جاسکتے تھے۔ انکی حفاظت یا تو عدالتی طریق سے ہوتی تھی یا اسکے لئے شخصی جنگ کا حق تسلیم کیا جاتا تھا۔

ایک طرف ایک معینہ قانونی انتظام تھا، جس سے افراد اور علیحدہ علیحدہ جماعات کی آزادی تو محفوظ تھی مگر عام قوم کی آزادی محفوظ نہ تھی۔ دوسری طرف اندرون ملک میں ہمیشہ جنگ وجدل کا بازار گرم رہتا تھا جس سے بدامنی کا ایک نامتناہی سلسلہ قائم ہوگیا تھا۔ ازمنہ وسطی کی جاگیری سلطنت کے یہ دو متضاد رخ ہیں۔

(۲)- شاہی محدود بہ حقوق طبقات۔

شاہی اختیار کی تجدیدات

ازمنہ وسطی کے ختم ہونیکے قبل، بتدریج جاگیری شاہی کی جگہ، شاہی محدود بہ حقوق طبقات نے لے لی۔ یہی شاہی زمانۂ حال کی بنا تھی بادشاہت کی پیشرو ہے، کم وبیش سنہ ۱۲۵۰ء سے یہی طریقہ یورپ کی اکثر سلطنتوں میں رائج ہوگیا اور تین صدیوں تک جاری رہنے کے بعد سولھویں صدی میں اس نے مطلق العنان شاہی کی صورت اختیار کرلی۔

بادشاہ یا حکمران اب بھی اپنے اختیارات خدا سے یا اپنے سے اعلیٰ طاقت سے حاصل کرتا اور ان اختیارات کو اپنی اور اپنے خاندان کی ملک سمجھتا تھا۔ اپنے حدودِ حکمرانی میں وہ اپنے کو بالکل مالک سمجھتا تھا اور اپنی مرضی کے خلاف کسی مخالفت کا متحمل نہیں ہوتا تھا لیکن یہ حدودِ حکمرانی اب ہر طرف سے محصور ہوگئے تھے۔ طبقات، جماعات اور افراد کے حقوق سے ہر جگہ مقابلہ پڑتا تھا وہ جسطرح اپنے حقوق کی عزت چاہتا تھا اسی طرح وہ خود ان حقوق کی حفاظت کرنے پر مجبور تھا۔ یہ صاحبان حقوق بشرط ضرورت بزورِ اسلحہ یا قانون کے با امن ہتیار کے ذریعے سے اپنے حقوق کی حفاظت کرنیکے لئے تیار رہتے تھے۔

وضع قانون

بادشاہ کو بذات خاص قانون سازی کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ بادشاہ کے فرامین کے لئے قومی طبقات (مجلس شوری) کے مشورے اور منظوری کی شرط تھی اور والیان صوبہ جات کیلئے صوبے کے طبقات کی منظوری درکار تھی۔

نظم ونسق

اس وقت تک انتظامی قوت نے بہت کم ترقی کی تھی اور بہت محدود تھی۔ مرکزی حکومت کے منشا کی تعمیل کے لئے کوئی جماعت عمال کی نہیں تھی۔ جن روسائے عظام کو شاہی اختیارات تفویض ہوتے تھے، وہ ان اختیارات کو اپنے حدود کے اندر مثل اپنے اختیار کے استعمال کرتے تھے۔ دربار کے عہدے اکثر موروثی تھے اور بادشاہ کے جو تابعین و وزرا ان پر مامور ہوتے تھے وہ رشد آمد قدیم کے مطابق اس خدمت کو

انجام دیتے تھے جس میں اصلیت کے بہ نسبت نمائش زیادہ ہوتی تھی۔ رواج و آداب، مختلف طبقات کی روایات، خاندانی خیال، فرائض قانونی اور مفاد عامہ کے احساس سے زیادہ موثر ہوتے تھے۔ صوبے کی مجلس شوریٰ جسمیں امرا کا غلبہ ہوتا تھا اکثر اپنی شکایات و تعرضات کی وجہ سے صوبے کی حکومت کے لئے پریشان کن ثابت ہوتی تھی، وہ اکثر والی صوبہ کے وزرا پر اعتراضات کرتی رہتی اور انکی موقوفی و سزا دہی کا مطالبہ کرتی تھی۔ بسا اوقات وہ خود والی کی ذات کو اپنی نگرانی میں لے لینا چاہتی تھی، یا یہ دعویٰ کرتی تھی کہ اُسکے مقرر کردہ اشخاص حکومت میں شامل کئے جائیں۔

عدالتی اختیار

بادشاہ بدستور انصاف کا حاکم اعلیٰ سمجھا جاتا تھا اور کبھی کبھی دادرسی کے لئے بذات خاص اجلاس کرتا تھا لیکن فیصلے کا اعلان ایسسر کرتے تھے اور بادشاہ صرف اُس فیصلے کو عمل میں لاتا تھا، وہ خود بھی قانون کا پابند ہوتا تھا اور اپنی غلطیوں کی اُسے جوابدہی کرنا پڑتی تھی۔ یہ ایک پرانا جرمانی دستور تھا کہ جس امیر کو عدالتی اختیارات حاصل ہوں اس پر اگر کوئی الزام لگایا جائے تو اسکا مقدمہ اسی کے قائم مقام کے سامنے پیش ہونا چاہئے چنانچہ جرمانی بادشاہ باوجودیکہ وہ رومی شہنشاہ اور تمام عالم عیسوی کا دنیاوی سرگروہ ہوتا تھا، بعض صورتوں میں رائن کے پیلیٹائن کاؤنٹ (والی) کے روبرو طلب کیا جاسکتا اور ان والیوں کے فیصلے کے سامنے اُسے سر جھکانا پڑتا تھا۔ علیٰ ہذا والی کے مقدمہ کا فیصلہ اسکا کارکن مجسٹریٹ (حاکم) کر سکتا تھا۔

پولس کے انتظام نے ترقی نہیں کی تھی اور بالعموم منصفوں کے فرائض میں یہ کام بھی داخل کردیا جاتا تھا۔ اُس وقت تک جندارمہ (سلحداروں) کا رواج نہیں ہوا تھا اور موجودہ مفہوم میں پولیس کا وجود نہیں تھا۔

فوجی اختیارات

حکمران کی فوجی طاقت بھی جاگیرداری قوانین اور رسم و رواج سے محدود تھی، تابعین پر صرف ایک معینہ اور بہت ہی محدود خدمت عائد ہوتی تھی اور اُسے وہ اپنی زمین کا معاوضہ سمجھتے تھے اور اُسے کسی پرزور طریقے پر کام میں لانے کو وہ روکنا چاہتے تھے۔

جرمانی بادشاہوں کو اکثر یہ تجربہ ہوتا رہتا تھا کہ بڑے بڑے نائبان سلطنت کی متمردانہ آزادی کو روکنا کس قدر دشوار کام ہے اور یہ کہ شہنشاہی کے حکمرانوں کی

وفاداری پر شہنشاہ کو کس قدر کم اعتماد کرنا چاہئے۔

بادشاہوں اور حکمرانوں کیلئے یہ امکان موجود تھا کہ وہ اُن لوگوں سے زیادہ مطیع اور کار آمد فوج اجرتی سپاہیوں کی تیار کرلیں اور اکثر ایسا ہوتا رہتا تھا، لیکن اجرتی سپاہیوں کو تنخواہ دینی پڑتی تھی اور اگر مجلس شوری اس غرض کے لئے کوئی خاص محصول عاید کرنے سے انکار کردیتی تو بادشاہ کو خود اپنی جیب سے یہ رقم ادا کرنا پڑتی اور اس سے وہ اکثر قرضدار ہو جاتا اور مشکلوں میں پھنس جاتا تھا۔ علاوہ اسکے چونکہ یہ اجرتی سپاہی اکثر غیر ملک کے ہوتے تھے، اس لئے جس ملک پر وہ متعین کئے جاتے تھے اُسکے باشندوں کو بادشاہ کی طرف سے متنفر کردیتے تھے۔

اجرائے محصول

بادشاہ کو اُسوقت تک کسی قسم کے محصول کے وصول کرنیکا حق نہیں تھا، جب تک کہ پہلے مجلس شوری اُس محصول کی ضرورت کو تسلیم اور اسکے اجرا کو منظور نہ کرلے لیکن ایک اعیانی جماعت بآسانی اُس پر راضی نہیں ہوسکتی تھی۔ آہستہ آہستہ اکثر محصول جائداد غیر منقولہ پر عائد کردیے گئے۔ اُنکا بار زیادہ تر کاشتکاروں کی زمین پر پڑتا اور اسطرح وہ ایک معینہ اور ناقابل تنسیخ محصول بن گئے۔ اس سے اور بعض دوسرے معاملات سے بھی صاف ظاہر ہے کہ مجلس شوری اور افراد دونوں میں سلطنت کے مشترکہ فرائض کے احساس میں کمی تھی۔

# تیرھواں باب

## (۹) زمانۂ حال کی مطلق العنان شاہی

مطلق العنانی کی ترقی۔

ازمنہ وسطیٰ کی شاہی جو ذی امتیاز طبقات کے حقوق سے محدود تھی اس کے بعد ہی زمانۂ حال کی نیابتی شاہی نہیں قائم ہوئی بلکہ اُسکے بعد مطلق العنان شاہی قائم ہوئی جسے طبقات (مجلس شوریٰ) کے خلاف جد و جہد سے قوت حاصل ہوگئی تھی سلطنت کی موجودہ صورت حاصل کرنیکے قبل جرمانی رومی مخلوط قوموں اور خالص جرمانی قوموں دونوں کو اس درجے سے گزرنا پڑا۔

رومی ملکوں میں

مطلق العنانی کا ظہور سب سے زیادہ نمایاں طریقے پر اولاً فرانس اور ہسپانیا میں ہوا۔ جہاں جہاں قوم میں جرمانی عنصر غالب تھا وہاں بادشاہوں کے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ قانونی مسلمات اور جرمانی روایات کے خلاف مطلق العنانی قائم کرلیں، لیکن رومی روایات، جواب اصولاً اور عملاً دوبارہ زندہ کیجارہی تھیں شاہی کے حق میں مفید تھیں۔

بارھویں ہی صدی سے جب کہ جاگیرداری طریق اپنے اوج کمال پر پہنچا ہوا تھا، فرانسیسی مقنن بالاتفاق یہ کوشش کر رہے تھے کہ شاہی کو روما کے شہنشاہی قانون کی قدیم بنیاد پر قائم کریں؛ انکے گروہ کا اصول مسلمہ یہ تھا کہ حکومت، واحد، ناقابل تقسیم اور علی الاطلاق ہونا چاہئے، اور ان صفات کو وہ مجموعۂ " اختیار شاہی " سے ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ اس نظر سے وہ جاگیردار امرا کے عدالتی اور حکومتی اختیارات کو درازدستی اور خرابی قرار دیتے اور اسے بادشاہ اور رعایا کے اغراض کے مخالف بتاتے اور اسے بالکل نیست و نابود ورنہ جہاں تک ہوسکے محدود کردینا چاہتے تھے۔ وہ فرانسیسی بادشاہوں کو رومی شہنشاہوں کے جانشین اور صرف رومی قانون کو صحیح قانون ظاہر کرتے تھے۔ وہ جاگیرداری طریق کے قانونی دستوروں کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے ان نظریات کو خیال سے عمل میں لانیکے لئے صدیاں گزرگئیں جب کہیں امرا کی حکومت کا خاتمہ ہوا، لیکن اندرونی کشمکش اُسوقت تک

ختم نہیں ہوئی جب تک کہ جاگیر داری طریق کی ہر ایک صورت فنا ہو کر اسکی جگہ پر مطلق العنان شاہی (جو یوماً فیوماً زور پکڑتی جاتی تھی) قائم نہ ہو گئی۔

رومی قانون کا یہ مقولہ کہ "جو بات بادشاہ کو پسند ہے، وہ قانون کا حکم رکھتی ہے"، خمولِ قدامت سے نکال کر دوبارہ ایک لابدی اصول سلطنت بنایا گیا اور اُس نے فرانسیسی میں اس قانونی ضرب المثل کی صورت اختیار کی کہ: "جو بادشاہ کو چاہتا ہے وہ قانون کو چاہتا ہے۔" جب قانون سازی کا غیر محدود اختیار بادشاہ کے ہاتھ میں آگیا تو پھر بہت آسانی کے ساتھ وہ تمام مشکلات رفع ہو گئیں جن کو جاگیر داری طریق اور حقوق طبقات (مجلس شوریٰ) نے مرکزی حکومت، قومی جوش اور بہبود عامہ کی ترقی میں حائل کر رکھا تھا۔ نئے علمائے قانون کے زیر ہدایت جو طرز عمل عدالتوں اور خاصکر (پیرس اور صوبہ جات کی) شاہی پارلیمنٹوں نے اختیار کیا تھا اُس نے اس میلان کو کامیاب بنانے میں بڑی مدد دی۔ عام رائے، خاصکر اُن شہروں کی رائے جہاں رومی تہذیب مدتوں سے جاگزیں تھی اور جو ایک حد تک جاگیر داری اثرات سے آزاد رہے تھے، اس نئے خیال کی موئد تھی۔ اہل شہر جس قدر بادشاہ سے خائف تھے اُس سے کہیں زیادہ وہ چھوٹے چھوٹے امرا سے متنفر تھے اور انھیں یہ امید تھی کہ ان جاگیر دار امرا کو نیچا دکھا کے اور انھیں کمزور کر کے وہ اپنی تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کو محفوظ کر لیں گے۔ اپنے ستانے والوں پر بادشاہ کے قوت کے بڑھ جانے سے کسان بھی نقصان کے بجائے نفع میں رہنے کی امید کرتے تھے۔

فرانس میں شاہی کو جاگیر داری طریق پر لوئس یازدہم کے عہد (۱۴۶۱ء–۱۴۸۳ء) میں فتح حاصل ہوئی اور ہسپانیا میں فلپ دوم کے دور (۱۵۵۶ء–۱۵۹۸ء) میں۔ فرانس میں وقتاً فوقتاً رجعت قہقری بھی ہوتی رہی۔ مگر ہسپانیا میں مطلق العنانی بہت مضبوط طور پر قائم ہو گئی تھی اور فرانس کی بہ نسبت زیادہ ظالم اور جفا کار ثابت ہوئی۔ یہ خیال کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ فلپ دوم نے یہ جرأت دکھائی کہ نذرلینڈز کی تمام آبادی کو مجرم قرار دیدیا حالانکہ اس ملک پر اُسے حکومت کے بہت محدود اختیارات حاصل ہوئے تھے۔ فرانس میں مطلق العنانی لوئس چہاردہم کے وقت میں اپنے منتہائے کمال کو پہنچی اور اُسکے بعد سے برابر تنزل کرتی گئی، یہاں تک کہ انقلاب نے اُس کا خاتمہ کر دیا۔

جرمانیا کے سب چھوٹے بڑے حکمران خاندان لوئش چہاردہم کی نقل پر آمادہ ہو گئے یہانتک کہ اٹھارویں صدی میں ایک عیسائی حکمران جوزف اول نے بوریا کی تمام قوم کے خلاف (جن پر اس نے غاصبانہ حکومت قائم کر لی تھی) موت کا حکم صادر کر دیا اور اپنے اس فعل کو اپنے اختیار منجانب خدا کی بنا پر جائز ٹھہرایا۔

مطلق العنان بادشاہی کے اصول

اس نئی مطلق العنانی کے سیاسی اصول کو لوئش چہاردہم نے اپنے ایک مشہور فقرے میں حیرت انگیز سادگی کے ساتھ ظاہر کیا ہے کہ "میں ہی سلطنت ہوں"، بادشاہ اب اپنے کو جماعتِ قومی کا سرگروہ یعنی سب سے برتر اور سب سے طاقتور رکن نہیں سمجھتا تھا بلکہ وہ اپنی ذات اور سلطنت کو بالکل ایک سمجھتا تھا، پس گویا اُسکے سوا سلطنت کے کسی رکن کو سیاسی حقوق نہیں حاصل تھے۔ اسکی شخصی بہبود سلطنت کی بہبود تھی اُسکے ذاتی حقوق سلطنت کے حقوق تھے۔ وہی سب کچھ تھا اور اسکے سوا کچھ نہ تھا۔

"شاہی"، اور "سلطنت" کا اس طرح ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا اس سے بالکل جداگانہ امر ہے کہ بادشاہ سلطنت کے عظمت و اقتدار کا مجسمہ سمجھا جائے۔ اس کارروائی کی اہمیت اور اسکا خطرہ اس وجہ سے اور بھی بڑھ گیا تھا کہ اُسی کے ساتھ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یہ نظریہ بھی ترقی پر تھا کہ سلطنت کو "اختیار مطلق حاصل ہے"۔ ازمنۂ وسطیٰ میں سلطنت چند محدود آزاد ٹکڑوں میں منقسم ہو گئی تھی اور اُن ٹکڑوں پر اُسے کوئی قطعی اختیار حاصل نہ تھا۔ اب دوسری جانب یہ نظریہ سرعت کے ساتھ عروج کو پہنچ گیا تھا اور کوئی سیاسی حیثیت ایسی نہ تھی جو سلطنت کی گرفت سے باہر خیال کیجاتی ہو۔ قانونی معاملات اور شخصی حقوق تک سلطنت کے پیدا کردہ اور اُس کی مرضی کے تابع سمجھے جاتے تھے۔

اصحاب نظریات اور پادریوں کا اثر

اس خیال سے جو نقصانات پیدا ہوئے اُنکی ذمہ داری ایک بڑی حد تک اُس زمانے کے سیاسی اور قانونی اصحاب نظریات پر عائد ہوتی ہے۔ اول الذکر اس فکر میں مستغرق تھے کہ شاہی دراز دستیوں کے لئے کوئی لگتی ہوئی توجیہ پیدا کریں اور ثانی الذکر نے اُس مخالفت سے کلیتہً پہلوتہی کی جو بطور فرض کے اُن پر عائد ہوتی تھی۔ اُس زمانے کے درباری علمائے مذہب بھی (خواہ وہ یسوعی تھے یا ہائی چرچ والے یا لوتھر کے متشرع پیرو) اسکو آسانی سے نہ مان سکے۔ انھیں لوگوں نے توڑ مروڑ کے

یہ مذہبی عقیدہ لکالا تھا کہ حکومت کی بنیاد ربانی ہے اور بادشاہ زمین پر خدا کا قائم مقام ہے۔ گویا وہ ایک طرح کے دنیاوی دیوتا ہے۔ چونکہ خدا اس دنیا کا احکم الحاکمین ہے جسے اُس نے پیدا کیا اور اپنی روح سے اُسے منور کیا، اسلئے بادشاہ بھی (اگرچہ قوموں کے پیدا کرنیوالے اور انکے زندہ رکھنے والے نہیں ہیں تاہم وہ اُنکے) اعلیٰ احکمران ہیں۔ جسطرح رومی شہنشاہ دیوتاؤں کی ہیئت اختیار کرنیکے متمنی رہا کرتے تھے، اُسی طرح لوئس چہاردہم نے جوپیٹر کا سوانگ بھرا تھا مگر عہد عیسوی کے بجائے یہ سوانگ کچھ زمانہ کفر ہی کے لئے زیادہ موزوں تھا۔

مطلق العنانی کا زوال

عین اُسی زمانے میں جب کہ اس قسم کی "قدرت مطلق" بادشاہوں کی طرف منسوب کیجارہی تھی اور اکثر اس پر عمل بھی ہوتا تھا۔ ہمیں بادشاہوں کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو بالکل بے بس تھے اور اپنے بلند حوصلہ وزیروں یا اپنی حریص بیگموں کے اطاعت شعار غلام بن گئے تھے۔ اس نظام کار میں تمام باتوں کا انحصار بادشاہ کی شخصی طبعیت پر تھا نمایاں قابلیت اور طاقت کے بادشاہ بھی اگرچہ اس سرگردان بلندی پر مستحکم طور پر قائم نہیں رہ سکتے تھے، تاہم وہ کسی نہ کسی طرح اس "قدرت مطلق" کی ظاہری حالت سنبھالے ہوئے تھے، چنانچہ لوئس چہاردہم کی طاقت جب تک عیش پرستی اور پیرانہ سالی کے باعث زائل نہیں ہوگئی اسکی حالت ایک مثال تھی لیکن انگلستان کے چارلس دوم ہسپانیا کے فرڈینڈ ہفتم اور فرانس کے لوئس پانزدہم کے ایسے کمزور بادشاہوں نے وہ مطلق العنان اختیار جو خاص بادشاہ کے ساتھ مخصوص تھا، دوسروں کے قبضۂ قدرت میں دیدیا تھا۔ رعایا ہر جگہ ناقابل بیان مصیبت میں مبتلا ہوگئی تھی۔ مہذب یورپ پر اس مطلق العنانی کا جو اثر پڑا اسکو جو شخص پوری طرح سمجھنے کا خواہشمند ہو اُسے چاہئے کہ ہسپانیا اور آسٹریا کی ۱۵۴۰ء سے ۱۷۳۰ء تک کی معاشرتی تاریخ کا مطالعہ کرے۔

خوش قسمتی سے بہت سی مختلف روایات وتنظیمات عہد قدیم سے ایسی چلی آرہی تھیں جنھوں نے اس سیاسی اصول کی کامل اور مستقل ترقی کو روک دیا جو ایشیائی قوموں کے لئے تو موزوں ہوتا مگر یورپ کی حالت کے بالکل مخالف تھا۔ انگلستان میں خاندان اسٹوارٹ کے بادشاہوں نے دوبارہ تخت نشین ہونیکے بعد لوئیس چہاردہم کی نقل کرنا چاہی اور جیمس دوم نے نہ صرف پارلیمنٹ کے قدیمی اور مسلمہ حقوق پہ حملے کئے بلکہ

کلیسا کے جدید الترتیب نظام حکومت کو بھی نشانہ بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہت اُس کے خاندان سے نکل گئی اور زمانے کا سب سے بڑا مدبر اور حکمران ولیم (آرنج) تخت نشین کر دیا گیا۔ اسکی تخت نشینی سے زمانۂ حال کے نیابتی طریق کی بنیاد مضبوطی کے ساتھ قائم ہوگئی۔ انگلستان میں مطلق العنان شاہی کا دو مرتبہ خاتمہ ہونا اور اسکا قطعی طور پر پست جانا یورپ کے دوسرے ممالک میں اس تنظیم کیلئے

دیگر ممالک میں

فوراً ہی مہلک نہیں ثابت ہوا لیکن اُسکا اعتماد بالکل جاتا رہا اور تباہی کی طرف اُسکے قدم بڑھتے گئے۔ اٹھارھویں صدی کے وسیع الخیال فلسفے نے مطلق العنان شاہی کے اصول کو مسترد کر دیا۔ فریڈرک ثانی کی ذات نے اس فلسفے کو ایک ترقی کن سلطنت کے تخت پر پہنچا دیا۔ اُس نے اپنی تخت گاہ سے اس اصول کا اعلان کیا کہ بادشاہ نہ زمین کا مالک ہے نہ رعایا و سلطنت کا آقا ہے بلکہ "وہ سلطنت کا اولین خادم ہے"۔ مطلق العنان شاہی کا اصول انقلاب فرانس کے پہلے ہی بیجان ہو چکا تھا اور اُس طوفان کے مقابلے کی اُس میں طاقت نہیں رہی تھی۔ جب قوموں میں آزادی کا احساس پیدا ہوگیا تو یہ اصول مختلف رنگ اختیار کرنیکے بعد انجام کار میں بالکل فنا ہوگیا۔

روس

اب اس زمانے میں صرف روس میں مطلق العنان بادشاہی باقی رہگئی ہے۔[1] مشرق کا مذہبی احساس مغرب سے بالکل جداگانہ ہے۔ ملک بہت وسیع ہے اور تمدن کی ترقی نسبتاً کم ہے۔ ان اسباب سے وہاں ایک مضبوط مرکزی حکومت کی ضرورت ہے۔ نہایت اہم اصلاحات جیسے الگزنڈر دوم کا نیم غلاموں کو عطائے آزادی (۱۸۶۱ء) وغیرہ شہنشاہ کے قطعی حکم کے بغیر عمل نہیں آسکتی تھیں۔

[1] روسی توانین زار کو ایک آزاد اور مطلق العنان بادشاہ قرار دیتے ہیں اور علانیہ طور پر اُسکے اختیار کی بنا اس خدائی حکم پر رکھتے ہیں کہ خدا خود یہ حکم دیتا ہے کہ اسکے (بادشاہ کے) اعلیٰ اقتدار کے مطیع رہنا چاہیئے۔ کسی سزا کے خوف سے نہیں بلکہ ایک مذہبی فرض کے طور پر۔ وضع قانون کا اختیار خالصۃً زار کو حاصل ہے اگرچہ وہ بالعموم اپنی مجلس شاہی سے اس معاملے میں مشورہ کر لیتا ہے (مگر اب اس واحد مطلق العنان بادشاہی کا اور اسکے ساتھ نور زار کا بھی خاتمہ ہوگیا ہے۔ ؎ سر شب سر قتل و تاراج داشت۔ سحر گہ نہ تن سر نہ سر تاج داشت۔
بیک گردش چرخ نیلوفری۔ نہ نادر بجا ماند و نے نادری۔ اردو مترجم)

طبقہ امرا سے بہ مشکل یہ توقع کیجا سکتی تھی کہ وہ اسکا روا دار ہوتا اور آزاد اور تعلیم یافتہ شہریوں کا تو بہ حیثیت ایک سیاسی اور معاشری قوت کے کہیں وجود ہی نہیں تھا۔ ادنیٰ طبقے کے لوگوں میں اتنی قابلیت تو ہے کہ وہ اپنے دیہاتوں اور اپنی کاروباری انجمنوں میں اپنے معاملات کا انتظام کر سکیں، مگر سیاسیات اور قانون سازی میں کسی قسم کا اہم بالشان حصہ لینے کی اہلیت اُن میں نہیں ہے۔

---

# چودھواں باب

## (ق) آئینی شاہی

### ۱۔ آئینی شاہی کی ابتدا اور اُسکی اشاعت۔

شاہی آئینی کا عروج

آئینی شاہی نئے زمانے کا ثمرہ ہے مگر بقول مانٹسکیو اسکا تخم قدیم جرمانیا کے جنگلوں میں بویا گیا تھا سلطنت کی جس شکل کو اب ہم آئینی کہتے ہیں اسکے پیدا کرنیکی (اگرچہ نامکمل مگر) پہلی اہم کارروائی اُسوقت ہوئی جب جرمانی حکمرانوں نے رومی ملکوں پر تسلط حاصل کیا اور رومی سیاسی خیالات کا ازدواج جرمانی حقوق سے ہوا۔

اسکے بعد وہ دور آیا جب جاگیرداری شاہی کی بنا پڑی اور ایک پرزور طبقۂ اعیان نے شاہی طاقت کو محدود کردیا۔ سلطنت کا اتحاد جاتا رہا۔ رعایا کی بہبود کی طرف سے غفلت برتی جانے لگی اور بادشاہ میں اُسکے مرتبے کے موافق قوت نہیں رہی۔ بعدہٗ قومی اتحاد کے خیال نے پھر زور پکڑا اور جرمانیا کی سلطنت میں روما کے سیاسی اصول سے پھر تازگی اور قوت آگئی۔ قوموں میں بھی اسی زمانے میں تحرک پیدا ہوا مگر حکمرانوں نے سبقت کرکے مطلق العنانی کا گرز آہنی سنبھال لیا۔ مختلف طبقات نے ایک دوسرے کے ساتھ اور آپسمیں کشاکش شروع کردی۔ ازمنۂ وسطیٰ کا دور جس قدر ختم کے قریب ہوتا گیا اُسی قدر حکومت کے نظام جدید کا زمانہ نظر کے سامنے آتا گیا۔ اس دور کا ختم ہونا گویا ایک ہزار برس کی تاریخ کے دور کا ختم ہونا ہے۔ رومی جرمانی سیاسی زندگی نے تکمیل حاصل کی اور یہی یورپ کی اصلی سیاسی تہذیب ہے۔

۱۔ انگلستان میں

سلطنت کی اس شکل نے سب سے پہلے انگلستان میں نشو و نما حاصل کی جہاں اس میں ایک مدت سے بتدریج پختگی پیدا ہو رہی تھی۔ ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کے کسی ملک میں بادشاہ کو اتنی قوت نہیں حاصل رہی جتنی انگلستان میں تھی مگر اسکے ساتھ ہی کسی دوسری جگہ امرا اور عوام کے حقوق آزادی کی حفاظت بھی اس جرأت کے ساتھ نہیں کیگئی

اور نہ یہ آزادی حقوق کسی اور جگہ ایسی مستحکم بنیاد پر قائم ہوئی۔

انگلستان کے انقلابات

لیکن انقلاب کی آفت سے انگریز بھی محفوظ نہ رہے۔ دو بڑے انقلابوں نے عمارتِ سلطنت کی بنیاد تک ہلا دی۔ پہلا انقلاب تیرھویں صدی کے وسط کا وہ انقلاب تھا جب بیرنوں نے یہ کوشش کی تھی کہ حکومت کا کام بادشاہ کے ہاتھ سے نکالکر خود اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ ۱۲۵۸ء کے قوانین آکسفورڈ جنھیں سایمن ڈی مانتفرٹ نے بجبر ہنری سوم سے منظور کرایا تھا، انکا منشا یہی تھا۔ دوسرا انقلاب جو سترھویں صدی میں چارلس اور طویل العہد پارلیمنٹ کی مخاصمت سے پیدا ہوا، اس میں جمہوریت پسند پیورٹنوں کا ایک گروہ بادشاہ و امرا دونوں کو سیل فنا میں بہا لے گیا۔

لیکن ان دونوں موقعوں پر اس مرض کا دورہ اتنی دیر تک نہیں رہا کہ جسم عامہ کو مستقلاً کمزور کر دیتا۔ ظاہری علامات اگرچہ خراب معلوم ہوتی تھیں مگر اندرونی طور پر اس نے اتنا زور نہیں پکڑا تھا کہ قومی زندگی کی روش کو پھیر دیتا۔ دونوں مرتبہ انگلستان اس صدمے سے بہت جلد پنپ گیا۔ گزشتہ زمانے سے تاریخی ربط ٹوٹنے نہیں پایا اور قومی نشو و نما کی حالت میں ترتیب و تعدیل قائم رہی۔ اول الذکر انقلاب کے وقت سے شہروں کے قائم مقاموں کو پارلیمنٹ میں بلانیکی، جو ابتدا ہوئی اُسی سے زمانہ مابعد کے دار العوام کی بنا پڑی۔ دوسرے انقلاب کی تکمیل اس طرح ہوئی کہ ۱۶۸۹ء میں نئی آئینی شاہی قائم ہوگئی، اور اس وقت سے یہی آئینی طریقہ قومی تنظیم بن گیا ہے۔

آئینی شاہی کی خصوصیات

آئینی شاہی سلطنت کی تمام دوسری شکلوں کی جامع ہے۔ اس میں سب سے زیادہ تنوعات موجود ہیں اور اسکے ساتھ ہی مجموعے کے اتحاد و اتفاق کو نقصان نہیں پہنچا ہے۔ ایک طرف امرا کو اپنی قوت کے عمل میں لانیکا پورا موقع دیا گیا ہے، دوسری طرف رعایا کے جمہوری میلان پر بھی کوئی روک نہیں قائم کیگئی ہے۔ اس نظام میں قانون کا احترام گویا فوق انسانی حد تک پہنچا ہوا ہے لیکن بادشاہ کے ذریعے سے مختلف المقاصد جماعات اپنی اپنی حد پر قائم ہیں اور وہی تمام نظم سلطنت کا زندہ رئیس ہے۔

۱۶۸۸ء کے انقلاب کے نتائج

انگلستان میں آئینی شاہی نے ترقی کے مختلف مدارج طے کئے ہیں ان میں سے مدارج ذیل کا تعلق ولیم (آرنج) کے زمانے سے ہے:—

۱۔ مطلق العنان شاہی، خلاف آئین قرار دیگئی اور اس لئے مسترد کر دیگئی۔ وہ ایک

ایسی چیز سمجھی گئی جسکی روا داری ممکن نہ تھی اور جسکا مقابلہ کرنا جائز تھا۔

۲۔ پرانے خیال کے علمائے مذہب، اپنے پُراسرار خیالات کی وجہ سے حقوق شاہی کو ربانی وقعت دیتے تھے۔ اُنکے اس خیال کے خلاف یہ اعلان کر دیا گیا کہ یہ حقوق انسانی ہیں اور نظام سلطنت کے حدود کے اندر ہیں۔ ان حقوق کی وہی کیفیت ہے جو پارلیمنٹ میں امرا اور عوام کے قائم مقاموں کی ہے یا جو کیفیت ہر انگریز کی شخصی آزادی کی ہے۔

۳۔ اعلان حقوق (۱۶۸۹ء) نے باضابطہ طور پر پارلیمنٹ کے حقوق اور رعایا کی آزادیوں کو معین و مشخص کر کے اُنھیں محفوظ کر دیا۔ اس اعلان کو مسئلہ جانشینی کے ساتھ ملا دینے سے آئندہ بادشاہ کے لئے یہ غیر ممکن ہو گیا کہ وہ اُن حقوق اور آزادیوں کو علیحدہ کر سکے۔

۴۔ بادشاہ کی غیر ذمہ داری نظام سلطنت کا ایک اصول قرار دی گئی تھی مگر شاہان اسٹوارٹ کے اخراج سے صاف طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ جسوقت بادشاہ اور رعایا میں ناقابل اصلاح تصادم ہو جائے تو اس اصول میں استثنا بھی ممکن ہے۔

۵۔ وزرا پارلیمنٹ کے جوابدہ بنائے گئے، دار العوام کو اُنکے خلاف استغاثہ کرنیکا اور دار الامرا کو فیصلہ کرنیکا حق دیا گیا۔

پارلیمنٹ کے اور حقوق بھی تسلیم کئے گئے مثلاً:

۶۔ قانون سازی میں شرکت۔

۷۔ محصولوں کا منظور کرنا اور بادشاہ کے صرف خاص کا انتظام کرنا،

۸۔ عاملانہ عہدہ داروں کی نگرانی کرنا،

۹۔ عدالتی انتظام، جسکی بنا رعایا کی منتخب کردہ حلفی جوری پر رکھی گئی تھی، بالکل آزاد کر دیا گیا اور اسکے اختیارات بڑھا دئے گئے۔

۱۰۔ اخباروں اور سیاسی جلسوں کی آزادی منظور کی گئی تاکہ عام رائے حکومت کے کاموں کی نکتہ چینی کر سکے اور اُس پر قابو رکھ سکے۔

خاندان ہنوور کے بادشاہوں کے لئے اُن اصول اور اُنکے نتائج کا کما حقہا سمجھنا مشکل تھا مگر صورت حالات ایسی تھی کہ اُن کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ آزاد نظام سلطنت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ خود ہمارے زمانے میں شہزادہ البرٹ نے خاندان شاہی پر

یہ اثر ڈالا کہ وہ ہمہ تن آئینی طریق کا پابند رہے۔ اسکا اثر یہ ہوا کہ شاہی کی عزت و قوت میں کوئی فرق نہیں آیا اور خاندانی روایات سے جو مخالف اثر پیدا ہوتے تھے وہ رفع ہو گئے اور شاہی نے پوری قومی ہئیت اختیار کر لی۔

انگلستان کے بادشاہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ انکی ذات صرف انکی مرضی کی نہیں بلکہ سلطنت کی مرضی کی نمایندہ ہے۔ پس لامحالہ یہاں کے وزرا کا اثر امور مملکت میں براعظم کے وزرا سے بہت بڑھا ہوا ہے اور چونکہ انگلستان کے وزرا کا برسر اقتدار رہنا پارلیمنٹ بلکہ دارالعوام کے اعتماد پر مبنی ہے، اسلئے قوم کے قائم مقاموں کا اثر حکومت پر حاوی ہے۔ اس اعتبار سے انگریزی بادشاہی کو پارلیمنٹی یا جمہوری کہہ سکتے ہیں مگر تاج کا احترام جیسا قومی انگلستان میں ہے، ویسا کسی اور جگہ نہیں ہے اور طبقۂ امرا اور پارلیمنٹ کی قوت کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہو مگر پھر بھی انگلستان کا نظام سلطنت بدستور شاہی ہے۔[۱]

۲۔ فرانس کا ۱۷۹۱ء کا نظام سلطنت

آئینی شاہی کے قائم کرنیکی دوسری عظیم الشان کوشش فرانسیسیوں نے کی۔ ۱۷۹۱ء کے نظام سلطنت کے مرتب کرنیوالی جماعت کے اصول شاہی کے بجائے زیادہ تر جمہوری عمومیت کی طرف مائل تھے۔ اس جماعت پر انگریزی نظام حکومت کا اسقدر اثر نہیں تھا جس قدر روسو کے نظریئے کا اثر تھا کہ اقتدار شاہی رعایا اور دو طاقتوں کو حاصل ہے اور اسکے بعد ان پر امریکہ کے جمہوری نظام کا اثر تھا جس میں تین طاقتیں تھیں اور ہر طاقت دوسرے سے آزاد تھی مگر قوم کے اقتدار اعلیٰ کے زیر اثر سب متحد تھیں۔ پس ۱۷۹۱ء کا نظام سلطنت فی الحقیقت عمومی تھا۔ بادشاہی کا جز اس میں بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا تھا۔ بادشاہی گویا گزشتہ زمانے کی ایک یادگار ہو گئی تھی جس کے تمام لوازم کو انقلاب نے کلیۃً درہم برہم کر دیا تھا۔

پہلی شہنشاہی

نپولین نے شاہی اقتدار کو از سر نو زندہ کیا اور قوم جس قعر مذلت میں گر گئی تھی

---

[۱] مصنف نے اس موقع پر شاہی کی قوت کے ثابت کرنیکے لئے برک اور رابرٹ پیل کے اقتباسات دیئے تھے مگر انگریزی مترجم نے انھیں ترک کر دیا۔ اور حاشیہ پر یہ لکھا ہے کہ اس کتاب کے انگریزی ترجمے کے پڑھنے والوں کیلئے یہ ظاہر کرنا کچھ ضرور نہیں ہے کہ انگلستان کا نظام سلطنت ظاہرا شاہی ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ تاج انگلستان کے اصلی فرائض بیجٹ کے "نظام سلطنت انگلشیہ" سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

اُس سے اُسکو ابھارا۔ مرکزی اقتدار نے نپولین کے ہاتھ میں پہنچکر پھر ایک بار اجتماعی ہئیت اختیار کی۔ انقلاب کا اثر ابھی تازہ تھا اور یورپ کی جنگ میں قوم کی سربراہی کیلئے ایک زبردست آمر مطلق کی ضرورت تھی، لیکن نپولین کی قوتِ حکمرانی اسقدر قوی تھی کہ اسکے ہاتھ سے فرانس میں ایک نئی آئینی بادشاہی کا قائم ہونا مشکل تھا اور یہ زمانہ اس قسم کے تجربے کیلئے موزوں نہیں تھا۔ تاہم اُس نے بادشاہی کی کچھ ظاہری شکل پیدا کر دی تھی۔ اُس نے یہ تسلیم کیا کہ قوم ہی اُسکے اختیار کا سرچشمہ ہے اور تمام اہل فرانس کیلئے اُس نے عزت اور ترقی کی راہیں یکساں طور پر کھول دیں۔ اس نے سنیات میں ایک نیا طبقۂ امرا قائم کرنا چاہا، اُسکی نسبت اس نے یہ کہا تھا کہ جب تک کہ جمہور اقتدار شاہی کے رتبے کے حاصل کرنیکے قابل ہوں اُسوقت تک یہ طبقۂ امرا شاہی کی حفاظت کریگا[1]۔ اگر اُس کا خاندان کچھ مدت تک امن کے ساتھ قائم رہجاتا تو اُس نے جو بنیاد ڈالی تھی اُس پر ایک قومی اور آئینی بادشاہت قائم ہو جاتی مگر نپولین خود دوسری جماعتوں کے سیاسی حقوق کو اس وجہ سے ناپسند کرتا تھا کہ اُن سے اُسکے اختیار مطلق میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی، اسلئے اُسکے زوال کے ساتھ ہی اسکی تنظیمات بھی برباد ہوگئیں۔

سنہ ۱۸۱۴ کا منشور

لوئیس ہیژدہم کا منشور (مورخہ ۴ جون سنہ ۱۸۱۴) فی الاصل ایک طرح کی مفاہمت تھی۔ قدیم شاہی خاندان جلاوطنی سے واپس آگیا تھا۔ رعایا انقلاب اور نپولین کی حکومت کا مشاہدہ کرچکی تھی پس یہ گویا قدیم شاہی اور جدید اصول حکمرانی کے دعووں یعنی حق موروثی اور انقلاب کے درمیان ایک مصالحت تھی۔ ظاہری حیثیت سے یہ بادشاہ کی ایک نوازش تھی اور کلیتہً اُسی کے اختیار پر مبنی تھی۔ اسکے سوا اس میں اور بھی متضاد باتیں جمع تھیں، تاہم فرانس میں اس سے پہلے آئینی بادشاہت کے قیام کے لئے جو کوششیں ہوئی تھیں اُن سب سے یہ منشور بہتر تھا۔

اگرچہ ظاہرا انگریزی نظام سلطنت کی نقل کی گئی تھی مگر باطناً دونوں میں بڑا فرق تھا۔ انگلستان کے بادشاہ کے بہ نسبت فرانس کے بادشاہ کو زیادہ اختیارات دئے گئے تھے

[1] مقابلہ کرو مقالہ ۲۔ باب ۱۰۔ نپولین کی فوجی سلطنت کا بہترین بیان "خیالات نپولینی" میں پایا جاتا ہے مگر یہ تخیل عملی صورت میں کبھی نہ آیا۔

یا یوں کہئے کہ چونکہ یہ منشور خاص بادشاہ کی طرف سے شائع ہوا تھا اس لئے
اس میں بادشاہ کے اختیارات نسبتاً کم محدود تھے لیکن انگلستان کی بادشاہت
کے بہ نسبت فرانس کی بادشاہت محفوظ بھی کم تھی۔ صرف اس وجہ سے نہیں کہ
فرانس کی رعایا کے مزاج میں تغیر و تلون زیادہ تھا بلکہ اس وجہ سے بھی کہ انقلاب
نے طبقۂ امرا کو بالکل تباہ کردیا تھا اور تمام قوم کو عمومی خیال و رائے کا عادی بنا دیا تھا۔

امرا جو بادشاہ کے ساتھ قانون سازی کے حق میں شریک کئے گئے تھے،
اور سیاسی جرائم کے لئے وہ عدالتِ اعلیٰ قرار پائے تھے وہ صحیح معنی میں قومی جماعت
سمجھے گئے تھے، جن سے گزشتہ کی یادگار اور آئندہ کے توقعات وابستہ تھے،
گویا وہ قدیم و جدید دور کے جامع تھے، گر فی الحقیقت نپولین کے وقت کے
نئے امرا زیادہ تر نظر انداز کردیئے گئے تھے اور قدیم امرا کے پریشان حال خاندانوں
کے ساتھ بہت ہی فیاضانہ برتاؤ کیا گیا تھا۔ موروثی امرا انگلستان کے دارالامرا کے
مقابلے میں بہت پست تھے اور وہ ہرگز مستقل اور صحیح معنوں میں قومی جماعت
نہیں خیال کئے جا سکتے تھے۔ ایوان مبعوثین کا منشا یہ تھا کہ وہ قدیم زمانے کی "میدان مارس" عہ
پر منعقد ہونیوالی مجلسوں نیز اسٹیٹس جنرل کے طبقۂ سوم کا قائم مقام ہو لیکن فی الحقیقت
یہ دولتمندوں کی ایک خالص حکومت تھی اور سرکاری عمال کے حسب منشا اس سے کام لینا
مقصود تھا۔ عام رعایا جن میں بکثرت متمول اور تعلیم یافتہ اشخاص موجود تھے اور جس نے
دور انقلاب میں کارہائے نمایاں انجام دئے تھے اسے نہ رائے دہی کا حق تھا اور نہ
اس کے افراد منتخب ہو سکتے تھے، انقلاب میں کسانوں کو آزادی ملکیت اور سیاسی حقوق
تک حاصل ہوگئے تھے مگر وہ بھی حق انتخاب سے خارج رکھے گئے اور نیچے طبقے والوں کا
تو بالکل خیال ہی نہیں کیا گیا۔ پس جمہور سے (جو اب فرانس میں ایک زبردست سیاسی طاقت
بن گئے تھے) یہ توقع نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ ایک ایسے نظام سلطنت کی تائید کریں گے
جس میں انھیں نیابت کا مطلق حق نہ دیا گیا ہو۔

انقلاب سے دو متضاد میلانوں کو تقویت ہوگئی تھی۔ ایک طرف مرکزیت کی،

عہ پارس (پیرس) میں ایک میدان "شین ڈ مارس" ( Cham de Mars ) (اردو مترجم)

خواہش تھی اور دوسری طرف عمومیت کی توسیع۔ اگر یہ دونوں میلان انتہا تک پہنچائے جاتے تو ایک کا انجام مطلق العنان بادشاہی پر ہوتا اور دوسرے کا انقلابی ابتری پر۔ منشور کا منشا یہ تھا کہ اول الذکر میلان کو تقویت دے اور اُسے قابو میں لائے اور اسطرح ثانی الذکر میلان کو روک دے[1]

۱۸۳۰ء کا انقلاب

چارلس دہم کی مطلق العنانی اور انقلابی اخباروں کے باعث پہلی مرتبہ جو طوفان برپا ہوا اُس میں یہ منشور بچ گیا۔ لوئیس فلپ کے فریق اور جولائی کے انقلاب (سنہ ۱۸۳۰ء) والوں نے یہ شور مچایا کہ منشور پر حقیقتاً عملدر آمد ہونا چاہئیے مگر فرق صرف اتنا ہوا کہ امرا کا منصب موروثی ہونیکے بجائے حین حیات کے لئے کردیا گیا اور دار المبعوثین میں اگرچہ دولتمندوں کا غلبہ رہا مگر اُسکے انتخاب کنندوں میں وسعت کردی گئی[الف]

۱۸۴۸ء کا انقلاب

اس کے بعد ایک دوسرا انقلاب پیش آیا اور کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ یہ انقلاب اس زور کا ہوگا۔

فروری ۱۸۴۸ء میں تمام نظام سلطنت ایک دن میں الٹ دیا گیا قلیل التعداد جماعت نے ایسی جانبازی دکھائی کہ کثیر التعداد جماعت مبہوت وحیران ہوکر رہ گئی اور

---

[1] ڈ توک ول "عمومیت امریکہ میں" انگریزی ترجمہ از ریو، جلد ۱ صفحہ ۹۳): انقلاب فرانس دو مخالف جذبات ایک دوسرے کے خلاف روش پر چل رہے تھے، اور انھیں ہرگز خلط ملط نہ کرنا چاہئیے۔ ان میں سے ایک تو حریت کا طرفدار تھا اور دوسرا مطلق العنانی کا ....... انقلاب نے خود کیشاہی اور اس کے ساتھ ہی صوبجاتی تنظیمات کا دشمن ظاہر کیا۔ اس نے اپنی بلا امتیاز نفرت سے ان تمام چیزوں کو ایک ہی میں خلط ملط کردیا جو اس سے قبل موجود تھیں۔ اس میں مطلق العنانی اختیار اور اسکی خرابیوں کی روک سب داخل تھے اور اس انقلاب کا میلان یہ تھا کہ وہ ایک ساتھ چیزوں کو تہ و بالا بھی کرنا چاہتا تھا اور مرکزیت بھی قائم کیا چاہتا تھا۔ فرانسیسی انقلاب کی دُہری نوعیت ایک واقعہ ہے جس سے محبان مطلق العنانی نے خوب ہی کام نکالا ہے۔

(الف) رائے دہی کی شرط کیلئے تین سو فرانک کے بجائے دوسو فرانک کی براہ راست محصول کی ادائی کردیگئی، اُسکے بعد بھی انتخاب کنندوں کی تعداد پانچ لاکھ سے کم رہی اور خاندان آرلینس کی ناکامی کے اسباب میں سے ایک نمایاں سبب محدود حق رائے دہی بھی تھا۔

اس سے کچھ بن نہ پڑا۔ جو نظام سلطنت اس طرح اُلٹا گیا وہ اس سے بہتر تھا جو اُسکے بعد قائم ہوا اور اس میں ہر اعتبار سے ترقی کی گنجائش تھی یہ دوسرا موقع تھا کہ عوام نے فرانس میں حکومت کرنیکی کوشش کی۔

انقلاب اول کی نیابتی عمومیت پھر قائم کیگئی اور ایک شخص اس جمہوری سلطنت کا صدر (پریسیڈنٹ) مقرر کیا گیا لیکن رئیس کے اختیارات مجلس قومی کے ذریعے سے محصور و محدود کر دئے گئے تھے مگر خود مجلس قومی میں سخت تفرقہ پڑا ہوا تھا اور وہ اپنی قوت کو بیکار مباحثات میں ضائع کر رہی تھی۔ عوام کا میلان طبعی پھر بادشاہت کی طرف ہوگیا اور ایک دوسرا نپولین اس سلطنت عمومی کا فاتح اور اسکا جانشین بن گیا۔ لوئس نپولین نے تمام نظم و نسق پر قبضہ کرلیا اور اہل فرانس کے حصہ کثیر نے اسکی اس کارروائی سے موافقت کرلی اور اس طرح یہ کارروائی جائز قرار پاگئی۔

دوسری شہنشاہی

نئی شہنشاہی کے، نظام سلطنت (۱۸۵۲ء) نے انگریزی سلطنت کے بجائے رومی سلطنت کی یاد تازہ کردی۔ درحقیقت نپولین کے خیالات بالکل رومی طرز کے تھے اور اس وجہ سے فرانس کے رومی الخیال لوگوں نے اُسے پسند کیا[1]۔ تمام سیاسی طاقت کا منبع رعایا قرار دیدی گئی تھی اور اسی کی عظمت و جلال کی اطاعت کیجاتی تھی۔ نظام سلطنت اسکی رضامندی کے تابع تھا۔ جماعت واضع قانون کا انحصار اسی کی منظوری پر تھا۔ یہانتک کہ شہنشاہی اختیار بھی اُسی کی مرضی سے مستخرج تھا اور شہنشاہ رائے عامہ کا جوابدہ تھا[2]۔ عمومی مساوات جسے عوام اس درجہ عزیز رکھتے تھے، وہ بلا استثنا ہر شخص کو رائے دہی کا اختیار دیکر بلے بحث و تکرار تسلیم کرلیگئی تھی۔ اسی وسیع بنیاد پر شہنشاہی قوت و جلالت کی عمارت بلند کی گئی تھی۔ قانون کا پیش کرنا، سیاسیات، امور خارجہ، فوج اور عمال سب کی نگرانی شہنشاہ کے ہاتھ میں دیدیگئی تھی۔ یہانتک کہ مجلس سلطنت کے ارکان کو بھی وہ اپنی مرضی سے علیحدہ کرسکتا تھا۔ نظام سلطنت میں صرف دو اہم طاقتیں تسلیم کیگئی تھیں۔ ایک رعایا کی کثرت رائے، دوسرے شہنشاہ۔

---

[1] ۱۸۵۲ء کا نظام سلطنت سال ہفتم (۱۸۰۰ء) کے نپولینی نظام سلطنت سے ظاہری مشابہت رکھتا تھا، مگر دونوں کے اختلافات واقعتاً قابل لحاظ تھے۔

[2] نپولین سوم کا لقب "بعنایت خدا و رضائے قوم شہنشاہ فرانسیسیاں" تھا۔

ان دونوں کے درمیان جو کچھ تھا وہ آزادی کا محض ایک سایہ تھا۔ وزرا صرف شہنشاہ کے جوابدہ تھے مگر اُن میں سے بعض محض فصیح البیان مقرر تھے اور اُن کے تقرر سے غرض یہ تھی کہ وہ ایوان مبعوثین میں حکومت کی حمایت کریں۔ ان لوگوں کا اثر بعض وقت نہ صرف نمایندگان قوم کے لیئے بلکہ خود شہنشاہ کیلئے خطرناک بن جاتا تھا۔ جماعت واضع قانون کی طاقت مثبت ہونیکے بجائے زیادہ تر منفی تھی۔ وہ کسی مفر یا ناواجب قانون کو درست نہیں کرسکتی تھی، البتہ اُسے نامنظور کرسکتی تھی۔ اُسے خود کسی قانون کے پیش کرنیکا اختیار نہیں تھا اور وہ اپنے مجوزہ تغیرات کی نسبت کمیشن کے ذریعے سے مجلس سلطنت سے مبادلۂ خیالات کرسکتی تھی۔ سینات کی بڑی غرض یہ قرار دی گئی تھی کہ وہ عام آزادی کی حمایت کریگی، نظام سلطنت کو قائم رکھے گی اور مستثنیٰ حالتوں میں اپنی جانب سے اصلاحات تجویز کریگی، لیکن حقیقتاً یہ مجلس امرا کی ایک جماعت تھی اور اسکے ارکان بوجوہ مجبور تھے کہ شہنشاہ سے وابستہ رہیں۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ شہنشاہی سے اُنھیں یہ اعزاز حاصل ہوا تھا اور کچھ فرانس کے معاشرتی اور فریقانہ تعلق کی وجہ سے۔ حکومت کا خاص مقصد یہ تھا کہ شہنشاہ اور عوام میں ہم آہنگی قائم رہے اور اس لئے مخالفین کو دارالمبعوثین و پیرس دونوں جگہ بہت ہی خفیف آزادی دی گئی تھی۔[۱۲]

اس خود مختارانہ نظام سلطنت سے عام آزادی کی نئی خواہش کو تسلی نہیں ہوئی۔ نپولین سوم کو مجبوراً ایسی مراعات کرنا پڑی جس سے آئینی بادشاہت کی طرف قدم بڑھے۔[۱۳] سینات کے ایک فیصلے (دسمبر ۱۸۶۹ء) کے بموجب یہ حکم دیا گیا کہ ہر دو ایوانہائے مجلس کو اپنی طرف سے قانون پیش کرنیکا حق ہے۔ وزرا ان مجلسوں کے رکن ہوسکتے ہیں اور انھیں سینات کے سامنے جوابدہ ہونا پڑیگا۔ یہ تغیرات رعایا کے سامنے پیش کئے گئے اور ۲۰ اپریل ۱۸۷۰ء کے فیصلۂ عام میں (۱۵۳۸۸۲۵) رایوں کے مقابلے میں (۷،۳۵۰۱۴۲) رایوں سے منظور ہو گئے۔

---

[۱۲] لوئس نپولین نے "تفکرات سیاسیات" میں اپنے کچھ خیالات ۱۸۳۲ء سے قریب زمانے میں قلمبند کئے تھے اس میں اس نے فرانسیسی نظام سلطنت کا ایک خاکہ بھی کھینچا تھا۔ اس خاکہ کو ۱۸۵۲ء کے نظام سلطنت سے وہی نسبت ہے جو نوجوانی کے خیالات کو سن رشد کے پختہ خیالات کے ساتھ ہوتا ہے۔

[۱۳] ان رعایتوں کا آغاز ۱۹ جنوری ۲۵ فروری اور ۱۴ اور ۲۳ مارچ ۱۸۶۷ء کے احکام سے ہوا۔

سنہ ۱۸۷۰ کا انقلاب

لیکن جرمانیا کی جنگ سے نپولین کی حکمت عملی اور فرانسیسی فوج کو جو شکست نصیب ہوئی اُنکی وجہ سے یہ مراعات اس نازک موقع پر نظام سلطنت کو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

پیرس (۴ ستمبر ۱۸۷۰ء) کے ایک نئے انقلاب نے شہنشاہی کو منسوخ کر کے پھر جمہوریت کا تجربہ کرنیکی کوشش کی۔

۴۔ روائی ممالک

فرانس میں انقلاب کے دوران میں اور اُسکے بعد جن تغیرات کا تجربہ ہوا اُنکا نہایت اہم اثر دوسرے ممالک اور خاصکر ان ممالک پر پڑا جو روما کے اثر میں رہ چکے تھے۔ اطالیہ میں فرانسیسی فاتحوں کی تلوار نے اپنے ملک کے نمونے پر جمہوری سلطنتیں قائم کیں اور بعد میں نپولین اول نے اطالیہ اور ہسپانیہ دونوں ملکوں میں ماتحت سلطنتیں قائم کیں جو فرانسیسی شہنشاہی کی نقل تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا جدید یورپ کے نظام سلطنت کیلئے احکام پیرس سے صادر ہونگے مگر نپولین کے زوال کے ساتھ ہی اُنکی اُن قلیل الحیات سلطنتوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

آئینی شاہی کے نشو و نما کے اعتبار سے سسلی اور ہسپانیہ کے وہ نظامہائے سلطنت زیادہ اہم تھے جو ۱۸۱۲ء میں شائع کئے گئے تھے مگر یہ نظام سلطنت بہت ہی تھوڑے زمانے تک رہے

(۱) سسلی

جزیرہ سسلی کا نظام سلطنت زیادہ تر لارڈ ولیم بنٹنک کا تیار کیا ہوا تھا اور اس لئے وہ بالطبع انگلستان کے نمونے پر بنا تھا مگر اسکے ساتھ ہی نورمانی زمانے کی آئینی روایات کا بھی خیال رکھا گیا تھا اور تقسیم اختیارات کے جدید اصول انگلستان کی بہ نسبت زیادہ واضح طور پر تسلیم کئے گئے تھے۔ قانون سازی کا اختیار پارلیمنٹ کو دیا گیا تھا لیکن پارلیمنٹ کے صرف دو ایوان تھے۔ بادشاہ پارلیمنٹ میں شامل نہیں تھا۔ وہ پارلیمنٹ سے ایک جداگانہ اور خارجی طاقت کے طور پر قوانین کو منظور کرتا تھا۔ دارالامرا سسلی کے بیرنوں اور مقتدایان دین پر مشتمل تھا۔ دنیاوی امرا موروثی تھے مگر بادشاہ ایسے لوگوں میں سے نئے امیر بنا سکتا تھا جن کی خالص آمدنی چھ ہزار فرانک ہو۔ دارالعوام میں رعایا کے قائم مقام بھی تھے اور رائے دہی یا انتخاب کے لئے بہت قلیل آمدنی کافی سمجھی گئی تھی۔ انتظامی اختیارات بادشاہ کو حاصل تھے مگر اسکے وزرا اور مشیران خاص ان اختیارات کو عمل میں لانیکے لئے پارلیمنٹ کو جوابدہ تھے۔ تمام اہم معاملات میں بادشاہ اپنی مجلس خاص سے

مشورہ لینے کیلئے مجبور تھا اور بعض معاملات میں اُسے پارلیمنٹ کی منظوری بھی لینا پڑتی تھی، مثلاً سسلی کے اندر فوجوں کا لانا، غیر ملکی عمال کا تقرر، حکام کے لئے عہدوں کا قیام یا سیاسی خدمات کے وظائف کا عطا کرنا۔

عدالتی اختیارات، بادشاہ کے نام سے عمل میں آتے تھے مگر اُنکے عمل میں لانیوالے وہ حکام ہوتے تھے جو از روئے قانون مقرر کئے جاتے تھے ہر باشندہ سسلی کو یہ اختیار تھا کہ وہ خلاف قانون روک ٹوک کی مقاومت کر سکے۔ مذہبی تصانیف کے سوا اور تصانیف سے احتساب اُٹھا دیا گیا تھا، جاگیرداری حقوق دبا دیئے گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ یہ نظام سلطنت انگریزی طریقوں کی نقل تھا۔ اُسی میں ۱۷۹۱ء کے فرانسیسی نظام سلطنت کے نظریات کے کچھ اجزا بھی شامل کر دیئے گئے تھے۔ ان دونوں نظامہائے سلطنت میں جمہوریت کی شان غالب تھی مگر سسلی میں شاہی روایات کے مقابلے میں یہ شان زیادہ نمایاں اس وجہ سے نظر آتی تھی کہ بوربونی بادشاہوں کا مطلق العنان دربار ہی نظام سلطنت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسکے ساتھ ہی پادریوں اور جیکوبین طریق والوں میں جنگ وجدل جنوبی طبایع کی پوری سرگرمی سے جاری تھی۔ نیلپز جب بادشاہ کو واپس ملگیا تو اُسے اتنی طاقت حاصل ہوگئی کہ جس نظام سلطنت کے برقرار رکھنے کا اس نے حلف اٹھایا تھا اُسے منسوخ کر کے اُسکے بجائے مطلق العنان حکومت قائم کر دی لیکن انگلستان کی سیاسی ہیئتوں کو فرانسیسی انقلاب کے اصول سے ملا کر جو ایک نیا نظام سلطنت قائم کیا گیا تھا وہ زمانہ آیندہ کی بہت سی اسی قسم کی کوششوں کے لئے نمونے کا کام دیتا رہا۔

(۲) ہسپانیہ

آئینی سلطنت اور تین قوتوں کی تقسیم کے متعلق اس قسم کے نظریات کے اثر سے وہ نہایت مکمل نظام حکومت تیار ہوا جسے ہسپانیہ کے متولیوں نے ۱۲ مارچ ۱۸۱۳ء کو شایع کیا تھا، جب کہ بادشاہ قید میں تھا اور ملک کے بہت بڑے حصے پر فرانسیسی متصرف تھے۔ اس نظام سلطنت میں ۱۷۹۱ء کا فرانسیسی نظام سلطنت پیش نظر رکھا گیا تھا اور یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اقتدار اعلیٰ رعایا کو حاصل ہے (دفعہ ۳) مگر اس کے ساتھ ہی بادشاہ کو بہت وسیع اختیارات دئے گئے تھے۔ وضع قوانین کے اختیارات، پارلیمنٹ اور بادشاہ کو اشتراکاً تفویض تھے (دفعہ ۱۵) اور بادشاہ انصاف کی نگرانی کا بھی ذمہ دار تھا (دفعہ ۱۷)، لیکن یہ بھی شرط تھی کہ اگر کوئی قانون دو مرتبہ پارلیمنٹ میں

منظور ہو جائے تو بادشاہ پر اُسکی منظوری لازم ہو جائیگی۔ ہسپانیہ کا نظام سلطنت حقیقتاً انگریزی نظام سلطنت سے بہت مختلف تھا کیونکہ اُس میں دار الامرا کا وجود نہیں تھا اور براہ راست قومی قائم مقاموں کی مجلس سے واسطہ تھا جسے کورٹیس کہتے تھے۔ اس نظام سلطنت میں بہت سے نقائص تھے اور رعایا نے اُسے خوشی کے ساتھ قبول بھی نہیں کیا تھا مگر جب واپس شدہ بادشاہ فرڈیننڈ ہفتم نے اُسے محض اپنی رائے سے (۴۔ مئی ۱۸۱۴ء کو) رد کر دیا تو پھر وہ عام طور پر پسند کیا جانے لگا اور (۱۸۲۰ء اور ۱۸۳۶ء میں) کئی مرتبہ اُسے بزور قائم کرنیکی کوششیں کی گئیں۔

۱۸۳۴ء کا ایسٹاٹوٹو رے آل (شاہی نظام سلطنت) جس نے ہسپانیہ میں نیا نیا حکومت قائم کی، رعایا کو مطمئن کرنیکے لئے ناکافی ثابت ہوا۔ ۱۸۳۶ء میں متولیہ ملکہ کرسٹینا مجبور کی گئی کہ وہ ۱۸۱۲ء کے نظام سلطنت کو تسلیم کرے اور دوسرے سال ترقی پسند فریق کے دباؤ سے ایک نئے نظام سلطنت کی باقاعدہ منظوری حاصل کی گئی جسکی بنیاد ۱۸۱۲ء کے نظام سلطنت پر رکھی گئی تھی اور ایسٹاٹوٹو رے آل کے مطابق اُس میں کسی قدر ترمیم کر دی گئی تھی۔ اس میں یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ بادشاہ قانون کے منظور کرنیکے متعلق بلاحصر اختیار حاصل ہے۔ دو ایوان قائم کئے گئے ایک ایوان امرا اور دوسرا ایوان مبعوثین۔ اعتدال پسند فریق نے ۱۸۴۵ء میں اس پر نظر ثانی کی اور اُسے ۱۸۳۰ء کے فرانسیسی منشور سے زیادہ قریب کر دیا۔

لیکن اس سے بھی آئینی کشمکش کا خاتمہ نہیں ہوا اور ملک میں سیاسی مد و جزر جاری رہا۔ کبھی مذہبی فریق کو غلبہ ہو جاتا، کبھی انتہا پسند، طوائف الملوکی برپا کر دیتے، کبھی درباری، سازشوں میں سرگرم ہوتے اور کبھی فوج کو تسلط کامل حاصل ہو جاتا۔ متعصب ملکہ ایزابیلا کی بدنظمی کے باعث ۱۸۶۸ء میں ایک نیا انقلاب پیش آیا جس میں بوربونی خاندان اور یسوعی فرقے والے دونوں نکال دیئے گئے۔ ایک مدت تک شاہی پسند فریق لاحاصل طور پر کسی بادشاہ کی جستجو میں سرگرداں رہا۔ یہاں تک کہ ۱۸۷۰ء میں اطالوی بادشاہ وکٹر امانوئل کے دوسرے بیٹے ڈیوک اؤسٹا نے اماڈیو اول کے لقب سے تاج قبول کر لیا۔ ایک زمانے تک حالات آئینی حکومت کے موافق معلوم ہوتے تھے مگر زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ مسلسل سازشوں کے باعث بادشاہ کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ اور وہ

خود ہی (۱۱ر فروری ۱۸۷۳ء کو) تخت سے دست بردار ہوگیا۔ اب ضرورت سے مجبور ہوکر لوگوں نے جمہوریہ کا اعلان کر دیا مگر اُسکے بعد ہی فوجی فریق نے حکومت پر قبضہ کرلیا اور آئینی بادشاہت کو دوبارہ قائم کرنیکے لئے راستہ صاف کر دیا اور یکم جنوری ۱۸۷۵ء کو نوعمر الفانسو دوازدہم بادشاہ مشتہر کیا گیا۔ اس دوران میں خاندان بوربون کا دعویدار ڈون کارلوس پادریوں اور حق موروثی کے طرف داروں کی مدد سے شمالی ہسپانیہ اور خاصکر باسک کے پہاڑی خطے میں اپنے خاندانی حقوق کے ثابت کرنیکے لئے کوشش کرتا رہا مگر نتیجہ اسکے سوا کچھ نہ ہوا کہ رعایا کی مصیبت اور پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔ ۱۸۷۶ء میں ایک نئے نظام سلطنت کے تیار کرنیکے لئے ایک کورٹیس طلب کی گئی اور شاہ الفانسو نے اس نظام سلطنت کے متعلق ۳۰ر جون کو اپنی منظوری صادر کر دی۔ اس نظام سلطنت کی رو سے قوم کی نیابت کے لئے (قانون انتخاب مصدرہ ۸ر فروری ۱۸۷۷ء کے موافق) ایک دار الامرا کی اور (قانون انتخاب مصدرہ ۸ر فروری ۱۸۷۸ء کے موافق) ایک دار المبعوثین کی بنا پڑی۔ دار الامرا کے کچھ ارکان تو استحقاقاً مقرر ہوئے تھے، کچھ بادشاہ کے نامزد کئے ہوئے تھے اور کچھ منتخب شدہ۔

(۳) پرتگال

اسپین کے ۱۸۱۲ء کے نظام سلطنت کی نقل پرتگال کے ۱۸۲۲ء والے نظام سلطنت میں کیگئی، مگر یہ نظام سلطنت کبھی پوری طرح مسلم نہیں ہوا۔ ۱۸۲۶ء میں ڈون پیڈرو نے اپنی بیٹی ڈونا ماریا ڈوگلوریا کے حق کو مستحکم کرنیکے لئے ایک نیا نظام سلطنت تیار کیا۔ اس میں شاہی اصول کی زیادہ خوبی کے ساتھ حفاظت کی گئی تھی۔ نیز انگلستان اور منشور فرانس کی تقلید میں دار المبعوثین کے ساتھ موروثی اور یا دوام الحیات امرا کا بھی ایک ایوان قائم کر دیا گیا تھا۔ اس نظام سلطنت میں چار قوتیں تسلیم کی گئی تھیں۔ (۱) قانون سازی۔ اسکا تعلق بہ منظوری بادشاہ پارلیمنٹ سے تھا (۲) قیام توازن۔ قوم کے سرپرست اعلیٰ ہونیکے لحاظ سے یہ قوت بادشاہ کو حاصل تھی کہ وہ تمام سیاسی طاقتوں میں توازن اور یکجہتی قائم رکھے (۳) اختیارات عاملانہ۔ اسکا تعلق بادشاہ و وزرا سے تھا (۴) اختیار عدالتی۔ یہ اختیار آزاد عدالتوں کو تفویض کیا گیا تھا۔

ڈون میگل اور مطلق العنانوں کی فتح کے بعد بھی (جو کسی نظام سلطنت سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتے تھے) دو فریق مختلف کامیابیوں کے ساتھ اپنی جدوجہد میں سرگرم رہے۔

ایک عمومیت پسندوں کا فریق تھا جو ۱۸۲۲ء کے نظام سلطنت کا خواہاں تھا اور دوسرا "منشوری" تھا جو ۱۸۲۶ء کے منشور کا طالب تھا۔ ۱۸۳۹ء میں اسی آخر الذکر نظام سلطنت پر نظر ثانی کی گئی اور موروثی امارت اور مجلس سلطنت منسوخ کر دی گئیں۔ عام رعایا نے ان تغیرات میں بہت کم حصہ لیا۔ تاہم موجودہ خاندان کوبرگ کے تحت میں ہسپانیہ کے بہ نسبت پرتگال میں سیاسی حالت نے زیادہ کامیابی اور امن و امان کے ساتھ ترقی حاصل کی ہے۔

(۴) برازیل — آئینی شاہی پرتگال سے برازیل پہنچی جو ۱۸۲۲ء میں اپنے وطن مادری (یعنی امریکہ) سے آزاد ہو گیا تھا اور وہاں پہنچکر اُسے اس قسم کی جدوجہد اور ایسے ہی نشیب و فراز کا سامنا ہوا اگر یورپ ہی کے مانند اُسے ترقی بھی ہوتی گئی (۱۸۸۹ء میں شاہی کا خاتمہ ہو گیا)

(۵) اطالیہ — اطالیہ کو مطلق العنان حکومت کی ذلت سے نکالنے کے لئے لگاتار جدوجہد کی ضرورت ہوئی۔ اگرچہ نپولین کی قائم کردہ اٹلی اور نیلپز کی بادشاہتیں محدود و شخصی سلطنتوں سے زاید نہیں تھیں مگر بوربونی اور ہابس برگی شہزادے جب دوبارہ تخت نشین ہوئے تو انکی مطلق العنانی رعایا کی طاقتِ برداشت سے باہر ہو گئی۔ اس بازگشتِ ظلم کے خلاف خفیہ سازشیں اور علانیہ بغاوتیں ہونے لگیں اور انکا انسداد صرف غیر ملکی فوجوں کے ذریعے سے ہوا۔ جب ۱۸۲۰ء میں شاہ نیلپز اس امر پر راضی ہوا کہ وہ ہسپانیہ کا ۱۸۱۲ء والا نظام سلطنت اپنے ملک میں نافذ کر دیگا تو فوراً ہی آسٹروی فوجوں نے دخل دیکر پرانی مطلق العنانی کو پھر قائم کر دیا۔ ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۰ء کے درمیانی زمانے کی تحریکیں بھی بیکار ثابت ہوئیں کیونکہ آئینی حکومت قائم کرنیکی جب کوئی کوشش کیجاتی تھی تو آسٹریا کی زبردست قوت اسکے دبانے کو تیار رہتی تھی اور آسٹریا ہی کی قوت پر حکمران خاندان استبداد کے لئے نظر ڈالتے تھے۔

۱۸۴۰ء کے بعد یہ ہوا کہ اصلاح کے جوش کے ساتھ غیر ملکی حکومت سے آزاد ہو جانیکی خواہش بھی شامل ہو گئی اور اس طرح اس تحریک کو بہت تقویت حاصل ہو گئی۔ ۱۸۴۷ء میں تمام اٹلی میں جوش برپا ہو گیا اور بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس تحریک کو نئے پوپ پائس نہم کی تائید بھی حاصل ہو گئی ہے۔ پیرس میں انقلاب کے شیوع کے قبل ہی نیلپز میں فرڈیننڈ دوم اور پیڈمونٹ میں چارلس البرٹ آئینی سلطنت قائم کرنے پہ مجبور کیے گئے،

لیکن فرڈیننڈ نے مناسب موقع حاصل ہوتے ہی اس کام کو پلٹ دیا۔ حالانکہ اُس کے برقرار رکھنے کے لئے وہ تثلیث مقدس کے نام سے حلف اُٹھا چکا تھا۔ اس متواتر وعدہ خلافی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اسکے بیٹے فرانسس ثانی کو ۱۸۶۰ء میں ضرورت نے مجبور کیا کہ وہ آئینی سلطنت دوبارہ قائم کرے تو رعایا نے اُس پر اعتماد کرنے سے انکار کر دیا اور اس خاندان ہی کو ملک سے نکال باہر کیا۔

پیڈمونٹ میں صورت معاملات اس سے مختلف رہی۔ خاندان سوائے غیرمعمولی استقلال کے ساتھ ۴ مارچ ۱۸۴۸ء کے نظام سلطنت پر قائم رہا جسے چارلس البرٹ نے ۱۸۳۰ء کے فرانسیسی منشور کے موافق منظور کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ چارلس البرٹ کو اس مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی کہ کل اٹلی کو اپنے زیرنگیں ایک سلطنت بنا لیتا کیونکہ راڈٹسکی کی فتوحات نے اسکی اس حوصلہ مندی کو روک دیا اور غالباً اس جزیرہ نما کو قبل از وقت عمومیت کے طوفان سے بھی بچا لیا۔ لیکن اس بازگشت کے زمانے میں بھی وکٹر امانوئل اپنے باپ کے وعدے پر ثابت قدم رہا۔ اسکی ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۰ء کی حیرت انگیز کامیابیوں کی بڑی وجہ یہی تھی کہ رعایا کو اس پر یہ بھروسا تھا کہ وہ صدق دل سے نظام سلطنت اور قوم کا بہی خواہ ہے، دوسری وجہ یہ تھی کہ اس نے ایک بہت بڑے مدبر کاؤور کو اپنے کاموں کا انصرام سپرد کر دیا تھا۔ فرانسیسیوں کی مدد سے اہل آسٹریا لمبارڈی سے خارج کر دئے گئے اور اس نئی قومی بادشاہت نے وسط اطالیہ کی امارت کو اپنے اندر لے لیا اور گاربالڈی کی دلیرانہ مہم نے اس میں نیپلز اور سسلی کا بھی اضافہ کر دیا۔ پروشیا کی مدد سے ۱۸۶۶ء میں وینس کا الحاق کر لیا گیا اور ۱۸۷۰ء کی جنگ فرانس و جرمانیا نے فرانسیسی فوجوں کو روما کے خالی کر دینے پر مجبور کیا تو اہل اطالیہ کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے قدیم دارالسلطنت پر قابض ہو جائیں۔ جرمانیا کی فتوحات نے یورپ کی آخری مذہبی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ نئی اطالوی شاہی برابر آئینی اصول پر قائم رہی اور جمہوری فریق تک نے گاربالڈی کی تقلید میں یہ تسلیم کر لیا کہ حالات موجودہ کے اعتبار سے حکومت کی یہی سب سے بہتر صورت ہے۔

(۶) بلجیم

بلجیم کی سلطنت نے رومانی طرز کو چھوڑ کر جرمانی طرز اختیار کر لیا۔ ۱۸۳۱ء کا بلجیمی نظام حکومت ۱۸۳۰ء کے فرانسیسی منشور سے اخذ کیا گیا ہے مگر اس میں عمومیت پسند رعایا کے ساتھ مراعات زیادہ کی گئی ہے۔ چنانچہ دفعہ ۲۵ میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ

"کل اختیارات کا منبع و ماخذ رعایا ہے" (یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بلجیم میں کوئی ملکی حکمران خاندان نہیں تھا۔ اور اُسے بہ مجبوری دوسرے ملک سے بادشاہ کا انتخاب کرنا پڑا تھا) دفعہ (۶) کی رو سے تمام طبقاتی اختیارات خارج کئے گئے ہیں اور حق انتخاب وسیع طور پر قائم کیا گیا ہے اور انتخاب کنندے وہی ہوتے ہیں جو دار المبعوثین کے ہیں صرف فرق یہ ہے کہ ارکان دارالامرا کے لئے عمر اور جائداد کی حد بڑھی ہوئی ہے (ابتدائی تجویز یہ تھی کہ ارکان دارالامرا کی نامزدگی کا اختیار بادشاہ کو دیدیا جائے)۔ لیوپولڈ (کوبرگ) کی عاقلانہ اور مدبرانہ حکومت میں بلجیم پر ۱۸۴۸ء کے نازک زمانے کا اثر بہت ہی کم پڑا اور پوپ کے اختیار مطلق کے ماننے والوں اور آزاد (لبرل) فریق کے پرجوش مقابلوں کے باوجود ملک کی خوشحالی برابر بڑھتی جارہی تھی۔ اسکانڈ ناویا میں نظام سلطنت کے رواج کی ایک عجیب تاریخ ہے۔ سویڈن میں سولھویں صدی سے ڈائٹ کے چار طبقے تھے اور ہر ایک کا انتخاب جدا جدا ہوتا تھا یہ چار طبقے امرا اور نائٹ، پادری، اہل شہر، اور کاشتکار تھے۔ بادشاہ کو اکثر امرا کی بڑھی ہوئی طاقت کے مقابلے میں نیچے کے دو طبقوں سے تائید حاصل کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ امرا کا اثر بالعموم پارلیمنٹ سے باہر مجلس شاہی میں نمایاں ہوتا تھا جس میں وزرا بھی شامل ہوتے تھے اور یہ سب کے سب امرا کے گروہ میں سے ہوتے تھے۔ سب سے پہلے گستاوس سوم نے امرا کے اُس غلبے کو، جس سے بادشاہ کی ہستی اور ملک کی حفاظت دونوں خطرے میں آگئی تھی، اسطرح توڑا کہ ۱۷۸۹ء میں سلطنت اور دربار کے اعلیٰ ترین عہدوں کے سوا تمام سیاسی عہدوں کے دروازے غیر امرا کیلئے بھی کھولدئے۔

۴- جرمانیا کے علاوہ دوسرے ٹیوٹونی ممالک
(۱) سویڈن

سویڈن کا ۷ رجون ۱۸۰۹ء کا نظام سلطنت اُس سے قبل کے ۱۷۷۲ء والے نظام سلطنت کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس نظام سلطنت میں مجلس سلطنت اور چاروں وزیروں کے فرائض جس احتیاط اور صحت کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں اسکی نظیر زمانۂ موجودہ کے دوسرے نظامہائے سلطنت میں نہیں ملتی۔ امرا کا یہ مخصوص ادعا بھی روکا گیا تھا کہ وہی تمام عہدوں کے اہل ہیں۔ حال کے زمانے تک مذکورۂ بالا چاروں طبقے قائم رہے اور ان کی منظوری کے بغیر بادشاہ نہ تو نظام سلطنت میں کوئی تغیر کرسکتا تھا نہ کوئی قانون نافذ کرسکتا تھا اور نہ نئے محصول لگا سکتا تھا بالعموم تین طبقات ایک رائے پر متفق ہو جاتے تھے اور چوتھے کو مجبور ہونا پڑتا تھا مگر آئینی قوانین کے معاملے میں بادشاہ اور چاروں طبقوں کا متفق ہونا لازمی تھا۔

بہت سے اعتبارات سے یہ نظام سلطنت جرمانیا کے ازمنۂ وسطی کے نظم و ترتیب کے مثل تھا۔ یہ نظام سلطنت اگرچہ بہت سے فوائد پر حاوی تھا مگر سویڈن سے باہر اس پر بہت کم توجہ کیگئی اور کسی نے اسکی نقل نہیں کی۔ جسکا خاص باعث یہ تھا کہ طبقات کی تقسیم کی وجہ سے قومی مرضی کی قطعی حقیقت کا پتہ چلانا مشکل ہوگیا تھا۔ ۱۸۶۶ء میں دو ایوانوں کے معمولی طریقے نے ان چار طبقوں کے طریقے کو ہٹا دیا۔

(۲) ناروے

ناروے کا ۴ نومبر ۱۸۱۴ء کا نظام سلطنت اس سے بدرجہا زیادہ عمومیت کو لیے ہوئے ہے۔ سویڈن کا بادشاہ (چارلس سیزدہم) صلح کے ذریعے سے ناروے کا بھی بادشاہ ہوگیا، اُسے حالات نے مجبور کردیا کہ وہ اُس نظام سلطنت کو قبول کرلے جسے ۱۸۱۴ء کے موسم بہار میں خود اہل ناروے نے اپنی شخصی حریت اور ملکی آزادی کے تحفظ کے خیال سے تیار کیا تھا۔ وضع قانون رعایا کا کام قرار دیا گیا تھا اور اسکی انجام دہی اسٹورتھنگ (پارلیمنٹ) سے متعلق ہوئی۔ بادشاہ کو منظوری کا اختیار تھا لیکن جب قانون کو مجلس تین مرتبہ منظور کردے، اُسے بادشاہ مسترد نہیں کرسکتا تھا۔ اسٹورتھنگ کا انتخاب رعایا اور زیادہ تر زمیندار کرتے تھے اور پھر وہ خود اپنے کو دو ایوانوں میں تقسیم کردیتی تھی۔ عاملانہ اختیارات بادشاہ سے متعلق تھے اور اسکے وزرا ذمہ دار ہوتے تھے۔ بعد میں شاہی طاقت کے بڑھانے اور امرا کا ایک سیاسی طبقہ پیدا کرنیکے لئے کوششیں ہوئیں۔ مگر سب ناکام رہیں۔ ناروے نے جس غلو کے ساتھ خود کو سویڈن سے آزاد رکھا ہے وہی اسکا باعث تھا کہ ان دونوں تغیرات کی کاشتکاروں اور شہریوں نے زیادہ زور کے ساتھ مخالفت کی۔

(۳) ڈنمارک

ڈینمارک میں ۱۶۶۰ء کے انقلاب کی نزد امرا پر تھی اور عام باشندوں کی مدد سے بادشاہت نے مطلق العنانی حاصل کرلی اور موجودہ صدی تک آئینی حکومت کا اجرا نہیں ہوسکا۔ اولاً اسکا ظہور ۲۸ مئی ۱۸۳۱ء کے قانون کی رو سے ناکمل طور پر صوبوں کی مجلسوں میں ہوا۔ اُسکے بعد ۵ جون ۱۸۴۹ء کے قانون اساسی نے سلطنت کو زیادہ عمومی بنا دیا۔ ڈینوں اور جرمانیوں کی مخاصمت نظام سلطنت کے اختلاف کے باعث نہیں بلکہ قومیت کے اختلاف کے باعث ہوئی۔ ۱۸۶۶ء میں اس نظام حکومت پر بھی نظر ثانی کی نوبت آئی اور جو ترمیم ہوئی وہ بادشاہ اور رگس داگ دونوں کی رضامندی سے عمل میں آئی۔

رگس واگ یعنی پارلیمنٹ میں دو ایوان تھے ایک ایوان اعلیٰ دوسرا ایوان عام۔
(نظام سلطنت مورخہ ۲۸ر جولائی ۱۸۶۶ء)۔

(۴) ہالینڈ

نیدرلینڈس کی زمانہ حال کی سلطنت میں (جو صوبہ جات متحدہ کی قدیم جمہوریت اور بعد کی ٹیوٹونی بادشاہت ہالینڈ کے بجائے قائم ہوئی تھی) آئینی شاہی فوراً جاری ہوگئی۔ اُسکا اجرا ۲۸ر مارچ ۱۸۱۲ء کو ہوا) اور بلجیم کے منتشر ہو جانیکے بعد ۲۴ر اگسٹ ۱۸۱۵ء کو ایک نئے قانون کی رو سے اسکی تجدید ہوئی) ۱۴ر اکتوبر ۱۸۴۸ء کا نیا نظام سلطنت اسی کی ترقی مزید تھی اور حال میں آئینی خیال ہالینڈ میں بہت بڑھ گیا ہے۔

(۵) جرمانی سلطنتیں
(۱) جرمانیوں کی رومی شہنشاہی

اپنی برائے نام ہستی کی آخری صدی میں جرمانی قوم کی قدیم رومی شہنشاہی ایک خالی اعزاز رہ گئی تھی۔ تمام حقیقی اختیار حکمرانوں کے ہاتھ میں تھا۔ انھیں حکمرانوں میں شہنشاہ بھی تھا اسکی باثر حیثیت صرف اسی بنا پر تھی کہ وہ آسٹریا کا آرچ ڈیوک۔ اور ہنگری اور بوہیمیا کا بادشاہ تھا۔

لیکن خود اپنی اپنی مملکتوں کے اندر بیشتر حکمرانوں نے پارلیمنٹوں کی عائد کردہ قید و بند کو توڑکر مطلق العنان حکومتیں قائم کرلی تھیں۔ انھیں اولاً شاہی عہدہ داروں کی حیثیت سے اختیارات حاصل ہوئے تھے، مگر پھر وہی اختیارات موروثی بن گئے۔ اور ازمنہ وسطیٰ کے عام رنگ کے موافق اُن اختیارات نے کچھ مذہبی اور کچھ پدر سری کیفیت پیدا کرلی تھی۔ اقتدار شاہی کے رومانی خیال کے موافق ان اختیارات کو وسعت دیگئی تھی اور اس کے سوا کوئی اور بندش نہیں تھی کہ شہنشاہی کی اطاعت کی ایک ہلکی سی ذمہ داری عائد ہوتی تھی اور شہنشاہ کے دربار اور اسکے دیوان خاص میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔

(۲) پروشیا کا عروج

سب سے اول جس سلطنت نے یہ آزادانہ مطلق العنانی قائم کی وہ پروشیا تھی ایک طرف آسٹریا ترقی کرکے یورپ میں ایک بڑی سلطنت اور فرانس کی مقابل بن گئی تھی اور کم و بیش شہنشاہی کے دائرہ اثر سے باہر ہوگئی تھی۔ دوسری طرف شمال میں ایک نئی سلطنت پیدا ہوگئی تھی جس نے ازمنہ وسطیٰ کی شہنشاہی سے جنگ و جدل کرکے بہت جلد ترقی کرلی تھی اور اس جنگ پر جرمانیا کا قومی رنگ چڑھا دیا تھا۔ ہابس برگ اور لورین کے آسٹروی اور کیتھولک خاندان کی تائید کا انحصار انکی شہنشاہی عظمت، روایتی حقوق، امرا، طبقۂ مذہبی اور ایک مختلف النسل فوج کے اوپر تھا۔ برعکس اس کے

ہوہنسولرن کا پروٹسٹنٹ خاندان جرمانیا کی قومی آزادی اور قومی روح کا نمایندہ اور حامی بن گیا تھا۔

فریڈرک اعظم (۱۷۴۰ء - ۱۷۸۶ء) بر اعظم کی آئینی بادشاہت کے بانی ہونیکی عزت و منزلت کا سزاوار ہے۔ اگر رعایا نے اسکے مقصود کو زیادہ بہتر طور سے سمجھا ہوتا اور حکمرانوں نے اسکی تقلید میں زیادہ کوشش کی ہوتی تو سلطنت کے مطلق العنان حالت سے نکل کر آئینی صورت اختیار کرنے میں زیادہ آسانی ہوگئی ہوتی۔ کسی شخص نے اس سے زیادہ زور کے ساتھ اس اصول کی مخالفت نہیں کی ہے کہ بادشاہ، سلطنت کا آقا و مالک ہے۔ اس سے زیادہ کسی نے اس امر کو قطعی طور پر ثابت نہیں کیا ہے کہ شاہی ایک عہدہ ہے اور بادشاہ سلطنت کا خاص الخاص خادم ہے۔ اسنے ازمنہ وسطی کے ربانی حقوق اور ربانیہ حکمرانی کے تمام اصول کو بلا تذبذب باطل کردیا مگر اُس نے نہ طبقات (پارلیمنٹ) کے قدیم نظام سلطنت کو از سر نو رائج کیا اور نہ جدید نیابتی انتظام قائم کیا۔ اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ اسکے خیالات اپنے زمانے سے بہت آگے بڑھے ہوئے تھے اور رعایا میں ابھی یہ قابلیت نہیں پیدا ہوئی تھی کہ وہ حکومت میں حصہ لے سکے۔ لیکن بہ طرق ذیل اُس نے آئینی بادشاہت کے لئے راستہ صاف کردیا: (۱) اُس نے یہ اصول قائم کیا کہ شاہی حقوق، درحقیقت سلطنت کے فرائض ہیں (۲) قوانین اسی قسم کے نافذ کئے اور (۳) تمام عہدہ داروں کو مجبور کیا کہ اپنے سیاسی فرائض کو ذوق شوق اور دیانت کے ساتھ انجام دیں۔

فرانسیسی انقلاب نے جرمانیا کو فریڈرک کی تیار کردہ شاہراہ سے ہٹا دیا کیونکہ اس انقلاب سے حکمران خوفزدہ اور رعایا انتہا پسند ہوگئی۔

(۳) رائن کی متنفقیت

نپولین کے اثر سے رائن کی متفقہ سلطنتوں میں جو نظامہائے سلطنت قائم ہوئے وہ ایک حد تک آئینی بادشاہت کی طرف قدم بڑھانے کا باعث ہوئے۔ ان نظامہائے سلطنت نے قدیم طبقات کی نیابت کی آخری یادگار کو بھی مٹا دیا۔ اساسی قوانین کو جمع کرکے یکجا مرتب کیا اور اصحاب جائداد و اہل حرفہ و صاحبان علم کو ایک حد تک نیابت کا حق عطا کیا اگرچہ یہ نیابت نہایت حقیر اور بے اثر تھی۔

(۴) سنہ ۱۸۱۵ کی متنفقیت

"جنگ آزادی" کی جانبازانہ کوشش نے جرمانیا کو غیر ملکی تسلط سے آزاد کردیا اور زمانہ جدید کے نظم و ترتیب کے قیام کے لئے آزادانہ قومی انداز پر ایک عمدہ موقع مہیا کردیا۔

ملک میں اُس وقت جو معدودے چند اعلیٰ درجے کے مدبر تھے مثلاً اشٹائن۔ ہمبولٹ اور اُن سے قبل ہارڈنبرگ، سب اس تغیر کے خواہاں تھے اور فریڈرک ولہلم ثالث علانیہ طور پر اپنا خیال اسکی تائید میں ظاہر کرچکا تھا مگر جرمانیا کے حکمران خاندانوں، امیروں اور عہدہ داروں کے خیالات مطلق العنانی کی جانب شدت سے مائل تھے۔ انقلاب نے تمام جدید خیالات کی طرف سے سخت بداطمینانی پیدا کردی تھی اور رعایا کی سیاسی قابلیت ابھی بہت پست درجے پر تھی۔ جرمانیا کی سلطنت متفقہ اور اسکی منفرد سلطنتوں نے مطلق العنان طرز حکومت کو برقرار رکھا۔ صرف صوبوں کی مجلس شوریٰ کے باعث ایک خفیف سی پابندی عائد کردی تھی۔ جس قانون کے موافق متفقیت قائم ہوئی تھی اسکی تیرھویں دفعہ میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ اس متفقیت کی تمام سلطنتوں میں مقامی مجلس شوریٰ قائم کیجائیگی۔ لیکن آسٹروی مدبروں نے صاف طور پر یہ شرط لگادی تھی کہ اُس سے کسی طرح پر نیابتی یا آئینی بادشاہت مراد نہیں لیجائے گی۔

۱۸۱۵ء کے بعد کے نظام ہائے سلطنت

چند سلطنتوں نے مستثنیٰ طور پر فرانسیسی بادشاہت کی نقل میں اپنے وہاں آئینی بادشاہت قائم کی مگر صوبجات کی قدیم مجلس شوریٰ کے اثرات باقیات نے اُن میں بھی فرق پیدا کردیا۔ امارت نساؤ نے اس میں سب سے سبقت کی (۲ ستمبر ۱۸۱۴ء) مگر یہ نظام سلطنت بہت ہی تھوڑے دنوں قائم رہا۔ اُسکے بعد لکسمبرگ کا درجہ ہے (۲۴ اگست ۱۸۱۵ء) اور سکسن، وائمار، آئزناخ کی امارت عظمیٰ (۵ مئی ۱۸۱۶ء) کو خاص امتیاز یہ حاصل ہے کہ وہاں کا حکمران کارل آوگسٹ بذات خاص آزادانہ انتظامات کی جانب راغب تھا۔

جنوبی جرمانی سلطنتوں کی کارروائی، جن میں بویریا کی شاہی (۲۶ مئی ۱۸۱۸ء) بادن (بیڈن) کی امارت عظمیٰ (۲۲ اگست ۱۸۱۸ء) اور ویورٹیم برگ (۲۵ ستمبر ۱۸۱۹ء) داخل ہیں، زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ویورٹیم برگ کی پیش بینی حکومت ہی اوتاچرانے طبقات کی مخالفتوں کو فنا کرنے میں کامیاب ہوسکتی تھی۔ ان سلطنتوں نے مفاد عامہ کے خیال سے آئینی حکومت رائج کی تاکہ اُن بڑی سلطنتوں کے مقابلے میں انھیں قوت حاصل ہوجائے جن میں مطلق العنان حکومتیں قائم تھیں۔

ہنوور کی شاہی (۷ ستمبر ۱۸۱۹ء) کی امارت عظمیٰ (۱۷ ستمبر ۱۸۲۰ء) اور سکسن ماننگن (۲۳ اگست ۱۸۲۹ء) نے بھی مذکورۂ بالا سلطنتوں کی تقلید کی۔

ان تمام نظامہائے سلطنت میں بادشاہ کو بہت وسیع اختیارات اور حقوق دیئے گئے تھے۔ درحقیقت فرانس کی بہ نسبت قدامت پسند جرمانیوں میں بادشاہی کی حالت زیادہ محفوظ تھی اور شاہی جب تک آزادانہ خیالات کو سمجھتی اور اسکی پیشروی کرتی رہی معاملات عامہ کے نظم و نسق میں اس پر اس قدر اعتماد کیا جاتا رہا کہ کسی دوسری جگہ یہ بات نہیں ہوئی۔

ایوانہائے شوریٰ کی ترتیب میں انگریزی اور فرانسیسی نمونے پیش نظر رکھے گئے تھے لیکن دارالامرا بیشتر اصحاب جائداد پر مشتمل تھا، جن کے دعوے اور خیالات زمانہ ماضیہ پر مبنی تھے۔ ان میں کچھ درباری عہدہ دار بھی شامل کرلئے گئے تھے، اس وجہ سے اس ایوان کو کبھی کافی وقعت اور اقتدار نہیں حاصل ہوا۔ دارالعوام میں اہل دولت کا اثر فرانس کی بہ نسبت کم تھا مگر چونکہ وہ طبقات کے قدیم طرز پر قائم ہوا تھا اس وجہ سے اس تنظیم کو اکثر نیابتی کے بجائے "طبقاتی" کہتے تھے۔ لیکن واقع میں یہ بجا نہیں تھا۔ ازمنہ وسطی کے طبقاتی انتظام اور زمانۂ حال کی نیابتی حکومت میں یہ فرق نہیں ہے کہ موخرالذکر رعایا میں اختلاف طبقات کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ فرق یہ ہے کہ وہ نیابتی حکومت ہے اور وہ قوم کے مشمولہ مدارج کے مفاد خاص پر اس قدر زور نہیں دیتی جسقدر قوم اور سلطنت کی وحدت (اتحاد) پر زور دیتی ہے۔ مثلاً بویریا کے جدید نظام سلطنت کو دیکھئے تو جدید اصول کی حقیقت عیاں ہو جاتی ہے۔ اس نظام سلطنت میں تمام مبعوثین سے یہ قسم لیجاتی ہے کہ وہ ملک کی عام بہبود پر نظر رکھیں گے اور جداگانہ طبقات و مدارج کا کچھ خیال نہ کریں گے۔

جرمانیا کی دو بڑی سلطنتوں کی بے اعتمادی اور عناد کے باعث آئینی شاہی کا نشو و نما بیسیوں برس رکا رہا۔ پروشیا میں اصلاح کی تمام کوششیں ناکام رہیں اور قوم کی موجودہ نیابت کے بجائے صرف صوبجات کی مجالس شوریٰ منظور کی گئیں۔ آسٹریا کی حکومت کو یہ یقین تھا کہ اُسکے مختلف صوبجات میں اتحاد قائم رہنے کا صرف یہی ذریعہ تھا کہ مطلق العنان حکومت قائم رہے۔ جرمانی متفقیت نے اپنی تمام کوششیں اس امر پر صرف کر دیں کہ شاہی اصول بحال خود برقرار رہے اور رعایا پر احتسابی نگرانی قائم کردی جائے۔

(۵) سنہ ۱۸۳۰ کے بعد جدید تحریکات

سنہ ۱۸۳۰ کے فرانسیسی انقلاب نے جرمانیا میں نئی تحریکات پیدا کردیں اور

بہت سی سلطنتوں کو آئینی طریق قائم کرنے پر راغب کر دیا۔ ولایت ہیسے میں ۵؍جنوری ۱۸۳۱ء کو آئینی حکومت قائم ہوگئی، جسکا منشا یہ تھا کہ حکمران کی خودمختاری کے مقابلے میں عوام کی آزادی محفوظ رکھی جائے۔ سکسونیا کی شاہی کا نظام سلطنت بویریا کے طرز پر ڈھالا گیا (۴؍ستمبر ۱۸۳۱ء) ہنوور کی شاہی میں ایک جدید اساسی قانون جاری ہوا (۲۶؍ستمبر ۱۸۳۳ء) مگر دوسرے بادشاہ ارنسٹ آوگسٹ نے اُسے خارج کر دیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۴۰ء میں وہ قانون پھر کسی قدر ترمیم شدہ صورت میں بحال کیا گیا۔

پس اسطرح مذکورۂ بالا دو بڑی سلطنتوں کی مخالفت کے باوجود آئینی حکومت جرمانیا میں برابر ترقی کرتی گئی۔ یہ ضرور ہے کہ اس میں اکثر ملمع داری زیادہ اور اصلیت کم تھی۔ عہدہ داروں کی انشا پردازیوں سے اور مختلف فریقوں کے تصادم باہمی سے مجالس قومی کے اندر اور باہر دونوں جگہ اُسے نقصان پہنچتا رہا۔

(۱) پروشیا

آخر الامر ۳؍فروری ۱۸۴۷ء کو فریڈرک ولہلم چہارم نے ایک فرمان شاہی جاری کیا اور بلحاظ صوبجات کی قدیم مجالس کی بنیاد پر تمام ملک پروشیا کیلئے ایک مشترک لنڈتاغ (پارلیمنٹ) قائم کیا۔ اس مجلس کو قانون سازی کے متعلق صلاح دینے، نئے محاصل کی منظوری دینے اور اندرونی معاملات کے متعلق درخواست دینے کا حق دیا گیا۔ اسطرح پروشیا مطلق العنان حکومت کی حد سے نکل کر محدود شاہی کے زمرے میں آگئی اور جرمانیا کی نیابتی سلطنتوں سے قریب ہوچلی۔ طریق جدید کے اجرا کو حرکت دیدی گئی تھی اور وہاں کا نظام سلطنت فی نفسہ اس قدر قوی تھا کہ وہ محض آئینی حکومت کی سرسری نقل کرنیکے بجائے موجودہ تعلقات وحالات کو برقرار رکھ سکے، اگرچہ پارلیمنٹ کے اختیارات بہت ہی ناکافی تھے مگر ترقی کی ایک صورت نکل آئی تھی اور اس امر کا امکان پیدا ہوگیا تھا کہ رعایا کی سیاسی تربیت کے ساتھ ساتھ نظامِ سلطنت کے نقائص دور ہوتے جائینگے۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ حکومت پارلیمنٹ کی جائز خواہشوں تک سے اس قدر مخالف تھی کہ اُس نے اعتدال پسند فریق کا اعتماد بھی کھو دیا۔ جب ۱۸۴۸ء کے سیاسی زلزلے نے یورپ کی ساری سرزمین کو ہلا دیا تو یہ نئی عمارت بھی منہدم ہوگئی۔ ۵؍دسمبر ۱۸۴۸ء کو ایک نیا نظامِ سلطنت مرتب کیا گیا، جسے زیادہ تر جمہوری اور انقلابی فریق نے مرتب کیا تھا۔ چھ مہینے بعد (۳۰؍مئی ۱۸۴۹ء کو) بادشاہ نے ایک انتخابی قانون شائع کیا اور اسکے بموجب

۳۱ر جنوری سنہ ۱۸۵۰ء کا نظر ثانی کیا ہوا نظام سلطنت تیار کیا گیا، اسکے بعد بعض اہم تغیرات ہوتے رہے ہیں۔ خاصکر مرکزی اقتدار کی تقویت کے لئے قدم آگے بڑھتا رہا ہے۔ اگرچہ اس نظام سلطنت میں بہت سے شدید نقائص تھے مگر اس سے پروشیا میں سیاسی زندگی کی ایک قانونی بنیاد قائم ہوگئی۔

آئندہ چند برس کے تجربات نے ثابت کر دیا کہ آئینی حکومت کی ظاہری شکل تو قبول کرلیگئی، مگر اُسکے منشا کی کماحقہٗ تعمیل نہیں ہوئی۔ ایوان اعلیٰ جو مطلق العنانی اور ازمنہ وسطیٰ کی سپہگری کا نمایندہ تھا وہ بد دلی کا اظہار کر رہا تھا۔ بادشاہ اپنے اختیارات میں روک ٹوک کے عادی نہیں تھے اور اس نئی حالت کا قبول کرنا اُنھیں شاق معلوم ہوا۔ عوام کے نمایندوں کو آہستہ آہستہ یہ معلوم ہو گیا کہ اُنکے اختیارات کس قدر محدود ہیں اور پروسی حکومت اور انگلستان کے پارلیمنٹی طریق میں کس قدر فرق ہے مگر اصلاح و رجعت کی اس شدید وصعب کشاکش میں آئینی حکومت کی بنیاد برابر مضبوط ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ مخالفت کے بجائے سلطنت کے لئے ادائے فرض کا خیال پیدا ہوگیا۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں آسٹریا کے شعلہ جنگ میں مخالفت کے تمام اجزا پگھل گئے اور سب متحد ہوگئے۔

(۲) آسٹریا

آسٹریا بھی بےخبری کے عالم میں ۱۸۴۸ء کے انقلاب میں پھنس گئی، وہ مختلف قومیں جو ابتک خاندان ہابس برگ کے تحت میں مربوط تھیں اب علیحدہ ہونے کی کوشش کرنے لگیں۔ اور کچھ دن تک وائینا ناتجربہ کار اور پرجوش نوجوانوں کے ہاتھ میں آگیا۔ فوج کے سوا اور کہیں بھی اتفاق باقی نہیں رہا۔ فوج ہی پر بادشاہ کا آخری بھروسا تھا۔ فوج کی فتوحات نے آسٹری مدبرین کو اس قابل بنا دیا کہ وہ پھر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اندرونی اور بیرونی خطرات سے مرعوب ہوکر انھوں نے یہ کوشش کی کہ سلطنت کو از سرنو زیادہ متحدہ بنیاد پر قائم کریں۔ ۴ر مارچ سنہ ۱۸۴۹ء کو جو نظام سلطنت عطا کیا گیا وہ آسٹروی شہنشاہی کو آئینی بادشاہت کے اصول پر ترتیب دینے کی پہلی کوشش تھی مگر اسکا عملی تجربہ کرکے نہیں دیکھا گیا۔ ایک مجلس میں اُن تمام قوموں کو جمع کرنا غیر ممکن معلوم ہوا جو ایک دوسرے سے مختلف تھیں اور تہذیب کے اعتبار سے بھی مختلف مدارج پر تھیں۔ ہنگری کی بغاوت کی وجہ سے یہ اور بھی زیادہ ضروری ہوگیا کہ ایک مطلق الاختیار اور متحدہ حکومت قائم رکھی جائے کیونکہ حکمراں خاندان ہمیشہ

آسٹریا کے مختلف صوبوں کے درمیان ذریعۂ اتحاد رہا تھا اس لئے ہر طور پر یہی مناسب معلوم ہوا کہ سلطنت کے تمام اختیارات شہنشاہ کے ہاتھ میں مجتمع رہیں۔ ۲۰ اگست ۱۸۵۱ء کے شاہی فرمان نے یہ اعلان کر دیا کہ وزراء صرف بادشاہ کو جوابدہ ہیں۔ اسی تاریخ کی مجلس وزراء کے فیصلے کے بموجب ملکی مجلس شوریٰ شاہی مجلس شوریٰ میں بدل دی گئی اور ۳۱ دسمبر ۱۸۵۱ء کے ایک حکم شہنشاہی کے ذریعے سے ۱۸۴۹ء کا نظام سلطنت اٹھا دیا گیا۔ اسی تاریخ کو مجلس وزراء نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ صرف خاص کے علاقوں میں رائے دہی کی مجلسیں قائم کی جائیں گی جن میں امرا چھوٹے زمیندار، تجارتی طبقات سب شامل کئے جائیں گے مگر اصلیت یہ تھی کہ مطلق العنان بادشاہی قائم کر دی گئی تھی اسکی مرضی کو عمل میں لانیکے لئے عہدہ داروں کی ایک جماعت کل کی طرح کام کر رہی تھی۔ کیتھولک پادریوں سے اُسے اخلاقی تائید حاصل تھی اور ایک زبردست فوج اسکی مادی حمایت کے لئے موجود تھی۔

۱۸۵۸ء کے بعد پروسیا، بویریا، بیڈن، ویورٹیمبرگ ولایات ہے وغیرہ میں مطلق العنانی کو پیہم شکستیں نصیب ہوئیں اور ۱۸۵۹ء کی اطالوی جنگ میں آسٹریا کو یہ معلوم ہو گیا کہ اس کے تینوں ستون (عمال، فوج، و پادری) کس قدر کمزور ہیں۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ شہنشاہی حکومت کو مالی اور سیاسی مشکلات سے کوئی مفر اسکے سوا نظر نہ آیا کہ نیابتی نظام سلطنت پھر عطا کیا جائے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۶۰ء کے شاہی فرمان میں اس ارادے کے پورے کرنیکا عزم ظاہر کیا گیا اور ۲۶ فروری ۱۸۶۱ء کے قانون اساسی کی رو سے اس کے پورے کرنیکی کوشش کی گئی۔

اس فرمان میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ مختلف سلطنتوں اور صوبوں میں تاریخی حقوق کا جو احساس پیدا ہو گیا ہے اسکے بموجب شاہی اختیارات قائم کئے جائیں گے۔ ہر قوم کے لئے ایک لنڈ تاغ (مجلس ملکی) ہوگی جسے ایک حد تک بجائے خود آزادی حاصل ہوگی اور اسکے ساتھ ہی عام رائشس تاغ کی وضع قوانین اور شہنشاہی حکومت کی نگرانی میں یہ سب قومیں برابر کی شریک ہونگی۔ رائشس تاغ بھی دو قرار پائیں ایک سلطنت کے لئے اور دوسری مغربی صوبہ جات کیلئے، لیکن اس نظام سلطنت کو استقلال نہیں ہوا کیونکہ اہل ہنگری نے رائشس تاغ میں اپنے مبعوثین کے بھیجنے سے انکار کر دیا۔

۲۱ ستمبر ۱۸۶۵ء کے شہنشاہی اعلان نے رائشس تاغ کو معطل کر دیا اور حکومت کو پھر اسکی نگرانی سے آزاد کر دیا لیکن ۱۸۶۶ء کی تباہ کن شکست نے ایک نیا تغیر پیدا کر دیا۔ سیڈوا کی شکست اور پروشیا سے پراگ کا عہد نامہ ہو جانیکے بعد ہنگری کے ساتھ صدق دل سے گفت و شنود شروع ہوئی۔ ہنگری اس امر پر مصر تھی کہ نہ وہ اپنے قدیمی حقوق ترک کرنا چاہتی اور نہ وہ انھیں ایک ایسے نظام سلطنت سے بدلنا چاہتی ہے، جو محض شہنشاہ کا عطیہ ہو۔ آخر اہل ہنگری اس شرط سے مصالحت پر راضی ہوئے کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ ہنگری کا نظام سلطنت از روئے قانون بحال ہے اور ۱۸۴۸ء کے قوانین اور ملک کی آزادی قائم رہے گی، اور اس میں جس قدر مداخلت کی گئی ہے سب کالعدم قرار دیدیجائے۔ حقیقت میں یہ دوگانہ حکومت کا بحال کرنا تھا۔ اس زمانے سے ایک رائشس تاغ اور وزارت ہنگری کے لئے ہے اور دوسری رائشس تاغ اور وزارت دریائے لائتا کی دوسری جانب کے صوبجات کیلئے ہے۔ ۱۸۶۷ء کے بعد مسلسل قوانین ایسے جاری ہوئے جن سے وزرا کی ذمہ داری، نیابت کا طریقہ، عدالتی اور ملکی انتظامات، مرتب و معین ہوئے۔ معین شدہ نظام سلطنت جہانتک قابل عملدرآمد تھا از سر نو جاری کیا گیا۔ دونوں ڈائٹ (پارلیمنٹ) نے ایک متفقہ مجلس قائم کی جسکا منشا یہ تھا کہ وہ تمام شہنشاہی کیلئے ایک عام طرز عمل ترتیب دینے کے لئے تین مشترک وزرا یعنی وزیر خزانہ، وزیر جنگ، اور وزیر خارجہ کے ساتھ ملکر کام کرے۔ یہ امر مشکوک ہے کہ آیا یہ مسالمت مستقلاً قائم رہے گی یا نہیں مگر یہ یقینی ہے کہ آسٹریا، ہنگری اور بوہیمیا تینوں میں سے کوئی بھی اسکی روادار نہ ہوگی کہ مطلق العنانی پھر قائم ہو جائے اور اگرچہ اس کی ظاہری صورت کے متعلق ان میں باہم اختلاف ہو مگر اس خواہش میں سب متفق ہیں کہ آئینی بادشاہی برقرار رہے جس پر قومی نمایندوں کا اثر اور انکی نگرانی غالب ہو۔

(۸) ۱۸۴۸ء کا مجوزہ جرمانی نظام سلطنت

منفرد سلطنتوں سے گزر کر جرمانی متفقیت کو مجموعۂ آئینی حکومت کی شکل میں لانیکی کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۸ مارچ ۱۸۴۹ء کو ایک نظام سلطنت تیار کیا گیا جو آسٹریا کے سوا تمام جرمانی ریاستوں پر حاوی تھا۔ شاہان پروشیا موروثی شہنشاہ قرار پائے۔ ایک متفقہ ہیئات میں ہر سلطنت کی نیابت کا انتظام کیا گیا تھا، اور جرمانی رعایا کے مبعوثین کی ایک قومی مجلس قرار پائی مگر اس تجویز نے عملی شکل نہیں اختیار کی۔ جرمانیا کے مسائل کو

اسطرح حل ہوتے دیکھنے کے بجائے آسٹریا جنگ کے لئے تیار ہوگئی۔ شاہ پروشیا اس پر رضامند نہیں ہوا کہ وہ قومی مجلس کے ہاتھ سے شہنشاہی تاج قبول کرے۔ بویریا نے اُس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا اور خود قوم بھی کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکی۔ خاندان اور تفرد پسندی کے اثرات قومی اتحاد کے اثرات سے زیادہ قوی تھے اسکے بعد بھی جو کوششیں، خصوصاً پروشیا کی طرف سے، جرمانیا کو ایک آئینی شاہی کے تحت میں متحد کرنیکی ہوئیں وہ سب کی سب انھیں اثرات کے مقابلے میں ناکام رہیں یہانتک کہ آسٹریا اور حکمران خاندانوں کی طرف سے جو رقتیں ڈالی جارہی تھیں اُن کا خاتمہ ۱۸۶۶ء کی جرمانی جنگ نے کیا۔

شمالی جرمانیا کی متفقیت ۱۸۶۷ء

۱۶ اپریل ۱۸۶۷ء کو شمالی جرمانیا کی جو متفقیت قائم ہوئی، اُسے آئینی بادشاہت کہنے میں بہت سے شرائط و قیود لازم آتے ہیں۔ شاہ پروشیا اس متفقیت کا موروثی صدر و سپہ سالار قرار دیا گیا تھا اور عام کارروائی کی نگرانی اُسے تفویض ہوئی تھی۔ اسکی معاونت کے لئے تمام سلطنتوں کا ایک متفقی چانسلر (صاحب الدیوان) تھا، شاہ پروشیا چانسلر کو نامزد کرتا تھا مگر وہ پارلیمنٹ کا ذمہ دار ہوتا تھا اور انتظام ملک کے انصرام کے لئے وہی سردیوان سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے عاملانہ اختیار آئینی بادشاہت کے اختیار عاملانہ کے مشابہ تھا۔ اسکے ساتھ ہی صدر کی کارروائیوں کی روک تھام نہ صرف رائشس تاغ سے ہوتی تھی، جس میں جرمانی قوم کے نمایندے شامل تھے بلکہ مجلس متفقہ بھی اسکی نگران تھی۔ جس میں تمام متفقہ سلطنتوں کی شرکت اور رائے شامل تھی۔ یہی دونوں جماعتیں قانون وضع کرنے میں متفقہ انتظامات کی نگرانی کرتی تھیں۔

۱۶ اپریل ۱۸۷۱ء کے جرمانی شہنشاہی کے نظام سلطنت نے بادشاہ کو شہنشاہی کا خطاب دیکر اُس کی قوت کو بڑھا دیا لیکن آج بھی بعض فوجی اور مالی معاملات میں شہنشاہ کو نامنظوری کا بہت ہی محدود حق حاصل ہے۔ وضع قانون میں اُسے کوئی آزادانہ وبراہ راست اختیار حاصل نہیں ہے اور مجلس متفقی صرف وضع قانون کی مجلس نہیں ہے بلکہ شہنشاہی کی حکومت میں شریک ہے۔ پس ایک حد تک مختلف شہریاروں اور مقامی حکمرانوں کی ایک مجموعی حکومت قائم ہے جو شاہی کے بجائے اعیانی حکومت سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ شہنشاہی میں جن اصولوں کی آمیزش کو یلفندورف نے دو صدی قبل

نہایت ہولناک بتایا ہے وہ ابھی پوری طرح صاف نہیں ہوئے ہیں لیکن اپنے خصوصیات اور اجتماعی ضدات کے باوجود جرمانی نظام سلطنت نے یہ ظاہر کردیا ہے کہ وہ ایک زوردار اور جاندار شئے ہے، اور اگر آئینی بادشاہت کا جزو اعظم یہ تسلیم کیا جائے کہ شاہی قوت اور وحدتِ عمل کے ساتھ رعایا کے حقوق اور آزادی کا اجتماع ہوجائے تو جرمانیا کی شہنشاہی بالیقین اس صنف میں داخل ہے۔

خلاصہ

اس تمام بحث پر نظر ثانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نیابتی یا آئینی بادشاہی کے طریقے کو مغربی یورپ میں نہایت قطعی غلبہ حاصل ہوگیا ہے۔ یورپ کی تقریباً ہر ایک مہذب سلطنت نے رعایا اور اُسکے مشمولہ طبقات کے نہ صرف شخصی بلکہ سیاسی حقوق کو بھی تسلیم کرلیا ہے۔ اب شاہی، مطلق العنان اور غیر محدود نہیں رہی ہے بلکہ وہ ایک اعلیٰ قانونی طاقت بنگئی ہے اور رعایا کے حقوق نے اُسے محدود کردیا ہے۔

لیکن دوسرے اعتبارات سے مختلف ممالک کی آئینی شکلوں میں بہت فرق ہے۔ انگلستان میں شاہی، امرا کے ایک زبردست طبقے سے گھری ہوئی ہے اور عملی کاموں کا انحصار بادشاہ کی شخصی مرضی کے بجائے پارلیمنٹ کے فریق غالب اور وزرا کے اوپر ہے جو پارلیمنٹ کو جوابدہ ہیں۔ براعظم پر کہیں بھی طبقہ امرا کو یہ اقتدار و اعزاز حاصل نہیں ہے۔ وہاں شاہی کے بعد عمومی حصہ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ طبقہ امرا کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ وہ اعتدال قائم رکھتا اور اول الذکر دونوں حصوں کے درمیان ایک واسطے کا کام دیتا ہے۔ براعظم میں آئینی جد و جہد شاہی اور جمہوریت کے درمیان ہے، اور ان میں سے ہر ایک اس کوشش میں سرگرم ہے کہ وہ دوسرے کے مقابلے میں اور نیز تمام سلطنت کے اندر اپنے محل مناسب پر قائم رہے۔ ہر ایک اپنی تنہا حکومت اور اپنے حریف کو دبانیکی فکر میں ہے مگر دونوں سے کسی ایک کو جب عارضی طور پر شکست ہوجاتی ہے، تو اُس کے بعد پھر یک بیک اسکی قوت بحال ہوجاتی ہے براعظم میں آئینی بادشاہت کی علانیہ کوشش یہ ہے کہ اُسے ایک زندہ حیثیت حاصل ہوجائے جس سے اس جسم سیاسی کے ہر حصے کو اسکا موزوں حق ملجائے، بادشاہ کو کامل اقتدار و عظمت طبقہ امرا کو وقعت و اثر، عوام کو امن و آزادی نصیب ہو۔ براعظم میں بالعموم اور فرانس[a] اور جرمانیا میں بالخصوص بادشاہ سلطنت کا

[a] یعنی ۱۸۷۰ء سے قبل۔

صدر کا رکن ہوتا ہے، صرف لفظاً نہیں بلکہ عملاً بھی۔ جب قومی حسیات اور رفتار زمانہ سے اُسکا
تصادم ہو جاتا ہے صرف اُسوقت نا محدود رائے عامہ کی قوت سے اُسکی روک ہوتی ہے
مگر یہ رائے عامہ بالعموم انفصالی اور جامد ہوتی ہے۔ اس حالت کے سوا بادشاہ کی قوت طبقہ امرا
کی بہ نسبت بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ جرمانیا میں یہ طبقہ اپنے ذاتی مفاد کے خیال سے
بادشاہ کا خدمت گزار بنا رہتا ہے اور فرانس میں وہ اپنی بے بسی کی شکوہ سنجی کیا کرتا ہے۔
فرانس میں بوربوں خاندان کے بادشاہ، زیادہ دولتمند اہل شہر پر بھروسا کرتے تھے اور
نپولین سوم اونی طبقات کو اپنا پشت پناہ سمجھتا تھا۔ جرمانیا کی منفرد سلطنتوں میں بادشاہ
اپنی تائید کے لئے کچھ تو فوج پر بھروسا رکھتے ہیں اور کچھ حکام پر۔ حکام اپنی جگہ پر بادشاہ
کے لئے خاص روک تھام کا ذریعہ ہوتے ہیں شہنشاہی میں شہنشاہ کا اعتماد عوام پر
اور مختلف سلطنتوں کی حکومتوں پر ہوتا ہے۔ بے انتہا کوششوں کے باوجود کہیں بھی کوئی
ایسا انتظام نہیں ہوا ہے، جس سے عوام کے دعاوے کو تسکین ہوگئی ہو، جب یہ مقصد
پوری طرح حاصل ہو جائے گا، حکمران خاندان اپنے ازمنہ وسطی کے تعصبات کو برطرف
کر دیں گے، اور زمانہ حال کے خیالات سے متفق ہو جائیں گے تو یہ مدت دراز کی کشمکش
ختم ہو جائے گی اور محدود شاہی کی بقا کا پورا اطمینان ہو جائے گا، جس سے یہ توقع
وابستہ ہے کہ وہ اتحاد عام کے ساتھ اجزا کی آزادی کو جمع کر دے گی اور رومی سیاسی
مذاق کو جرمانی احساس آزادی کا ہم آہنگ بنا دے گی۔

**تعلیق**۔ گستاو تسمرمن نے اس بحث پر ایک رسالہ لکھا ہے اور جب (۱۸۵۲ء میں ہنوور سے) یہ رسالہ
شائع ہوا تو سوسائٹی کے اعلیٰ حلقوں میں بہت پسند کیا گیا مگر تعلیم یافتہ متوسط طبقے نے اُسے عموماً ناپسندیدگی کی
نظر سے دیکھا۔ اس رسالہ کا نام یہ ہے: "انگلستان کے لئے آئینی شاہی کا مناسب ہونا اور براعظم یورپ
کیلئے آئینی شاہی کا بے کار محض ہونا" اور اُسکے مصنف نے اُسوقت سے ہنوور میں ایک ایسا دائرۂ عمل
اختیار کیا ہے جو حکمران اور قوم دونوں کیلئے محل شکایت ہے۔ اس مضمون پر آزاد خیالوں نے جو پر مغز
تصانیف شائع کئے ہیں، یہ رسالہ مطلق العنانی کی طرف سے اُنکا جواب ہے، اپنے اکثر مخالفوں کی طرح
تسمرمن نے بھی آئینی بادشاہت کا خیال تمامتر انگلستان کے نظام سلطنت کے ظاہری اشکال و اصول سے
اخذ کیا ہے اُسکا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ انگلستان کا طریقہ براعظم میں قابل عملدرآمد نہیں ہے کیونکہ انگلستان میں

نقائص واضداد کی اصلاح و درستی روایات قدیمہ اور حکمران طبقۂ اعیان کے اغراض سے ہو جاتی ہے لیکن اس نظام سلطنت پر اگر بالکل عموی انداز سے عملدرآمد کیا جائے تو نہایت ابتر نتائج پیدا ہونگے مگر انگلستان کا دستور اور آئینی بادشاہت دونوں ایک ہی شئے نہیں ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس کوشش کی عملی صورت کے لحاظ سے اس دستور کو باوجود اُسکی اصولی غلطیوں کے سب سے اہتم بالشان اور سب سے بڑی کامیابی قرار دیجئے، مگر یہ کہنا بجا نہیں ہے کہ اصول کی یہی ایک اتم و اکمل عملی صورت ہے۔ یہ کہنا کہ براعظم کے حالات انگریزی طریقے کے ناموافق ہیں، یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ حالات آئینی بادشاہت کے بھی مخالف ہیں۔ آئینی بادشاہت سے مراد ایسی بادشاہت ہے جو یہ تسلیم کرتی ہو کہ طبقات رعایا کے حقوق کی طرح اُسکے حقوق بھی نظام سلطنت کی رو سے مشخص و معین ہیں اور یہ کہ بالتخصیص قانون سازی کے لئے جسم سیاسی کے جملہ اعضا کو متفقاً کام کرنا چاہئے۔ ایک زندہ بادشاہت لازماً آئینی بادشاہت ہوگی کیونکہ زندگی خود نظام ہی کا نام ہے۔ تسیمرمن کا ہر جگہ یہ لکھنا کہ "اقتدار خاص" حکمران کی "ملک" ہے، صاف یہ ظاہر کرتا ہے کہ جزئیات پر اسقدر غایر نظر رکھنے کے باوجود اُس نے سلطنت کے متعلق زمانۂ حال کے خیال کو پوری طرح نہیں سمجھا ہے۔ ازمنہ وسطی کے اس استدلال کو اختیار کر لینے سے وہ زمانۂ حال کے خیالات سے کلیۃً متصادم ہوگیا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک وقت تک وہ پشتہ بندی سے اس سیلاب کو روکے مگر جب موجیں بلند ہونگی تو اس کمزور عمارت کو یک لخت بہا لیجائینگی۔ (یہ جملہ جسطرح ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا تھا میں اُسکو اُسی طرح چھوڑے دیتا ہوں۔ ۱۸۶۶ء میں اس کی صداقت ثابت ہوگئی)۔ زمانہ موجودہ نے اگر کسی ایک اصول کو صاف طور پر مضبوط پکڑ لیا ہے تو وہ یہ ہے کہ سیاسی اقتدار جسطرح ایک عام حق ہے اُسی طرح ایک عام فرض بھی ہے۔ اسکا تعلق تمام قوم کی سیاسی ہستی و زندگی سے ہے اور وہ کسی شخص واحد کی ملک یا حق شخصی ہرگز نہیں قرار دیا جاسکتا۔

---

# پندرھواں باب

## ۲- آئینی شاہی کے نمایاں تصورات

غلطیاں:-

یورپ کی تقریباً تمام مہذب سلطنتوں نے آئینی بادشاہت کا طریقہ اختیار کرلیا ہے۔
انھیں توقع یہ ہے کہ اس ذریعے سے نہ صرف اُس باہمی تخالف میں جو مطلق العنان حکمرانی
اور کمزور منقسم سلطنت کے درمیان زمانۂ وسطیٰ کی وراثت کے طور پر چلا آرہا ہے آشتی
وصلح پیدا ہوجائے گی بلکہ زمانۂ حال کے مختلف سیاسی خیالات اور خاصکر شاہی اور جمہوریت
کے متخاصم خیالوں میں بھی مسالمت کی صورت نکل آئیگی۔ اس لئے اس طریق کے
اساس پر بحث کرنا خاص عملی اہمیت رکھتا ہے لیکن بحث سے پہلے بعض اغلاط و تسامحات صاف
کرلینا ضروری ہے۔

(۱) یہ غلط ہے کہ بادشاہ کو صرف عاملانہ اختیار حاصل ہے

فرانسیسی انقلاب نے اپنے ابتدائی برسوں میں روسو کے اس خیال کو عملی جامہ
پہنانے کی کوشش کی کہ سلطنت دو قوتوں پر مشتمل ہے۔ ایک قوت ارادی یعنی قوت قانونی
دوسری قوت عملی یعنی اختیار عاملانہ۔ فرانس میں آئینی بادشاہت کا اصل اصول یہ سمجھا جاتا
تھا کہ رعایا رائے قائم کرتی ہے، بادشاہ اُسے عمل میں لاتا ہے۔
یہ خیال کرنا رعایا کو بادشاہ کا حریف مقابل بنادینا بلکہ درحقیقت خود شاہی کا خاتمہ کردینا ہے
کیونکہ اس سے بادشاہ عوام کی مرضی کا خادم محض ہوجاتا ہے اور "عوام کی مرضی" بادشاہ
سے ایک خارج شئے ہوجاتی ہے جسکے قیام میں اُسے کچھ دخل نہیں ہوتا۔ لوئی شانزدہم کا
زوال اور انتہا پسندوں کا اعلان جمہوریت بے شک وشبہ تاریخی واقعات کے نتائج تھے
مگر اس میں بھی شک نہیں کہ نظام سلطنت کے اس اصول کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا تھا۔
اسکے برعکس اگر بادشاہ کو قانونی طاقت کے تابع سمجھکر اس سے خارج کرنیکے بجائے
اسکا اہم پایہ سمجھ لیجیے تو سلطنت کے لئے جس توحد عمل کی ضرورت ہے وہ ضائع ہوجاتا ہے
اور ایک ناممکن العمل دوعملی قائم ہوجاتی ہے[۱] گویا ایک دوسروں والا بھوت پیدا ہوجاتا ہے

[۱] اس دوعملی سے جو ابتری پیدا ہوتی ہے اُسے فرانس کا عمومی وجمہوری فریق اچھی طرح سمجھتا تھا اور

اُس سے یا تو سلطنت کے ٹکڑے ہوجائیں گے یا یہ ہوگا کہ شاہی اور جمہوریت میں سے کوئی ایک اصول جلد تر دوسرے سے مغلوب ہوجائیگا۔

(۲) بادشاہ بالکل بے اختیار ہے

اس محال کو رفع کرنیکے لئے سیئیے نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سرتاج سلطنت بالکل بے اختیار ہونا چاہئے اور اسی کو اُس نے آئینی طریقے کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اگر کسی شخص کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ماں کے پیٹ سے بادشاہ پیدا ہوا تھا تو وہ شخص نپولین ہے۔ اُس نے اس تجویز کا ایسا حقارت آمیز جواب دیا ہے کہ وہ کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ اس نے کہا کہ "تم کسی شخص سے جو تھوڑی سی بھی سمجھ رکھتا ہے اور جسے کچھ بھی عزت کا خیال ہے یہ توقع کیونکر کرسکتے ہو کہ وہ سُور کی طرح پڑا رہیگا اور بیس لاکھ سالانہ کھا کر موٹا ہو کر ریگا"۔

(۳) شاہی اختیارات کو وزرا عمل میں لاتے ہیں

ایک زیادہ عام خیال یہ ہے کہ "بادشاہ کو حکمرانی کا حق حاصل ہے مگر اُس حق کا عمل میں لانا اُس سے نہیں بلکہ اُسکے وزرا سے متعلق ہے"۔ یہ طریقہ مختلف وقتوں میں متعدد ممالک میں عملاً رائج رہا ہے اور ممکن ہے کہ اب بھی رائج ہو لیکن اگر اسے ایک مستقل سیاسی اصول کے طور پر تسلیم کرلیجے تو اُس سے یہ لازم آئیگا کہ بادشاہی بالکل ترک کردی جائے اور جمہوریت کا رواج ہوجائے کیونکہ اگر کسی شخص کو کوئی حق حاصل ہو اور وہ دائمی طور پر اسکے استعمال سے محروم کردیا جائے تو اُس حق کی نوعیت اصلی اس سے زائل ہوجاتی ہے اور تھوڑا ہی زمانہ گزرنے پر بالیقین یہ بے معنی خطاب بھی اُس سے نکال کر اُس شخص کو دیدیا جاتا ہے جو واقعتاً اس حق کو کام میں لاتا ہو۔ ازمنہ وسطیٰ میں ماتحت زمیندار اور مستاجر اوّلاً زمین پر مالکانہ حقوق استعمال کرنے لگے، پھر اُنھیں زمین کا قبض و دخل بھی مل گیا اور اُنھوں نے سابق مالکوں سے باضابطہ اور مکمل ملکیت بھی بزور حاصل کرلی۔ کارولنگی خاندان کے حاجبان محل نے جب میرو ونگی خاندان کے شاہی اختیارات غصب کرلئے تو پھر زیادہ زمانہ نہیں گزرنے پایا کہ اُنھوں نے شاہی خطاب پر بھی قبضہ کرلیا۔ جب ایک بار حکومت کا اصلی اختیار بادشاہ سے نکل کر وزرا کو حاصل ہوگیا تو پھر وزرا کے اختیار جمہوریت کے رنگ میں آجاتے ہیں اور شاہی ایک خیالی شئے رہ جاتی ہے[۱]۔ سلطنت کا سرتاج ہونیکے لئے ایک کارکن شخص کے بجائے

---

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ اُنھوں نے اس سے یہ کام نکالا کہ بادشاہی سے پورے طور پر ملکوتی نکالا ہو جائے۔

[۱] ۱۸۴۸ء کی فرانک فرٹ کی پارلیمنٹ کے انتہا پسند جمہوری فریق کا یہ کہنا بالکل بیجا نہیں تھا کہ آئینی بادشاہت

ایک نمایشی علامت مقرر کرلینا تخیل پرستی ہے بادشاہست نہیں ہے۔

۴۔ بادشاہ کا شخصی اخلاق کوئی اہمیت نہیں رکھتا

ان وجوہ سے یہ دعوے بھی ناممکن ہے کہ آئینی بادشاہت میں بادشاہ کے شخصی عادات واطوار سے کوئی بحث نہیں ہے۔ یعنی اسکا کوئی اثر نہیں پڑتا کہ وہ ایک ممتاز شخص ہے یا ایک وجود معطل۔ ذہین ہے یا بلید۔ اس کے اخلاق شریفانہ ہیں یا اوباشانہ۔ آئینی بادشاہت کا منشا یہ ہے کہ بادشاہ ایسا ہونا چاہئے کہ جہانتک ممکن ہو اُسے آزار پہنچانیکی قوت نہ ہو مگر اسکے ساتھ تاحد امکان اُس میں نفع رسانی کی قابلیت ہو۔ اُسکے امتیاز کا محدود ہونا صرف اسی مفہوم میں ہوسکتا ہے وہ اپنے وزرا کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی نہیں ہوتا۔ یہ طریقہ تو نہایت ہی لغو و مہمل ہوگا کہ سلطنت میں سب سے بڑی منزلت کا شخص مردانہ وار عظمت و صفات سے معرا سمجھا جائے اور جس شخص کو سب سے زیادہ سیاسی حقوق حاصل ہوں اسی کو سب سے کم سیاسی آزادی حاصل ہو۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ لوگ بادشاہ سے وفاداری اور محبت کا اظہار کریں حالانکہ وہ یہ سمجھتے ہوں کہ اُسکا ان امور کا اہل ہونا اور نہ ہونا برابر ہے بلکہ یہ بھی نہ معلوم ہو کہ وہ ان خیالات کو سمجھنے اور اُنکا بدل کرنیکی قابلیت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ اس اصول کا منطقی نتیجہ تو یہی نکلیگا کہ آئینی بادشاہت کے لئے سب سے موزوں وہ حکمران ہے جو سب سے زیادہ کمزور ہو اور جس میں دوربینی اور اصابت رائے کا مادہ بالکل نہ ہو[1] کیا یہ ممکن ہے کہ اس قسم کی سلطنت سے قوم کی یہ تمنا پوری ہو سکے کہ سلطنت کے ہر جزو میں ایک توازن اور اسکے انتظام میں جان ہونا چاہئے۔

اس خیال کی تائید بالعموم انگلستان کے نظام سلطنت سے کیجاتی ہے مگر انگلستان

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ۔ ایک منصب ہے بلا اختیار کے اور ایک ٹوپی ہے بغیر سر کے۔ اسکے سوا اُسکا کوئی کام نہیں ہے کہ ایک وزیر اعظم مقرر کردے (جو بالعموم اُسکے مخالف ہوتا ہے) اور اپنے ایک جانشین کی پرورش کرے۔

[1] ہیگل نے اپنی کتاب "فلسفۂ حقوق" (ف ۲۰۰) میں یہ دعوی کیا ہے کہ بادشاہ کا کام اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ "ہاں" کہدے اور دستخط کردے لیکن یہ خیال حد سے متجاوز ہے اُسے جسطرح "ہاں" کہنا پڑتا ہے اُسی طرح نہیں بھی کہنا پڑتا ہے اور اسے صرف ضابطے کا حکم ہی نہیں دینا پڑتا بلکہ اسکے الفاظ فی الواقع حقیقی حکم یعنی فیصلے کے سوا بوقت ضرورت اُسے خود اپنی طرف سے بھی پر زور تائید کرنی چاہئے ایسی حالت میں ٹی۔ ہ فیشتے کا یہ قول صحیح ہوگا کہ "سب سے زیادہ بے مغز متولی اس کام کیلئے سب سے بہتر شخص ثابت ہوگا"

ہیں بادشاہ کی شخصیت کی طرف سے لاپروائی نہیں برتی جاتی بلکہ صورتِ معاملات بالکل اسکے برعکس ہے[1]

۵۔ بادشاہ صاحب تخت و تاج ہے مگر کارفرما نہیں ہے۔

اسی طرح تیرس کا یہ اصول موضوعہ بہت مشہور ہے کہ "بادشاہ صاحب تخت و تاج ہے مگر کارفرما نہیں ہے" مگر اسسے بھی ہم آئینی شاہی کے اصول کی صحیح تعریف نہیں سمجھ سکتے۔ یہ صاحبِ دانش وزیر خود ہی اس اصول کو عمل میں لانے سے قاصر رہا۔ یہ قطعی ہے کہ لوئس فلپ کے زوال کا باعث یہ نہیں تھا کہ وہ صاحبِ تاج ہونیکے ساتھ کارفرما بھی ہونا چاہتا تھا۔ اور اسکے جانشین نپولین سوم کی عوام میں ہردلعزیزی کی اصل وجہ یہی تھی کہ اُس نے کارفرمائی کو اپنے قبضہ قدرت میں رکھا۔

صاحب تاج و تخت ہونیکے معنی یہ ہیں کہ شاہی جلالت و عظمت کے حقوق باضابطہ حاصل ہیں اور کارفرمائی کا مفہوم یہ ہے کہ سلطنت کی روش کا عملاً انصرام کیا جائے۔ یہ دونوں حقوق یکساں طور پر سلطنت کے سرتاج سے تعلق رکھتے ہیں اور اُسکے لئے موخرالذکر کا انکار کرنا یعنی بالفاظ دیگر اُسے ظاہریت کا عطا کرنا اور اصلیت کا اُس سے سلب کر لینا، شاہی اقتدار کو فنا کر دیتا ہے۔

کارفرمائی (حکومت) اور نظم و نسق (Administration) میں خلط نہ کرنا چاہئے۔ بادشاہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ہمہ تن نظم و نسق کے معمولی جزئیات میں غرق ہوجائے اور اُسکا ایسا کرنا سلطنت کے لئے مفید بھی نہیں ہے۔

۶۔ یہ کہ بادشاہ کو کثرت رائے کا تابع ہونا چاہئے۔

جن لوگوں نے رعایا کے اقتدار اعلےٰ کے اصول کو پیش نظر رکھا ہے انکا دعوےٰ یہ ہے کہ "آئینی بادشاہت میں" بادشاہ پر لازم ہے کہ رعایا کی کثرت رائے اور اُسکی مرضی کے موافق حکومت کرے" یہ اصول بادشاہت کو عمومیت پر نثار کر دیتا ہے۔ کثرت رائے کی حکومت بھی

[1] ہیروسیم کی تصنیف "مدبران عہد جارج سوم" کے پڑھنے سے ہر شخص کو یہ یقین ہوجائیگا کہ بادشاہ کی شخصیت کا کس قدر زبردست اثر وزرا پر پڑتا ہے۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ بادشاہ کی مرضی کی کوئی اہمیت نہیں ہے (بلنچلی نے اس امر کو فراموش کردیا ہے کہ جارج سوم کا دورِ حکومت انگلستان کی تاریخ میں ایک مستثنیٰ زمانہ ہے جس میں بادشاہ نے یہ کوشش کی اور ایک مدت تک اُسے کامیابی بھی ہوئی کہ وہ اپنے پیشرؤوں کی بہ نسبت حکمرانی میں زیادہ دخیل ہوجائے۔ انگریزی مترجم)

عمومیت ہے لیکن درحقیقت بادشاہت کی اعلےٰ خوبیوں میں سے ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ قلیل التعداد فریق کو کثیر التعداد فریق کی درازدستی سے محفوظ رکھے۔ اگر بادشاہ محض کثرت رائے کا نمایندہ و خادم ہو جائے اور فی الحقیقت سلطنت کثرت رائے کے زیر فرمان آجائے تو بادشاہی کا خاتمہ ہے۔ اسطرح پر جو عمومیت پیدا ہو جائیگی، ممکن ہے کہ وہ بادشاہ کو نمائش کے طور پر اُسکے منصب اعلیٰ پر قائم رکھے مگر اُسکا اس منصب پر قائم رہنا اُسی وقت تک ہوگا جب تک اُسکے آقاؤں کو اپنی اصلی طاقت کے پوشیدہ رکھنے کی حاجت ہوگی۔[1]

---

[1] ۱۷۸۹ء میں فرانس کی قومی مجلس نے ٹھیک یہی کرنا چاہا تھا۔ تیرس نے اس مجلس کے متعلق اپنی تصنیف "فرانسیسی انقلاب" (Revolution franeaise) جلد ۲ صفحہ ۱۹۸ میں بہت صحیح کہا تھا کہ "اسکے خیالات جمہوری ہیں اور اس کے محسوسات شاہی ہیں" تاریخ نے یہ ثابت کر دیا کہ اس حالت کا قائم رہنا ناممکن ہے۔ فرانس میں بے اختیار بادشاہت کو مختار مطلق جمہوریت نے تباہ کر دیا (۱۷۹۲ء)

# سولھواں باب

## ۳۔ شاہی کا اصول اور آئینی شاہی کا نصب العین

آئینی شاہی کا تصور یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سچی شاہی ہو نہ یہ کہ محض ایک وہمی شاہی ہو۔

شاہی کی حقیقی خصوصیات

شاہی کا اصل اصول یہ ہے کہ سلطنت کا اقتدار اعلیٰ اور اسکی عظمت ایک متنفس میں، مجسم ہو کر ظاہر ہو۔ اُس میں اور مذہبی شاہی میں فرق یہ ہے کہ شاہی طریق میں حکمرانی کا حق خود بادشاہ کو حاصل ہوتا ہے اور مذہبی حکومت میں اصلی حکمران خدا ہوتا ہے اور بادشاہ صرف اُسکا مظہر ہوتا ہے۔ جمہوریت میں اور اُس میں فرق یہ ہے کہ جمہوریت میں ایک صدر یا رئیس ہوتا ہے جو خود کو قلیل التعداد طبقۂ اعیان یا کثیر التعداد عوام کا خادم یا نائب سمجھتا ہے۔ برعکس اسکے بادشاہ کسی کا تابع نہیں ہوتا بلکہ وہ حکومت پر آزادانہ قبضہ رکھتا ہے۔ جمہوریت میں سیاسی اقتدار کا اظہار مجموعی حیثیت سے ہوتا ہے اور شاہی میں انفرادی حیثیت سے بلند نظر سے دیکھا جائے تو بادشاہ گویا سلطنت کا مجسمہ ہوتا ہے۔

اس خیال کے دو پہلو ہیں اور اگر بادشاہی کا نام قائم رکھنا ہے تو دونوں کا وجود برقرار رہنا چاہئے۔

۱۔ سلطنت کے سر تاج کو اقتدار اعلیٰ کے اکیلے قائم مقام اور نمایندہ ہونکی حیثیت سے شخصی علوئے مرتبت حاصل ہونا چاہئے۔

۲۔ بادشاہ کی ذات میں سلطنت کی اعلیٰ ترین عظمت و قوت حقیقتاً مجتمع ہونا چاہئے۔

اس میں وضع قانون کی نگرانی اور وزرا کی شرکت کا امکان ہے

بادشاہ کے دائرۂ عمل کے دو مرکز ہیں: ایک بادشاہ کا خود مبدائے عمل ہونا دوسرے اوروں کے کام کو منظوری بخشنا۔

۱۔ پہلے اصول میں امور ذیل داخل ہو سکتے ہیں:—

(۱) قوم کے دیگر اجزا کے قائم مقاموں کے ذریعے سے وضع قانون میں بادشاہ کے افعال کی روک تھام۔

(۲) بادشاہ کی یہ ذمہ داری کہ وہ اپنے حقوق و فرائض کے عملدرآمد میں وزرا کو شریک رکھیگا، اسلئے کہ جماعت عامہ کے دوسرے ارکان کی حیثیت کتنی ہی اعلےٰ و ارفع کیوں نہ ہو

بادشاہ کی حیثیت ہر حال میں اس سے بالاتر ہوگی اور اس طریق کے اجراسے کہ بادشاہ کی مرضی اسکی ذاتی مرضی نہیں ہوگی بلکہ سلطنت کی مرضی ہوگی، نظام سلطنت درحقیقت بادشاہ کے بوجھ کو ہلکا کر دیتا ہے اور اسکے اقتدار کو غلط فہمی اور بربادی سے محفوظ رکھتا ہے مگر یہ اصول اس خیال سے موافقت نہیں رکھتا کہ

(۱) بادشاہ کوئی ذی روح شخص نہیں ہے بلکہ وہ محض ایک مورت ہے

(۲) بادشاہ قوم کے قائم مقاموں یا اپنے وزیروں کے تابع ہے اور وہ اُسے مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی کے مخالف خیال ظاہر کرے یا اپنی مرضی کے خلاف عمل کرے۔

لیکن بادشاہ کو باضابطہ اس کا پابند اور تابع بنانا ممکن نہیں۔ بادشاہ کے لئے کس قدر آزادی لازمی ہے۔

چونکہ اعلیٰ اقتدار کا تعلق بادشاہ کی ذات سے ہے، اسلئے لازم ہے کہ اُسکی ذات کی آزادی اور اُسکے حقوق قائم رہیں[۱]۔ اسکی ذات ہر اعتبار سے اور کلیۃً سلطنت سے متعلق نہیں ہوتی بلکہ یہ تعلق ایک خاص حد تک ہوتا ہے، البتہ دوسرے لوگوں کی بہ نسبت یہ تعلق زیادہ ہوتا ہے۔ وہ شوہر بھی ہے، باپ بھی اور کسی کلیسا کا رکن بھی یا یہ بھی ممکن ہے کہ عالم یا شاعر ہو، لیکن تمام معاملات عامہ میں سلطنت کی رائے کا اظہار اُسی کی ذاتی رائے سے ہونا چاہئے۔ شاہی سلطنت میں یہ بات نہایت اہم اور ضروری سمجھی جاتی ہے کہ بادشاہ سلطنت کے امور میں اپنی ذاتی فکرمندی اور ذاتی مستعدی کو کام میں لائے۔ اُسے سب سے برتر حقوق دینا اور پھر اسی بنا پر اسے دوسروں کی نگرانی میں رکھنا سراسر لغو فعل معلوم ہوتا ہے۔ ایوانہائے مبعوثین سے قانون نہیں پیدا ہوتا بلکہ قانون کی قوت اُسی وقت ہوتی ہے جب اُسے بادشاہ کی آزادانہ مرضی حاصل ہوتی ہے۔ بادشاہ کے احکام کا اقتدار وزرا سے نہیں ہوتا بلکہ وزرا خود اپنے اقتدار کے لئے بادشاہ کے دست نگر ہوتے ہیں اور اگرچہ وہ اسکی مرضی کے اظہار کے لئے لابدی آلہ ہوتے ہیں مگر پھر بھی آلہ ہی ہوتے ہیں۔ نظام سلطنت کی

---

[۱] گیزو تصانیف (Memoires) جلد ۲ صفحہ ۲۳۷: "صرف خدا ہی حکمران ہے اور اس عالم خاکی کا کوئی شخص خدا نہیں ہے خواہ وہ عوام میں سے ہو یا بادشاہوں میں سے۔ عوام کا ارادہ کسی کو بادشاہ بنا دینے کیلئے کافی نہیں؛ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو شخص بادشاہ بنے وہ اپنے میں بعض فطری اور ذاتی شاہانہ خصوصیتیں رکھتا ہو اور یہ خصوصیتیں اُس نے اُس ملک کو گویا جہیز میں دیدی ہوں جسکے ساتھ اُس نے اپنی ذات کو وابستہ کیا ہے۔"

رو سے بادشاہ جس حد تک دوسرے اعضائے سلطنت کی منظوری و امداد کا پابند نہیں ہوتا اُسی حد تک اُسے کامل آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنی شخصی مرضی کا اظہار کرے یا اُس کے موافق عمل پیرا ہو۔

مجلس وضع قوانین اور وزرا سے اسکا تعلق

شاہی کے دوسرے اقسام کے مقابلے میں آئینی بادشاہت کی خصوصیت یہ ہے کہ بادشاہ نہ تو بطور خود قانون نافذ کرسکتا ہے اور نہ بالعموم وہ تن تنہا حکومت کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ وضع قوانین کے لئے ایوانہائے مبعوثین کی منظوری ضروری ہے اور حکومت کے کاموں کے لئے وزرا کی شرکت لازمی، لیکن آئینی بادشاہت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ محور حکومت ایوانہائے مبعوثین یا وزرا کی طرف منتقل ہوجائے۔

جس طریق حکومت میں ایوانہائے پارلیمنٹ اور وزرا کی کثرت رائے باضابطہ اور لازمی طور پر بادشاہ کے افعال کو معین کردے وہ حکومت بلاشبہ شاہی اصول کے مخالف ہے۔ اُسے درحقیقت پارلیمنٹ اور وزرا کی حکومت کہنا چاہئے[1]۔ اس میں شک نہیں کہ عملاً ایک آئینی بادشاہ اکثر ایوانہائے مبعوثین کے فیصلے اور وزرا کے مشورے کو منظور کریگا کیونکہ وہ انھیں سلطنت کی مرضی عام کا اظہار سمجھتا ہے لیکن اگر وہ بہ حیثیت بادشاہ کے اپنے فرائض کے ادا کرنیکا خواہاں ہو تو اُسے لازم ہے کہ وہ اپنے اس آزادانہ حق کو محفوظ رکھے کہ وہ بطور خود ان معاملات کی جانچ قومی بہبودی کے نقطۂ نظر سے کرے گا۔ ان حدود کے اندر ایک آئینی بادشاہ پوری آزادی کے ساتھ کارروائی کرسکتا ہے۔

یہ خیال بالکل لچر ہے کہ بادشاہ کو خاص اپنی رائے کے اظہار سے روکنا چاہئے۔ ہر ایک ذی فہم شخص کو اپنے اصلی خیالات کا اظہار کرنا ضروریات زندگی میں سے ہے۔ اور اگرچہ سیاسی ضروریات اکثر بادشاہ کو اُسکے خیالات کے اظہار سے روک دیتی ہیں مگر کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اُسکی آزادی تقریر سے انکار کرے یا اُسے دروغ بیانی پر مجبور کرے[2]۔

بادشاہ پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ ملک کی حالت کو خود اپنی آنکھ سے دیکھے اور اپنے کان سے سنے۔ اُسے چاہئے کہ رعایا کی ضروریات سے باخبر رہے۔ معاملات عامہ کی تمام کیفیات پر نگاہ رکھے اور جب عام اغراض اور بہبود عام کا اقتضا ہو تو وہ اپنی جانب سے

---

[1] اس قسم کی حکومت کا ذکر تفصیل کے ساتھ آگے ساتویں مقالے میں آتا ہے۔

[2] دیکھو اشٹال کی تصنیف ''شاہی کا اصول'' (صفحہ ۹) جس میں اس مبحث پر قابل توجہ خیالات کا

ضروری قوانین اور کارروائیوں کے اجرا وامضا میں تاخیر نہ کرے ۔ یہی روش ہے جس پر چلکر سلطنت کے بڑے بڑے بادشاہوں نے ناموری حاصل کی ہے. آئینی بادشاہی اس قسم کے معاملات میں قابل بادشاہوں کے لئے میدان ترقی مہیا کردیتی ہے. اُسے چاہئے کہ اس میدان کی راہوں کو بند نہ کرے ۔

آئینی بادشاہ کے حقوق اور اختیارات

۲ ۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ سلطنت میں بادشاہ کو سب سے بلند رتبہ اور کامل اختیار حاصل ہونا چاہئے ۔ انگریزی نظام سلطنت نے بھی اس اصول کو قبول کرلیا ہے حالانکہ اس نظام سلطنت میں شاہی حقوق پر اس قدر قیود عائد ہیں کہ براعظم کے اکثر بادشاہ اسے ناقابل برداشت سمجھیں گے ۔ اس اصول سے نتائج ذیل پیدا ہوتے ہیں :۔

۱ ۔ آئینی بادشاہی منفرد شاہی اقتدارات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ جملہ اقتدارات شاہی پر تمام وکمال حاوی ہے ۔ مطلق العنان بادشاہی اس اعتبار سے اُس سے تجاوز ہے کہ وہ دوسری سیاسی جماعات کو نہ تو آزادانہ حقوق دیتی ہے نہ شاہی حقوق کے عملدرآمد میں انھیں لازمی طور پر شریک کرتی ہے، وہ خود تمام حقوق کی دعویدار ہوتی ہے اور دوسروں کو صرف اپنی مرحمت کا امیدوار رکھتی ہے ۔ برخلاف اسکے آئینی بادشاہی اسکی پابند ہے کہ وہ دوسری جماعات کے حقوق اور رعایا کی آزادی کو تسلیم کرتی ہے ۔

۲ ۔ وضع قوانین میں بادشاہ کا حصہ ہوتا ہے اور نفس قانون کے اعتبار سے یہ حصہ علی العموم قطعی ہوتا ہے اور شکل قانون کے اعتبار سے ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے ۔ ایسے تمام قوانین کے متعلق ہدائت اور منظوری کا حق ہوتا ہے اور یہ قوانین اسی کے نام سے شایع ہوتے ہیں ۔ اگر اس اساسی قاعدے سے انکار کیا جائے تو شاہی اصول میں جمہوری اثرات دخیل ہوجاتے ہیں ۔ اعلیٰ اقتدار ایوانوں کو ملجاتا ہے اور جہانتک توضیع قوانین کا تعلق ہے بادشاہ ان ایوانوں کے تابع ہوجاتا ہے ۔ شاہی میں ایوانوں کے حقوق متوازی ہوسکتے ہیں، اسکی نہیں ہوسکتے ۔

---

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ ۔ اظہار کیا گیا ہے ۔ لوتھر اپنی (Tischreden Table Talk) میں کہتا ہے کہ "کسی بادشاہ میں اس سے زیادہ تلطف آمیز اور قابل وصف کوئی فعل نہیں ہوسکتا کہ وہ آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرے اور جو کچھ اسکے دل میں ہو اُسے قولاً و فعلاً کردکھائے ۔" وہ دوسروں کی آزادی تقریر کی کیونکر وقعت کریگا جب کہ خود اسکی آزادی پر قیود عاید ہوں ؟

۳- تمام حکومت بادشاہ کی ذات میں مجتمع ہوتی ہے یعنی حکمرانی اسکا آزادانہ حق ہوتا ہے اور حکومت کی تمام کارروائیاں اُسی کے نام سے عمل میں آتی ہیں۔

آئینی بادشاہت میں وزرا یا عمال اپنے نام سے حکومت نہیں کرسکتے لیکن اسکے ساتھ ہی بادشاہ بھی اُنکے اتفاق وامداد کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا۔ اُنکے تمام حقوق وفرائض شاہی اختیار سے ماخوذ ہوتے ہیں اور ازمنہ وسطیٰ کی جاگیری بادشاہت کی طرح وہ اپنے مقصد کے لئے اُن حقوق کو کام میں نہیں لاسکتے بلکہ صرف سلطنت کے لئے انھیں استعمال کرسکتے ہیں اور وہ بھی اس طرح پر کہ سلطنت کا علی اتحاد قائم رہے جس طرح قانون سازی کے معاملے میں اسی طرح وزرا کے متعلق بھی بادشاہ کو ہدایت عمل اور منظوری کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ ہدایت کے حقوق کو وزرا بھی کام میں لاسکتے ہیں مگر منظوری کا حق بادشاہ کی ذات واحد سے مخصوص ہے اور وزرا کو صرف یہ حق حاصل ہے کہ وہ شاہی احکام سے اتفاق کرنے نہ کرنے میں آزاد ہیں [۵]

آئینی بادشاہت ازمنہ وسطیٰ کے اس اصول کو تسلیم کرتی ہے کہ تمام اقتدار، اعلیٰ سے شروع ہوکر اسفل کی طرف آتا ہے، اور حکومت مرکز سے دائرے کی جانب پھیلتی ہے، نہ اسکے برعکس، لیکن اب اس سے بچنے کی کوشش کیجاتی ہے کہ ازمنہ وسطیٰ کی طرح حکومت مختلف حقوق میں متفرق کردیجائے۔

۴- سلطنت کے تمام اعضا فرداً فرداً بادشاہ کے تابع ہوتے ہیں۔ اُس میں صرف وہی اعضا داخل نہیں ہیں جن کے افعال کلیۃً اسکی مرضی کے تحت میں ہوں بلکہ وہ وزرا بھی اس میں شامل ہیں جن کا اتفاق رائے بادشاہ کے لئے سلطنت کی مرضی کے اظہار کے قبل ضروری ہے۔ وہ جج بھی اُس میں داخل ہیں جن کے کام اُسکے حیطۂ اثر سے بالکل آزاد ہیں، یہاں تک کہ وہ ایوانہائے مبعوثین بھی اُسکی ماتحتی سے خارج نہیں ہیں جن کی قانون سازی کے

---

[۵] لورنتس فون اشتائن ("اصول نظم ونسق") جلد ۱ صفحہ ۸۶ اور آگے کے صفحوں میں) کارروائیوں کے جاری کرنیکے شخصی حق کو حکومت کے اختیار سے ممیز کرتا ہے اور یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اول الذکر کو قومی نمایندوں اور وزیروں دونوں کے اثر سے آزاد ہونا چاہئے۔ یہ نظریہ بادشاہوں کی مطلق العنانی کیلئے بہت عمدہ چور دروازہ بناویتا ہے مگر کلی آئینی تنظیم کیلئے مہلک ہے (دوسری اشاعت میں فون اشتائن نے اس مسئلہ پر اپنے خیالات کو بالکل بدلدیا ہے)

اختیارات سلطنت میں خود آزادانہ قوت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پس جس طرح سر جسم کے تمام اعضا پر فوقیت رکھتا ہے اسی طرح بادشاہ جسم سیاسی میں سب سے بلند حیثیت پر فائز ہوتا ہے۔

آئینی بادشاہی، ایک اضافی شئے ہے، کوئی مجرد شئے نہیں ہے۔ وہ مختلف تعلقات و ضروریات کے موافق رنگ اختیار کرتی اور قومی خصوصیت اور تاریخ کے مطابق ہیئت بدلتی رہتی ہے، اس لئے صرف انگریزی سلطنت سے اسکا تصور ذہنی قائم کرنا درست نہیں۔

آئینی بادشاہی کی مشترک خصوصیات

خصوصیات ذیل آئینی بادشاہی کی ہر صورت میں مشترک ہیں:-

(۱) بادشاہ کے رتبۂ اقتدار کی تجدید نظام سلطنت کی رو سے ہوتی ہے۔ آئینی فرمانروا نظام سلطنت سے خارج یا اس سے بالاتر نہیں ہے بلکہ اسی کے اندر داخل ہے۔ اس طرز حکومت کو آئینی اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں نظام سلطنت کے معیّن کردہ قانون انتظام کی توقیر مد نظر رہتی ہے اور بادشاہ اسکا پابند ہوتا ہے۔ نظام سلطنت کا تحریری ہونا یا نہ ہونا نظر انداز کرنیکی شئے نہیں ہے مگر اسکا تحریری ہونا لابدی نہیں ہے۔

انگلستان جو تمام آئینی بادشاہیوں کا مورث اعلیٰ سمجھا جاتا ہے، وہاں فرداً فرداً آئینی قوانین اور قومی آزادی کے تحریری اعلان موجود ہیں مگر تمام سیاسی انتظام کا کوئی مکمل اور باترتیب ضابطہ اس قسم کا نہیں ہے جسے موجودہ زمانے میں پسند کیا جاتا اور بالعموم نظام سلطنت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انگریزی قوانین، سیاسی جد و جہد کے نتائج اور قومی تاریخ کے مختلف دوروں کی مخصوص ضروریات سے بتدریج پیدا ہوئے ہیں برعکس اسکے، زمانۂ حال کے نظامہائے سلطنت بیشتر ایسے ہیں جو ایک ہی مرتبہ مکمل و منتظم قانونی نوعیت کے ساتھ کسی عام اصول سلطنت کے زیر اثر مرتب ہوئے ہیں۔

آئینی بادشاہی، دونوں صورتوں میں ممکن ہے، لیکن غیر تحریری قانون کی اہمیت پر اعتراض کئے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحریری منشور اور حقوق سیاسی کے تحریری اقرار ہمیشہ بہت ہی بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے تھے۔ یہ امر زمانۂ موجودہ کے حالات کے بالکل موافق ہے۔ یعنی زمانۂ مابعد میں حق کا احساس محض رسم و رواج کے تعلق سے نہیں پیدا ہوا ہے اور اسکے لئے جس حفاظت و وضوح کی ضرورت ہے وہ صرف تحریری دستاویزہی سے حاصل ہو سکتی ہے[1]۔

[1] البتہ بعض نظامہائے سلطنت محض کاغذ کے پرزے تھے چنانچہ فریڈرک ولہلم چہارم نے اپنی ایک شاہی تقریر میں بعض تحریری نظامہائے سلطنت کو "کاغذی نظام سلطنت" کہا تھا۔ اس لئے کہ یہ نظامہائے سلطنت کی نظریے

(۲) آئینی بادشاہ اس امر کا پابند ہے کہ وہ نہ صرف نظام سلطنت کے ایک ایک حرف کی وقعت کرے بلکہ سلطنت کے قوانین کو بھی موقر سمجھے۔ وہ صرف اُسی قدر اطاعت کی توقع اور خواہش کرسکتا ہے جو ازروئے قوانین و نظام سلطنت معین ہو۔

(۳) قانون سازی کا اختیار بادشاہ کو صرف بہ شمول مجلس نائبین حاصل ہوتا ہے۔ قانون کی اشاعت کے لئے اسے مجلس کے مشورے کی طرح اُسکی منظوری بھی لینا ہوتی ہے۔

(۴) مالی انتظامات اور محاصل کی منظوری کا انحصار مجلس نائبین کے اتحاد عمل اور اتفاق رائے پر ہوتا ہے۔

(۵) حکومت اور انتظام میں وزرا کی شرکت لازمی ہوتی ہے، بادشاہ کے فرامین، فیصلے اور احکام کسی تیسرے شخص پر اُس وقت تک واجب التعمیل نہیں ہوتے جب تک کہ بادشاہ کے دستخط کے ساتھ ایک وزیر کے دستخط بھی اُس پر نہ ہو جائیں۔

(۶) وزرا اور تمام دیگر عہدہ داروں کی ذمہ داری لابدہ لازمی ہوتی ہے۔

(۷) عدالتی اختیارات کی آزادی اور وزرا کی عدالتی فرائض کی انجام دہی سے علحدگی، حکومت پر ایک مناسب روک اور رعایا کے حقوق کی ایک اہم حفاظت کا کام دیتی ہیں۔

(۸) طبقات اور افراد کے شخصی اور ذاتی حقوق کے علاوہ عام حقوق بھی تسلیم کئے جاتے ہیں اور یہ حقوق مداخلت بیجا سے اُسی قدر محفوظ ہیں جس قدر خود بادشاہ کے حقوق۔

آئینی بادشاہی کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ایک آزاد قوم کی قومی بادشاہی ہے۔

---

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ۔ یا اصول کی بنا پر بنا لیئے جاتے ہیں اور قوم میں اُنکی بنیاد مستحکم نہیں ہوتی اسی وجہ سے اُن میں سے اکثر بہت آسانی سے تباہ ہوجاتے ہیں مگر کسی نظام سلطنت کو محض اُسکے تحریری ہونیکی وجہ سے "کاغذی نظام سلطنت" نہیں کہنا چاہئے بلکہ برعکس اسکے اس سے اُسکے قواعد کو مزید تقویت و طمانیت حاصل ہو جاتی ہے۔

# سترھواں باب

## اعیانی حکومت

### (الف) یونانی شکل سلطنت۔ اسپارٹا

جس طرح اتھنز سے قدیم عمومیت کی اعلیٰ ترین ہیئت کا اظہار ہوتا تھا، اسی طرح یونانیوں میں اسپارٹا اعیانی حکومت کا سب سے زیادہ نمایاں نمونہ تھا۔ یونانیوں کے طبایع عام طور پر اعیانی سلطنت کے بجائے عمومی سلطنت کی طرف مائل تھے اور صرف غیر ملکی وحشیوں کے مقابلے میں وہ اپنے کو ایک خلقی طبقۂ اعیان کہنا پسند کرتے تھے لیکن ڈورس کی نسل کے لوگ جن میں اہل اسپارٹا بھی داخل تھے اپنے اندرونی انتظامات میں بھی اعیانی ہیئت و خیالات کو مرجح سمجھتے تھے۔

اہل اسپارٹا کے طبقۂ اعیانی کی ابتدا۔

اعیانی حکومت کا برترین اصول یہ ہے کہ قوم کے زیادہ معزز عناصر کمتر درجے کے عوام پر حکمراں ہوں۔ ان معزز عناصر کی قدر و منزلت کے طریقے مختلف سلطنتوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ لکونیا میں اہل اسپارٹا حکمراں قوم سے تھے جنھوں نے اس ملک کو بزور شمشیر فتح کیا تھا اور قدیم باشندوں یعنی پیریوئکی اور لکے دیموئی قوموں کو اپنا مطیع بنا لیا تھا۔ راعی و رعیت نسلاً ایک دوسرے سے الگ تھے۔ فاتحین اولین نے حکومت کا نظم و نسق ایسا رکھا تھا کہ وہ اُنکے اخلاف میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا چلا جائے۔ پس اسطرح حاصل شدہ طاقت کے برقرار رکھنے کی کوشش میں تمام قدیم اعیانی حکومتوں کی مختص خصوصیت یعنی موروثی حقوق سیاسی، از خود پیدا ہو گئے اور یہی تمام سلطنت کا بنیادی اصول قرار دیا گیا۔

اُنکی تفرد پسندی

اہل اسپارٹا کی اس موروثی حکومت میں نسلوں کی آمیزش نے کسی قسم کا تغیر نہیں پیدا کیا تھا۔ اہل اسپارٹا اور غیر ملکیوں کے درمیان امتیاز ایسے سخت اور قطعی طور پر قائم رکھا گیا جیسے ذاتوں کا فرق قائم رکھا جاتا ہے، اور اُن میں باہمی مناکحت کی ممانعت کر دی گئی۔ بہت شاذ و نادر ایسا ہوتا تھا کہ غیر ملکی کو پورے ملکی حقوق دیئے جاتے ہوں۔ حکمراں نسل کو

نئے خاندان کی شمولیت سے کبھی تقویت نہیں دیجاتی تھی، نہ رعایا کو اس امید سے تسلی حاصل ہوتی تھی کہ اُسکے بہترین اخلاف کبھی اپنی ذاتی قابلیت سے سلطنت میں بلند مرتبہ حاصل کر سکیں گے۔ یہ تفرد پسندی اس وجہ سے اور بھی زیادہ عجیب اور تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے کہ اہل اسپارٹا دیگر اعتبارات سے اپنی نسل کے خالص رکھنے کی چنداں پروا نہیں کرتے تھے۔ اسپارٹا کی وہ عورتیں جن کے شوہر جنگ میں کام آجاتے تھے نیم غلاموں سے ہمبستر ہوتی تھیں تاکہ اُن سے جو بچے ہوں وہ اسپارٹا کی قوم میں شامل کر لئے جائیں۔

تعلیم

لیکن تعلیم کا انتظام زیادہ غور و فکر کے ساتھ کیا گیا تھا اور اُسی سے نسل کی فوقیت کی تکمیل کی گئی تھی۔ منشا یہ تھا کہ دونوں باتیں ملکر اہل اسپارٹا کے امتیاز کو محفوظ رکھیں۔ سلطنت کو اپنے نوجوانوں کو سیاسی اور فوجی تعلیم دینے کا اس قدر خیال تھا کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے خاندان کے اتحاد و آزادی کو قربان کر دینے میں بھی دریغ نہیں کرتی تھی۔ اسپارٹا سے زیادہ کسی جگہ انفرادی زندگی اس درجہ سلطنتی زندگی کے تابع نہیں تھی۔ نہ کہیں سلطنت کا اختیار مطلق اس حد تک بڑھا ہوا تھا، وہاں انسان کا وجود صرف سلطنت کے لئے سمجھا جاتا تھا۔

داخلی مساوات

خود اپنے حلقے میں تمام اہل اسپارٹا کے حقوق یکساں تھے اور اس اعیانی حکومت میں جمہوری مساوات کو اس درجہ وسعت دیگئی تھی کہ لیکرگس نے اسے اپنے نظام سلطنت کی بنیاد قرار دیا کہ تمام خاندانوں کی جائدادیں برابر ہوجائیں۔ زمین کی تقسیم کے وقت ہر خاندان کو برابر حصہ دیا گیا تھا اور اس سے علیحدہ ہونیکی ممانعت ہوگئی تھی۔ اس خیال سے کہ لوگ شخصی ملکیت جمع کر کے امیر و غریب کا فرق نہ پیدا کر دیں سونے اور چاندی کا استعمال ممنوع قرار پاگیا تھا، وہ نیم غلام جو اہل اسپارٹا کی زمینوں کی کاشت کرتے تھے اشخاص کی ملک نہیں ہوتے تھے بلکہ خود زمین کی طرح سلطنت کی ملک ہوتے تھے اور انھیں جنس کی قسم سے جو معاوضہ ملتا تھا وہ ازروئے قانون سب میں برابر تقسیم ہوجاتا تھا۔ یہانتک کہ عام کھانا جس میں اہل ملک مختلف دسترخوانوں پر منقسم ہوجاتے، وہ سب کے لئے عام اور یکساں ہوتا تھا پس اسطرح اسپارٹا کی اعیانی حکومت والوں میں اہل ایتھنز کی جمہوری حکومت کے مقابلے میں مساوات زیادہ مکمل اور مستحکم تھی۔

تنظیمات ملکی

لیکن حکومت اسپارٹا کا عملدرآمد کسی نوع سے جمہوری نہیں تھا کیونکہ سلطنت

اور قوم دونوں کی استعداد طبیعت حقیقتاً اُسکے خلاف تھی۔ اسپارٹا میں اکلیسیا (مجلس عام) ضرور موجود تھی مگر اصلی اختیارات سینات کے ہاتھ میں تھے اور بالعموم یہی مجلس تمام امور عامہ کا فیصلہ کرتی تھی[1] اہم معاملات میں اسکے فیصلے مجلس عام میں پیش ہوتے تھے مگر اُنکی نسبت صرف منظوری یا نامنظوری کا اظہار ہوسکتا تھا۔ اس آخر الذکر مجلس میں بادشاہ، حکام اور سیناتیوں کے سوا اور کوئی تقریر نہیں کرسکتا تھا اور تیس برس سے کم عمر کا کوئی شخص رائے نہیں دے سکتا تھا۔

سینات

سلطنت کی ترتیب و ترکیب اعیانی خیال کے موافق منضبط تھی۔ اسپارٹا کے خاندانوں کے نو ہزار سرگروہ تیس حلقوں میں منقسم تھے جنھیں رومی کوریوں[2] سے تشبیہ دے سکتے ہیں، دو شاہی حلقے دو بادشاہوں کو اور باقی اٹھائیس حلقے ایک ایک رکن سینات کو نامزد کرتے تھے۔ یہ سیناتی ایک حد تک بادشاہ کے ہمسر ہوتے تھے۔ پس اسطرح سینات تیس ارکان پر مشتمل تھی اور اس انتظام سے کسی ایک خاندان کی خاص فوقیت نہیں پیدا ہوسکتی تھی، لیکن اسکے ساتھ ہی تمام خاندان کے مجموعی حقوق اور اُنکی وقعت قائم رہتی تھی۔ اہل اسپارٹا عقل و دانش کی نشانیاں پیرانہ سری کو سمجھتے تھے اور اُسکا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ بادشاہ کے سوا تمام سیناتیوں کے لئے لازمی تھا کہ انکی عمر ساٹھ برس سے کم نہ ہو۔ عمر کے متعلق حد سے بڑھا ہوا لحاظ نظام سلطنت پر ایک دھبا معلوم ہوتا ہے۔ سالخوردگی سے عقل کے ساتھ کمزوری بھی پیدا ہوجاتی ہے سلطنت کے کام چلانیکے لئے صرف بڈھوں کے تجربے ہی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ جوانوں کی قوت کار و جوش کی بھی حاجت ہوتی ہے۔ انتخاب مجلس عام کی رائے سے ہوتا تھا مگر امیدوار اُس مجلس کو پہلے سے اپنا ہم رائے بنا لیتے تھے۔ اس بلند رتبے کے حصول رائے کیلئے بڈھے اشخاص اپنا یہ اعتماد ظاہر کرتے تھے کہ ان میں ابتک اتنی قوت ہے کہ وہ سلطنت کی خدمت عمدگی سے انجام دے سکیں۔ اور وہ اپنی بقیہ زندگی سلطنت کی خدمت کے لئے وقف کرنے پر آمادہ ہیں۔ مجلس کی منظوری

---

[1] اہل اسپارٹا کی اکلیسیا وہی اختیار اور اہمیت رکھتی تھی جو ہومر کے زمانے میں قدیم یونان کی قومی جمعیتوں کو حاصل تھے۔

[2] (لاطینی: کوریا (Kuria) جمع کورئے (Kuriae) اردو مترجم)

گویا قوم کے عام اعتماد کا اظہار تھی۔ یہ عہدہ عمر بھر کے لئے ہوتا تھا اور اس سے یہ اطمینان ہو جاتا تھا کہ عام لوگ خود غرضانہ جوش میں تغیر و تبدل نہ کر سکیں گے مگر اسکے ساتھ ہی اس میں یہ نقصان بھی تھا کہ باوجود کمزور اور کام سے ناقابل ہو جانیکے لوگ عہدے سے دستکش نہیں ہوتے تھے۔

بادشاہ اور حکام

اسپارٹا کی اعیانی حکومت دو طریقوں پر محدود تھی، ایک طرف سے بادشاہی نے (جس سے سلطنت کی وحدت و عظمت کا اظہار زیادہ شاندار طور پر ہوتا تھا) اُسے محدود کر رکھا تھا دوسری طرف سے تقرر حکام کے جمہوری انتظام نے اُسے محصور کر دیا تھا۔ حکام کا تغیر و تبدل خود رعایا کی طرف سے عمل میں آتا تھا اور بادشاہ اور سینات دونوں کے فرائض کی انجام دہی انھیں کے اختیار میں ہوتی تھی اور معاملات سلطنت میں انھیں وسیع عدالتی اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے۔

نظام سلطنت کی یہ حقیقت مصنوعی تھی

اسپارٹا کے اس نظام سلطنت کا اثر دل پر ایک مصنوعی شئے کا سا ہوتا ہے۔ افلاطون کی "ریپبلک" کی طرح اسکی ظاہری خوبی اور ہمرنگی سے حسن و جمال کے احساس کو فرحت حاصل ہوتی ہے لیکن باطناً اسکی حالت اس قدر غیر طبعی ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اس سے رغبت کے بجائے نفرت پیدا ہو جاتی ہے اس عمارت کے نقش و نگار سے طبیعت خوش ہو سکتی ہے مگر اُس میں رہنے کی خواہش نہیں پیدا ہو سکتی۔ اگر اہل ایتھنز اس الزام کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک منتظم سلطنت کے بجائے ہنگامہ آرا حکومت کو ترجیح دی تو اہل اسپارٹا پر بھی یہ الزام عاید ہو سکتا ہے کہ انھوں سیاسی تنظیم پر انسانی آزادی کو قربان کر دیا۔

اہل ایتھنز کے مقابلے میں ان کا طریق زیادہ ممتاز ہے مگر وہ اُس قدر مسرت انگیز اور آرام دہ نہیں ہے۔ ایک میں قابلیت سیاسی کا یکساں توازن قائم کیا گیا ہے، دوسرے میں روشنی اور تاریکی دونوں اپنی اپنی جگہ پر بڑھی ہوئی ہیں۔ ایک ضرورت سے زیادہ ساکن ہے اور دوسرا ضرورت سے زیادہ متحرک۔

اسکا قیام و بقا

قیام کی بقا کے اعتبار سے اسپارٹا کے نظام سلطنت کو بہت فوائد حاصل تھے۔ سولن نے نسل اور دولت کے اعیانی عناصر کے امتزاج سے، جو عمومیت قائم کی تھی اس پر اس مطلق العنانی کو غالب آتے ہوئے دیکھتا رہا اور اُس کی روک نہ کر سکا۔

ان مطلق العنانوں کے زوال کے بعد ایتھنز میں خالص عمومیت قائم کی گئی مگر سو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ اُسکی حالت ایسی ابتر ہوگئی کہ کوئی امید باقی نہیں رہی۔ اس کے برخلاف لکرگس کے نظام سلطنت نے پانچسو برس تک اسپارٹا کی عظمت کو قائم رکھا اور جب اسپارٹا کو زوال ہوا تو اس وجہ سے ہوا کہ نظام سلطنت کے خلاف کیا گیا۔ لوگوں نے دولت جمع کرلی اور دولت سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ اُن میں پیدا ہوگئیں اور حکام نے عوام سے ملکر فریقانہ سازشیں شروع کردیں۔ سلہ اس نظام سلطنت کا اتنے دنوں تک قائم رہنا اس وجہ سے اور بھی تعجب خیز معلوم ہوتا ہے کہ جب ہم اسکے ضوابط کو دیکھتے ہیں تو وہ فطرت انسانی اور واقعات حاضرہ دونوں کے خلاف معلوم ہوتے ہیں لیکن ایک حد تک اس دیرپائی کی وجہ یہ بھی تھی کہ اُس کے بانی کی نسبت قوم کا یہ خیال تھا کہ وہ زیرے اُس کا سورِ عنایت اور خود ایک دیوتا ہے اور اس وجہ سے وہ اس نظام سلطنت کو ربانی قانون کہتے تھے۔

کریٹ کا نظام سلطنت بھی ایسا ہی تھا اور رکارتھیج میں اسی طرح اعیانی نظام سلطنت رائج تھا، اور یہ دونوں اپنی مدت قیام کے متعلق فخر کرسکتے ہیں (ب) درحقیقت تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اعیانی حکومتیں چونکہ اپنے انتظام میں لقائے سلطنت کو اصل اصول قرار دیتی ہیں، اس وجہ سے وہ اپنے کو اور اپنی سلطنت کو اُس سے زیادہ مدت تک قائم رکھ سکتی ہیں جتنے زمانے تک کہ عمومیات اپنی حکومت کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔

---

سلہ لورنٹ اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ اس نظام سلطنت کی یہ عدم تغیر بھی اسپارٹا کی ویرانی کا ایک باعث ہوئی۔

(ب) ارسطو نے "سیاسیات" میں اسپارٹا، کریٹ اور کارتھیج تینوں کے نظامہائے سلطنت پر تنقید کی ہے۔

# اٹھارھواں باب

## (ب) روما کی اعیانی حکومت

اسپارٹا اور روما کے نظامہائے سلطنت کا مقابلہ

حقیقی اعتبار سے روما کی جمہوری سلطنت بالکل ویسی ہی اعیانی حکومت تھی جیسی اسپارٹا کی حکومت تھی۔ فرق تھا تو یہ کہ روما کی حکومت کا درجہ بلند تھا۔ اہل روما نے سلطنت کے حقوق عام اور افراد و قبایل کی آزادی میں قطعی اور بدیہی امتیاز قائم کر دیا تھا۔ سلطنت کے اقتدار و عظمت کا ایک نمایاں خیال اُنکے دلوں میں مرکوز تھا اور وہ اُسے ترقی دینے کے نہایت درجہ شائق تھے مگر انھوں نے انفرادی زندگی کو سلطنت کے سانچے میں ڈھالنے کے حق کا دعوے کبھی نہیں کیا۔ چنانچہ انھوں نے اس مصنوعی تنگ خیالی کو ترک کر دیا تھا کہ کسی قسم کا غیر ملکی جُز اپنے میں داخل نہ ہونے دیں۔ اس تنگ خیالی سے اسپارٹا کی قومی خوبی کا اپنی اصلی حالت پر قائم رہ جانا تو ممکن ہوا مگر اُس نے انکو بیرونی دنیا میں اس اہم حیثیت کے قائم رکھنے کے ناقابل بنا دیا جو قسمت سے انھیں حاصل ہوگئی تھی۔ اہل روما ابتدا ہی سے اسپارٹا کے ایسے طبقاتی امتیاز کی قید سے آزاد تھے۔ روما میں مختلف طبقات اسطرح سے بے حس و حرکت ایک دوسرے کے آمنے سامنے جمے کھڑے نہیں تھے کہ وہ ایک دوسرے کے کام کو معطل کر دیتے بلکہ وہ اپنی آپس کی کشمکش اور اپنے نوع بہ نوع اثرات سے سیاسی زندگی کے اعلیٰ نشو و نما کا باعث ہوئے۔ اسپارٹا کے مانند روما کا نظام سلطنت بھی انسان ہی کے دست صنعت کا نتیجہ ہے مگر ایک طرف تو وہ انسانی فطرت اور دنیا کی عام حالت سے زیادہ موافقت رکھتا ہے اور دوسری طرف وہ اپنے اشکال ظاہری کی زیبائش اور اپنے تعلقات باہمی کی عظمت کے لحاظ سے زیادہ ممتاز ہے رومی سلطنت سے پر زور طور پر دل پر اثر پڑتا ہے کہ وہ ایک زندہ شئے ہے۔

رومی سلطنت کی اعیانی خصوصیت امور ذیل سے ظاہر ہوتی ہے

اگر ہم رومی جمہوریہ کی اہم خصوصیتوں پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اُس میں شاہی اور عمومی تنظیمات سے گونہ اعتدال پیدا ہوگیا ہے مگر اُس میں اعیانی خصوصیات ہر قدم پر غالب ہیں۔ یہ خصوصیت امور ذیل سے واضح ہوتی ہے: (۱) طبقات کے

(۱) طبقات کے باہمی تعلقات

باہمی تعلقات (۲) مجالس قومی (۳) سینات (۴) حکام کے عہدے -
روما کے پٹریسی (اشراف) اہل اسپارٹا کی طرح ایک ہی نسل سے نہیں تھے،
بلکہ وہ لاطینی سبینینی اور کسی قدر ایٹرسکی نسلوں سے تھے۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے
انگریزی امرا میں سکسونی اور نورمانی خون ملا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل تھا جس نے
اول ہی سے طبقۂ امرا کی سختی اور مطلق العنانی کو روک دیا ہوگا۔ بعد کو اگرچہ سیاسی طاقت
مدت تک انھیں کے ہاتھوں میں رہی مگر عوام کی تنظیم سے اس میں اعتدال پیدا ہوگیا تھا
کیونکہ عوام خود ہی اپنے حکام مقرر کرتے تھے۔ ماسوا اسکے اسکا بھی اثر پڑا ہوگا کہ عوام میں
سے جن لوگوں نے نیا نیا امارت کا درجہ حاصل کرلیا تھا حکومت میں اُن کی شرکت
بڑھتی جاتی تھی۔ انجام کار نئے اور پُرانے امرا کے اتحاد سے ایک طبقہ ممتاز اشخاص
کا پیدا ہوگیا، یہ طبقہ کبھی محدود نہیں تھا مگر رومی سلطنت میں اسے Optimates
سب سے بڑی اہمیت حاصل تھی۔

جب تک جمہوریت قائم رہی، طبقۂ امرا نے حکومت کی روایات اور معاملات عامہ سے
اپنا گہرا تعلق قائم رکھا۔ شرافتِ نسب، تعلیم، دولت، حکومت، مذہبی اور سیاسی معلومات
تمام باتوں میں اس طبقے کو امتیاز حاصل تھا۔ اسکے ساتھ ہی وہ عوام میں سے چیدہ اشخاص کو
اپنے میں شامل کرکے نئی طاقت حاصل کرنے سے بھی کبھی نہیں رکا۔ اگرچہ اس طبقے کو
اعلیٰ ترین اقتدار حاصل ہوگیا اور وہ اولاً بادشاہوں کا ہمسر اور بعد کو اُن سے فائق ہوگیا
مگر جس قوم سے وہ پیدا ہوا تھا اُسکے ساتھ اُس نے ہمیشہ پوری موافقت قائم رکھی۔

سیاسی تعلیم کے متعلق رومیوں کو بھی ویسا ہی خیال تھا جیسا اہل اسپارٹا کو تھا مگر
وہ اُسے خاندان کا کام سمجھتے تھے، سلطنت کا کام نہیں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ روما کے
سیاسی خیالات میں خاندانی خصوصیات اور مختلف رجحانات پائے جاتے تھے۔ برخلاف
اسکے اسپارٹا کی اعیانی حکومت کے اندر ہر شئے یکساں تھی۔ روما کے بیشتر خاندان
قدامت پرست (یا مستحفظ) تھے وہ اُسی روش پر قائم رہے مگر اُن میں سے بعضے خاندان
آزادانہ اصول کی طرف بھی مائل تھے۔ اس صنف میں امرا کے اندر ویلیری خاندان اور
عوام میں پبلیلی اور ہیسنی خاندانوں کے نام لئے جاسکتے ہیں (شاذ مستثنیات کو چھوڑ کر)
خاندان کلاوڈی کو انگلستان کے فرقہ ٹوری کے مثل سمجھنا چاہیے۔

(۲) قومی مجالس
مجلس قبائل

روما کی تینوں مجلسوں میں سے سب سے کم عمر مجلس یعنی مجلس قبائلی کا انتظام جمہوری تھا، ابتداً ان کا منشا یہ نہیں تھا کہ وہ حکومت میں کسی قسم کا حصہ لیں، بلکہ اُنکی غرض صرف یہ تھی کہ عوام کی خواہشوں اور خیالوں کو ظاہر کردیں اور امرا کے زائد از ضرورت اقتدار پر ایک طرح کی روک کا کام دیں، لیکن بعد کو وہ نہ صرف قانون سازی میں شریک ہوگئے بلکہ قانون سازی کے تمام اختیارات کو اُنھوں نے غصب کرلیا، مگر جمہوریت کے آخری زمانے تک میں جب کہ اعیانی حکومت بہت تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہورہی تھی اور بادشاہی کے قائم ہونے کا زمانہ قریب آتا جاتا تھا اسوقت بھی بہت مستثنیٰ صورتوں میں اور کسی بلند حوصلہ ٹریبون ( Tribune ) کے اثر سے یہ ہوتا کہ یہ مجلس قبائلی فی الواقع قطعی اختیارات کو عمل میں لاتی ہو۔ عام طور پر عمومیت کی دخل دہی کے رُکے رہنے کا باعث کچھ تو یہ تھا کہ سینات کے وسیع اختیارات کا بہت لحاظ کیا جاتا تھا اور کچھ یہ کہ خود ٹریبون اُس میں روک پیدا کرتے تھے کیونکہ تجاویز کا پیش کرنا ٹریبون ہی کا کام تھا۔ اور دونوں ٹریبونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے کام کو روک سکتا اور اُس میں دقت ڈال سکتا تھا۔(ب) مجلس قبائلی کا معمولی کام یہ تھا کہ وہ طبقۂ اعیان کی خودسری اور اُنکے ضرورت سے بڑھے ہوئے اختیارات کو روکے۔

مجلس خاندانی
(عشائری)

مجلس خاندانی تمامتر اعیانی حیثیت رکھتی تھی مگر جمہوریت کے آخری زمانے میں اُنکی اصلی اہمیت بالکل زائل ہوگئی تھی اور وہ محض برائے نام قائم تھی۔ وہ درحقیقت قدیم خاندانی امرا کی مجلس تھی اور اسکی ترتیب خاندان پر رکھی گئی تھی، اور سینات ابتداً انھیں خاندانوں کے سرگروہوں کی ایک کمیٹی ( مجلس ) تھی۔ عوام میں سے اگر کبھی کوئی شخص اس مجلس خاندانی میں شامل کیا جاتا تھا تو وہ پست تر حیثیت سے داخل ہوتا تھا۔

مجلس صدہ
(سنتوریہ)

ان مجلسوں میں سب سے زیادہ اہم مجلس عام صدہ (سنتوریہ) تھی جس میں تمام قوم یکجا ہوتی تھی لیکن اسکی ترتیب ایسی رکھی گئی تھی کہ اعلیٰ طبقوں کو اس میں قطعی فوقیت حاصل رہتی تھی۔

(ب) (ٹریبون جو ابتداً محض انجمن عوام کا رکن ہوتا تھا، وہ اسطرح پر غلاً سیناتی حکومت کا آلہ کار ہوگیا تا آنکہ گریکوں نے اسے اور دوسرے کاموں میں لگادیا۔ انگریزی مترجم)

(الف) ملکیت کو بہت اہمیت دیجاتی تھی، صرف طبقۂ اول کے (جسمیں سب سے زیادہ محصول دینے والے شامل تھے) اسّی[۸۰] طلقے ہوتے تھے اور اگر ناٹوں کے اٹھارہ حلقے بھی اُنکے ساتھ شامل ہو جاتے، تو اُنھیں کامل کثرت رائے حاصل ہو جاتی تھی۔ ملکیت کے اعتبار سے رائے دہی کی بھی نسبت، باقی چار طبقوں میں بھی تھی، دوسرے طبقے کے چار آدمی تیسرے طبقے کے چھ، چوتھے طبقے کے بارہ اور پانچویں طبقے کے چوبیس آدمیوں کے برابر ہوتے تھے۔ وہ بے شمار اشخاص جو صاحب املاک نہیں تھے اور اُن سے بھی زیادہ تعداد کے (Capitecensi) ایک سو ترانوے[عسہ] حلقوں میں سے ایک ہی حلقے کے اندر سب شامل کر دیے گئے اور اسطرح انھیں اس مجلس میں بہت کم اثر حاصل تھا جس میں صاحب دولت امرا کا اس قدر غلبہ تھا۔

(ب) شرافت نسب، اور پیشے کے اعزاز کا بھی لحاظ کیا جاتا تھا، چنانچہ ناٹوں کے اٹھارہ حلقے انھیں اصولوں پر قائم ہوئے تھے اور وہ سب سے اعلیٰ واشرف قرار پاکر مجلس میں سب سے اول رکھے گئے تھے۔

(ج) جوانوں کے بہ نسبت بوڑھوں کو رائے دہی کا حق زیادہ حاصل تھا کیونکہ "بزرگوں" کے حلقے میں موت کے طبعی قانون کے باعث "خردوں" کے طبقے کے بہ نسبت نصف تعداد رہ جاتی تھی حالانکہ رائے دینے میں دونوں حلقے برابر تھے۔

(د) اگر ہم طبقات کو نظر انداز کر دیں تو صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس کی تمام ظاہری حالت عمومیت کے مخالف تھی۔ شگون کا لیا جانا، تمام جماعت کی معینہ فوجی ترتیب، عالی مرتبت حکام کی صدارت، از روئے قاعدہ صرف حکام کو عوام کے مخاطب کرنے اور اُن سے معاملت کرنیکا اختیار، یہ سب ایسے امور تھے جن سے اس مجلس میں ایک شکوہ اور اعتدال پیدا ہو جاتا تھا۔ یہ کوئی غیر طبعی امر نہیں تھا کہ روما کے باشندے یونان کی مجلس عامہ کی بے ترتیبی اور شور و شغب کو گونہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

قوم کی اس اعیانی تنظیم کو حقیقی قوانین کے بنانے اور اعلیٰ احکام کے انتخاب کا کام ۱۳۴ سنیات

---

عسہ "کاپے ٹکینسی" کا لفظی ترجمہ ہوگا "سرہائے شمار کردہ"۔ اصطلاح میں روما کے ایسے شہریوں کو کہتے تھے جن میں کوئی خصوصیت نہ تھی اور جنکا محض سرداری شمار کر لیا جایا کرتا تھا ہم اُنکو "نفر" کہہ سکتے ہیں۔ (اردو مترجم)

۴۔ سینیٹ

تفویض تھا، سینیات اپنی نوعیت اور فرائض کے اعتبار سے روما کی سلطنت میں ایک بہت ہی اہم تنظیم تھی۔ ابتدأً اُس میں امیروں کے خاندان کے سرگروہ یعنی رُوسائے ملک شامل تھے اور سینات زیادہ تر خاندانی امرا کی نمایندگی کرتا تھا لیکن بعد میں یہ اُن مدبرین کی مجلس بن گیا جنھوں نے اعلیٰ عہدوں پر اپنی قابلیت کا ثبوت دیا تھا۔ سینات کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ شگون یعنی مقدس روایات کے محفوظ رکھنے کے کام خاندانی امرا ہی کے ہاتھ میں رہے اور اس اعتبار سے اُنکی وقعت بھی قائم رہی مگر زمانہ ما بعد میں اُنکے بجائے عہدہ داروں کا ایک امیرانہ طبقہ قائم ہوگیا۔ روما کے بڑے بڑے حکام کو بادشاہ کا ہمرتبہ سمجھنا بیجا نہ ہوگا اور قدیم زمانے کے لوگ خود اس سینات کو جس میں وہ لوگ شامل ہوتے تھے جنھوں نے اس عہدے کے کام انجام دیے تھے، بادشاہوں کی مجلس کہتے تھے۔ اس سے واضح ہے کہ اس سیاسی طبقۂ اعیان کی وقعت کس درجے پر تھی۔ سابق حکام میں سے ارکان سینات کی فہرست مرتب کرنے اور نا اہل لوگوں کے نام اس فہرست سے خارج کرنیکا معزز کام اخلاق کے نگراں ہونیکی حیثیت سے محتسبوں کے سپرد ہوتا تھا۔ سینات کے ارکان جن عہدوں پر فائز رہ چکے ہوتے تھے انھیں عہدوں کے اعتبار سے اُنکی نشست ہوتی تھی اور اسی اعتبار سے وہ رائے دیتے تھے، چنانچہ قنصل، محتسب، امیر جیش ( Practer ) میر تعمیر ( aedile ) خزانہ دار ( Quaestor ) اپنے اپنے سابق عہدوں کی ترتیب سے مجلس میں بیٹھتے تھے۔ اُنکی کارروائی اُن سخت قیود و ضوابط کے ساتھ عمل میں آتی تھی جو رومی حکومت کی مخصوص صفت تھی۔ مجلس کا افتتاح دعا اور قربانی سے ہوتا تھا، حکام وقت اسکی کارروائی کے نگراں ہوتے تھے اور وہی تجاویز پیش کرتے اور رائے لیتے تھے اور بحث میں ٹریبون ( Tribune ) یا حکام دراندازی یا مداخلت نہیں کرسکتے تھے۔

سلطنت کے تمام اہم کام سینات میں یا تو ترتیب دیئے جاتے یا فیصل ہوتے تھے۔ دیوتاؤں کی پرستش اور اُنکے لئے قربانیوں اور تہواروں کے منانیکے قواعد بھی مجلس مرتب کرتی تھی۔ دوسری سلطنتوں اور غیر ملک کے سفیروں سے گفت و شنود کا کام بھی یہی مجلس انجام دیتی اور روما کے تمام اہم سیاسی معاملات کا انتظام کرتی تھی۔ قوانین کے متعلق

اُسکا محاکمہ اور اسکی منظوری بالعموم قطعی ہوتی تھی۔ انتظامی حد کے اندر خود اُس کے فیصلے قانون کے بجائے سمجھے جاتے تھے۔ وہی تمام مالیات کا انتظام کرتی، محاصل کی منظوری دیتی، اور اخراجات کی نوعیت اور مقدار کا تعین کرتی تھی۔ فوجوں کا اجتماع اور انکی ترتیب اسی کے ہاتھ میں تھی۔ اسی طرح نائب قنصل اور نائب ایمپریٹر کو (جو صوبوں پر متعین کئے جاتے تھے اور جنھیں صوبے کے کل نظم ونسق کا اختیار دیا جاتا تھا) اختیارات اور ہدایات کا عطا کرنا بھی اسی مجلس کا کام تھا۔ سخت نازک موقعوں پر جمہوریت کو خطرے سے بچانیکے لئے جس قسم کے غیر محدود اختیارات کی ضرورت ہو، سینات وہ اختیارات قنصلوں کو دے سکتا تھا۔

(۴) حکام

اس امر میں بحث کی گنجائش ہوسکتی ہے کہ روما کے حکام کے عہدے شاہی حیثیت رکھتے تھے یا اعیانی، مگر اس قدر یقینی ہے کہ انکی حیثیت عمومی نہیں تھی وہ جن خارجی رسوم وآداب میں گھرے ہوئے تھے، انھیں سے انکی حقیقت عیاں تھی۔ اُنکے چغے کا سرخ کنارہ، انکی ہاتھی دانت جڑی ہوئی کرسی، انکے اسیسروں اور دوستوں کا رضاکارانہ دستہ، اُنکے جلو میں عصابرداروں کا چلنا، دیوتاؤں کے ساتھ اُنکا تعلق (جن سے اُنکے متعلق تقرر کے وقت شگون بھی لیا جاتا اور بعد میں برابر صلاح ہوتی رہتی تھی) یہ سب باتیں ان کی شاہی اور اعیانی حیثیت کو ظاہر کرتی تھیں۔ حکام کا وسیع اور بجائے خود مطلق العنانی اقتدار قطعی طور پر شاہی حیثیت رکھتا تھا۔ جمہوری حیثیت صرف انکے عہدے کی مختصر میعاد اور انکے اختیار کے دو یا زیادہ ہمرتبہ حکام میں تقسیم ہونے سے ظاہر ہوتی تھی۔ ایک اعیانی اصول جو روما کے نظام سلطنت میں خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ ہر حاکم کو یہ اختیار ہوتا تھا کہ اپنی نامنظوری کے ذریعے سے اپنے سے برابر یا اپنے سے کمتر درجے کے کسی حاکم کے فعل کو رد کردے۔ اس اصول نے اُنکے غیر محدود اختیار کو معتدل کر دیا تھا مگر جب سلطنت کے نفع وضرر کے لئے کسی اختیار پر عمل کرنے کی حاجت ہوتی تو اس قاعدے سے اس عمل میں کوئی کمزوری نہیں واقع ہوتی تھی۔

حکام کا انتخاب تمام قوم کی طرف سے ہوتا تھا، مگر زیادہ اعلےٰ عہدوں کے انتخاب مجلس صدہ (سنتوریہ) کے لئے محفوظ تھے اور اُس مجلس میں صاحب دولت امرا کا غلبہ تھا۔ اُسکا انتظام حکام کے ہاتھ میں تھا اور شگونوں نے اُسے محدود کر دیا تھا۔

علاوہ اسکے اُس انتخاب میں صرف وہی لوگ لئے جاتے تھے جنکا تعلق قومی طبقۂ اعیانی سے ہوتا تھا اور اُنکی وجہ یا تو یہ تھی کہ وہ کسی ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس سے انھیں شہرت عام، طرفداروں کا وسیع گروہ، اور عام مرجوعہ حاصل ہوجاتا تھا یا یہ وجہ تھی کہ انکی دولت بہت زیادہ تھی جس سے یہ لوگ اپنے صرف سے عام کھیل تماشے قائم کر کے عوام میں اثر پیدا کر لیتے تھے یا اسکی وجہ یہ ہوتی تھی کہ کامیاب سپہ سالار یا فصیح البیان مقرر ہونیکی حیثیت سے اُنکو شہرت وعزت حاصل ہوجاتی تھی۔ جب اعلیٰ حکام کے عہدوں کے دروازے عوام کے لئے بھی کھل گئے تو پھر اس میں اعلیٰ خاندان امرا کی کوئی قید نہیں رہی لیکن شاذ و نادر مستثنیات کے سوا عملاً یہ عہدے اس وسیع سیاسی و معاشری طبقۂ اعیان ہی میں محدود رہتے تھے جس نے اب خاندانی طبقۂ اعیان کی جگہ لیلی تھی۔ ماسوا اسکے سینیات بھی انھیں لوگوں سے مرتب ہوتی تھی جو اس عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔

اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اپنے شاہی اور عمومی اجزا کے باوجود روما کی جمہوریت حقیقتاً اعیانی حکومت تھی اور از منۂ وسطیٰ کی طرح سے یہ کسی خاص خاندان یا کسی خاص طبقے کی حکومت نہیں تھی بلکہ ایک قومی اعیانی حکومت تھی جسکی عظمت وقوت کا مثل دنیا میں نہیں ہوا ہے۔

---

# انیسواں باب

## (ج) اعیانی حکومت پر بعض خیالات

حکومت عیانی کا اصل الاصول

مونٹسکیو (الف) نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اعیانی حکومت کا اصول اعتدال ہے اور یہ صحیح ہے کہ اُسکی پائداری کے لئے اعتدال کی ضرورت ہے کیونکہ غور کرنے سے عیاں ہوجاتا ہے کہ رعایا کا گروہِ کثیر اپنی تعداد اور جسمانی قوت میں حکمراں جماعت سے بہت بڑھا ہوا ہوتا ہے ۔ عمومی حکومت میں یہ خیال ہوتا ہے کہ اُسکے اختیار پر کوئی خارجی روک نہیں ہے اور اس وجہ سے اُس میں اپنے اختیار کے غیر معتدل استعمال کی تحریک پیدا ہوجاتی ہے لیکن اعیانی حکومت کے لئے یہ آسان نہیں ہے کہ وہ مخالفت اور انحراف کے خطرے سے آزاد ہوجائے اور اس لئے بالعموم اُسے یہ مسلم رہتا ہے کہ اعتدال کے بغیر اسکی حالت غیر محفوظ رہیگی لہذا اسکی حکمت عملی علی العموم مستحفظانہ ہوتی ہے ۔

لیکن اس سے اعیانی حکومت کا اصل اصول نہیں ظاہر ہوتا' درحقیقت اعتدال کے بجائے اسکا اصل الاصول حکمراں طبقے کی اخلاقی اور ذہنی قوت کی فوقیت ہے ۔ صحیح معنی میں وہ حکومت' اعیانی حکومت نہیں ہے جس میں واقعی بہترین افراد حکمراں نہ ہوں[1] ۔ جب حکمراں جماعت کے وہ اوصاف جن کے باعث انھیں یہ اقتدار حاصل ہوا تھا' متبدل ہوجاتے ہیں ان کے اخلاق پست ہوجاتے ہیں اور ان میں کمزوری اور رکاکت آجاتی ہے تو اعیانی حکومت کی اصلی طاقت زائل ہوجاتی ہے ۔ اُس صورت میں بھی اُسے زوال ہوجاتا ہے جب اُن حکمرانوں کے اعلیٰ طبقات تو علیٰ حالہا باقی رہیں مگر نیچے کے طبقات بھی ویسا ہی امتیاز حاصل کرلیں اور قدیم

---

(الف) "روح القوانین" (De L'Esprit des Lois) جلد سوم باب چہارم ۔

[1] مونٹسکیو کا یہ دعویٰ کہ نیکوکاری عمومیت کا اصول ہے (تصنیف مذکورۂ بالا جلد ۳ باب ۳) اُتنا قرین صحت نہیں ہے جتنا کہ ارسطو کا یہ مقولہ کہ "اعیانیت کا اصول نیکوکاری ہے اور عمومیت کا اصول آزادی" ("سیاسیات" ۴ : ۸ ف ۷) ؛ مگر تاریخی حقائق اور فلسفیوں کے تخیلات میں وجہ اشتراک بہت کم ہوا کرتی ہے ۔

طبقۂ اعیان اپنی غفلت یا نخوت کے باعث نیچے طبقے کے لوگوں کو اپنے میں شامل کر کے اپنی قوت کو مکمل و مضبوط نہ کرے۔ روما کے طبقۂ اعیان کے حصول عظمت اور انگلستان کے طبقۂ اعیان کے اثر و رفعت کی بقا کا باعث یہی ہے کہ یہ دونوں طبقے قومی زندگی کے دوش بدوش چلتے رہے اور نیچے طبقے کے لوگوں کو اپنے میں شامل کر کے نئی قوت حاصل کرتے رہے۔

اسکی تفرد پسندی اکثر مہلک ثابت ہوتی ہے

ہر ایک اعیانی حکومت کی سخت ترین غلطی اُسکی تفرد پسندی ہے، حکمراں طبقے کے امتیازات کی بنا اُسکے اوصاف پر ہوتی ہے مگر حصول حکومت کیلئے موروثی جانشینی کی حمایت میں وہ اکثر ذاتی اوصاف کو بالکل نظر انداز کر جاتا ہے، اس قسم کی محدود اعیانی حکومت ایک چھوٹے سے حلقے کے اندر قائم رہ سکتی ہے مگر جب اُس کے تعلقات میں وسعت ہوتی ہے تو وہ اپنے کام کی انجام دہی کے ناقابل ہو جاتی ہے۔ اسپارٹا اور وینس نے جب اپنی فتوحات کو پھیلا دیا تو وہ کمزور ہو گئے۔ اسپارٹا کے خاص باشندوں اور وینس کے امرا دونوں میں سے کسی کی تعداد اور قوت اس درجے پر نہیں تھی کہ وہ وسیع ممالک پر حکومت کر سکیں اور باقی لوگ چونکہ سیاسی زندگی سے خارج تھے اور انکا کوئی اثر نہیں تھا اس لئے اُنکی جانب سے امداد بہت کمزور ہوتی تھی اسیطرح برن کی اعیانی حکومت بھی تباہ ہوئی۔ اسکے امرا کی حالت میں فی نفسہ کوئی ایسا تنزل نہیں پیدا ہوا تھا بلکہ اُس کی بربادی کی وجہ یہ ہوئی کہ اُس نے شہر اور ملک کے ممتاز افراد کو اپنے میں شامل نہیں کیا۔

اعیانی حکومت کی مختلف صورتیں

ہر ایک اعیانی حکومت کی بنا امتیازی صفات پر ہوتی ہے مگر کسی مخصوص صفت کا انتخاب قوم کی محض طبیعت اور حالت سے تعلق رکھتا ہے، اگر اسکا انحصار نسب پر ہے تو اُس سے ایک خاندانی طبقۂ اعیان پیدا ہو جاتا ہے اور اس میں نظام سلطنت پر خاندانوں یا طبقوں کے حقوق کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ از منۂ وسطیٰ میں ایسا بہت ہوتا تھا۔ تربیت و تعلیم کو مرجح رکھنے سے قسیسوں یا عالموں کی حکومت اعیانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر حکمران کیلئے عمر کی شرط ہوتی ہے تو اُس سے معمرین یا شیوخ کی حکومت قائم ہو جاتی ہے، اگر فوجی امتیاز کا لحاظ ہوتا ہے تو سپہگروں کی حکومت برپا ہو جاتی ہے، اگر جائداد منقولہ یا غیر منقولہ کا خیال کیا جاتا ہے تو زمینداروں یا سرمایہ داروں کی حکومت ہو یدا ہو جاتی ہے جسے اہل ثروت

کی حکومت کہنا چاہئے اور جیسے سیسرو حکومت کی تمام صورتوں میں سب سے زیادہ قابل نفرت قرار دیتا ہے۔ ممتاز اشخاص ( Optimate ) کی حکومت، فرمانروائی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ اُس میں متعدد خاندان اور اشخاص شامل ہوتے ہیں سیاسی خیالات کی بنا پر عہدہ داروں کی حکومتِ اعیانی بھی قائم ہوسکتی ہے مگر جیسا کہ ازمنۂ وسطی میں ہوا اُس حالت کو زیادہ بقا نہیں ہوتی۔ یہ رفتہ رفتہ موروثی بنجاتی ہے اور اسطرح خاندانی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ ایسا بھی اکثر ہوتا ہے کہ اس حکومت اعیانی کے لئے مختلف صفات کی ضرورت سمجھی جاتی ہے اور یہ اُس حکومت کے مقابلے میں زیادہ قوی ہوتی ہے جس میں صرف ایک صفت کی حاجت ہوتی ہے کیونکہ آخر الذکر کو اُن تمام طبقات و اشخاص کی مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جن میں اعیانی حیثیت کے لئے کوئی نہ کوئی غلط دعوی استحقاق موجود ہوتا ہے۔

عام خصوصیات (۱) ظاہری شان و شوکت

اعیانی حکومت کو یہ شوق ہوتا ہے کہ وہ اپنے فوائد کو نمایاں کرے، اس لئے وہ سلطنت کی ظاہری شان و شوکت اور علوئے مرتبت کے اظہار کی خواہاں رہتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ رعایا کی طرف سے دلی محبت کا خیال ترک کردے مگر وہ اپنی وقعت کے ترک کئے جانیکی روادار نہیں ہوسکتی، پس وہ ظاہری شان و شوکت کے اظہار سے یہ اثر پیدا کرنا چاہتی ہے کہ اُسکے سیاسی اشکال کو امتیاز حاصل ہوجائے اور اُسکا اقتدار قوی ہوجائے۔ عمومیت کے مقابلے میں اعیانی حکومت کی یہ ایک نمایاں فوقیت ہے، کیونکہ عمومیت میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ حکام اور سلطنت دونوں پست ہوکر عام سطح پر آجاتے ہیں۔

(۲) حکمراں کی سختی

لیکن اس فائدے کے ساتھ ہی یہ خطرہ بھی لگا ہوا ہے کہ مبادا حکمراں طبقات اپنی منزلت کا اندازہ کرنے میں حد اعتدال سے بڑھ جائیں اور رعایا کے سود و بہبود کی طرف بہ قدر ضرورت توجہ نہ کریں۔ اعیانی حکومت نے اکثر نیچے طبقے والوں کے ساتھ درشت اور ظالمانہ برتاؤ کیا ہے اور یہ برتاؤ اس وجہ سے اور بھی ناقابل برداشت ہو جاتا ہے کہ اُس میں ظلم وستم کے ساتھ تحقیر بھی شامل ہوتی ہے۔ اہل اسپارٹا نے اپنے نیم غلاموں کے ساتھ جو برتاؤ کیا اور روما کے امرا نے طبقۂ عوام کے قرضداروں پر جو مظالم کئے۔ انگریز زمینداروں نے آئرلینڈ کے کاشتکاروں پر جو ستم توڑے اور انگریزی حکام نے ہندوستان کے باشندوں اور جمیکا کے حبشیوں پر جیسی حریصانہ جباری

و قہاری سے حکمرانی کی وہ سب اس بیان کے شاہد عادل ہیں۔

(۳۰) حد سے زیادہ سختی

جس طرح عمومیت بالعموم زاید از ضرورت متلون اور تغیر پذیر ہوتی ہے، اُسی طرح اعیانی حکومت حد سے زیادہ اٹل اور لکیر کی فقیر ہوتی ہے۔ عمومیت یہ سمجھکر کہ اُسکی طاقت کی کوئی حد نہیں ہے اکثر اپنے قیام و دوام کے ضروری شرائط کو فراموش کر دیتی ہے، اعیانی حکومت چونکہ اپنے قیام کی فکر سے غافل نہیں ہوتی اس لئے وہ اکثر اس غلط خیال میں پڑ جاتی ہے کہ اُسکا بہترین وسیلہ قدیم طریقوں پر مضبوطی سے جما رہنا اور ہر قسم کے تغیر کو سختی کے ساتھ خارج کرتے رہنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عمومیت کی بہ نسبت اعیانی حکومت نے طریق استحفاظ کی قابلیت کا زیادہ اظہار کیا ہے اور اُسکی مدت قیام نسبتاً زیادہ رہی ہے۔ وہ بیباکانہ سیاسی تجربوں سے بچتی رہتی، پھونک پھونک کر احتیاط سے قدم رکھتی اور جب اسکو کوئی واقعی خطرہ پیش آتا ہے اُسی وقت یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قطعی قوت کا اظہار کرتی اور کچھ دیر کیلئے شاہی کی خصوصیات اختیار کر لیتی ہے۔ اگر حد کے اندر رہے تو یہ ایک عمدہ صفت ہے اور نتیجہ ہے حفاظتِ ذاتی کے طبعی احساس کا لیکن یہی صفت جب تجاوز کر جائے تو وہ ایک غلطی بنجاتی ہے۔

(۳۱) اعیانی حکومت کے لئے استبداد پسندی

اس استحفاظی خیال کا اظہار اس طرح بھی ہوتا ہے کہ حکومت کی تمام تنظیمات میں موروثیت کو اصل الاصول بنا دینے کا طبعی میلان پیدا ہو جاتا ہے، ازمنۂ وسطیٰ میں، جب کہ تمام یورپ پر اعیانی رنگ چڑھا ہوا تھا، یہ میلان خصوصیت کے ساتھ نمایاں نظر آتا ہے۔ خاندان ہوہن اشٹاوفن کے زوال کے بعد جرمانی شہنشاہی تک حقیقتاً اس اعیانی رنگ میں آگئی حالانکہ ابتداءً اُسکی بنیاد شاہی کے خیال پر ہوئی تھی [1] خود منصب شہنشاہی کو

---

[1] یہ امر فرانسیسی مصنف بودین کو اچھی طرح معلوم تھا اور اُس نے اسکی تشریح بھی کی ہے مگر اُسکے بعد سے جرمانی مورخین نے یہی بہتر سمجھا کہ اُسے فراموش کر دیں۔ (دیکھو مصنف مذکور کی تصنیف "جمہوریہ"، جلد ۲ باب ۶) فلپ کیم نتس نے اپنے تجاویز اصلاح کی بنا اس خیال پر رکھی ہے کہ جرمانیا ایک اعیانی سلطنت ہے۔ پفندورف نے شہنشاہی کو بادشاہی اور اعیانی طریقوں سے مخلوط قرار دیا ہے مگر اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ اعیانی حکومت کا میلان غالب ہے (اب کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کرتا کہ خاندان ہوہن اشٹاوفن کے زوال کے بعد سے شہنشاہی نے اعیانی حیثیت اختیار کر لی تھی اور بادشاہ محض نمائش کے لئے تھا۔ انھیں دلائل سے بلنچلی کو یہ بھی یقین کر لینا چاہئے تھا کہ انگلستان کی بادشاہت بھی محض نمایشی ہے۔ انگریزی مترجم۔)

موروثی نہیں ہوا۔ مگر اُسکا انتخاب موروثی انتخاب کنندوں کے ذریعے سے ہونے لگا۔ شہنشاہ کا رتبہ اگرچہ نہایت بلند تھا مگر اُسے اختیار برائے نام ہی تھا۔ کسی اہم امر کا فیصلہ کرنیکے قبل اُسے ڈائٹ سے مشورہ لینا ضروری تھا۔ انتخابی حلقے تمام قوانین تیار کرتے تھے اور سب سے اول ڈائٹ میں وہی رائے دیتے تھے۔ دوسرے درجے میں رائے دہی کا حق اُن حکمرانوں کو حاصل تھا جو ابتدائے سلطنت کے عہدہ دار تھے مگر کسی نہ کسی طرح سے انھوں نے اپنے کو موروثی رئیس بنا لیا تھا۔ حکمرانوں کے بعد شہنشاہی شہروں کا درجہ تھا مگر ان شہروں کی حکومت بالعموم چند قابو یافتہ امیروں کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور اس طرح ان شہروں کی نیابت درحقیقت اعیانی نوعیت کی تھی۔ حکومت کا کام شہنشاہ اور ڈائٹ ملکر انجام دیتے تھے۔ صاحب جائداد امرا کی جاگیری خودمختاری سے مرکزی حکومت کو دقت اور پریشانی کا سامنا رہتا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے تمام سیاسی اور مذہبی تعلقات میں موروثی جانشینی کی جانب اعیانی میلان ظاہر و باہر ہے۔ ہر شئے اُسی کے اثر میں تھی۔ جاگیر، شہنشاہی عہدے اور اعزاز، تمام عدالتی اختیارات (جس میں کاونٹ، بیلف محصل شاہی، صاحب جائداد امرا اور مقامی اسٹیٹس داخل تھے)۔ سپہگری اور درباری خدمات شہروں اور دیہاتوں کے ادنیٰ و اعلیٰ ملازمین اور کاشتکاروں کے جاگیردارانہ قبضے سب کے سب اسی موروثیت کے زیر اثر تھے۔

برخلاف اسکے زمانۂ جدید میں موروثیت سے بحیثیت سیاسی اصول کے قطعی نفرت پائی جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں کچھ نہ کچھ صداقت موجود ہے مگر اُن کا انتہا تک پہنچانا بھی غلطی ہے ہمارے اس زمانے میں جدید ترقی اور نئی ضروریات کی تکمیل میں موروثیت کے سخت اصول سے جو رکاوٹیں پیش آئی ہیں، اُنکے خلاف کوشش کرنا بالکل بیجا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ شخصی قابلیت کے بے روک ٹوک تسلیم کئے جانیکا وعدہ کیا جائے اور اس امر پر زور دیا جائے کہ جن سیاسی عہدوں کیلئے شخصی قابلیت اور اطاعت تام درکار ہے وہ موروثی قواعد کے تابع نہ کئے جائیں۔ نہ انھیں خاص خاص خاندانوں کی ملک سمجھنا چاہیے لیکن یہ ایک غلطی ہے کہ موروثی جانشینی سے ماضی و حال میں جو تعلق قائم ہے وہ توڑ دیا جائے۔ یہ بھی غلطی ہے کہ جہاں مستحکم روایات کے برقرار رکھنے کی ضرورت ہو، وہاں لاحاصل اور بکثرت تغیر و تبدل کیا جائے یا بے ضرورت وہ حالات بدل دئے جائیں جو سلطنت کے لئے مضبوط ستونوں کا کام دیتے ہیں اور جو زبردست اخلاقی مقاصد اور طاقتوں کو مستقبل کی طرف

منتقل کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنا درحقیقت ریت پر عمارت بنانا ہے۔ یہ قوم وسلطنت دونوں کی زندگی کو تباہ کرنا ہے کیونکہ انکی زندگی ہر نسل کے ساتھ بدلتی نہیں رہتی بلکہ صدیوں تک مسلسل چلی جاتی ہے[1]

[1] اعیانیت پسند انگلستان میں ابتک سیاسی موروثیت کی اہمیت پوری طرح مسلم ہے۔ برک کے "خیالات در بارۂ انقلاب فرانس" Reflection on the Reus lutim in franee میں اُسکی رائے دیکھنا چاہئے۔ وہ لکھتا ہے کہ آپ دیکھیں گے کہ "منشور اعظم" کے وقت سے، اعلان حقوق، کے وقت تک ہمارے نظام سلطنت کی یکساں روش یہ رہی ہے کہ ہماری آزادی کے حق اور دعوے کو اس اصول پر پیش کرے کہ وہ ہمارے آبا واجداد سے ہمیں حاصل ہوئے ہیں اور ہم اپنے اخلاف کے لئے انھیں چھوڑ جائیں گے گویا یہ آزادی اس سلطنت کے باشندوں کا خاص حق ہے اور اسے دوسرے زیادہ عام یا سابقہ حق سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ ہمارے وہاں بادشاہت موروثی ہے، امارت موروثی ہے، دارالعوام اور قوم کے امتیازات حقوق رائے وہی سب مدت ہائے دراز سے بزرگوں سے ورانتاً چلے آرہے ہیں۔ اس میں جدت وہی لوگ نکالتے ہیں جن کی کوئی ذاتی غرض ہوتی ہے یا وہ تنگ خیال ہوتے ہیں۔ جو لوگ پیچھے مڑکر اسلاف پر نظر نہیں کرتے وہ اپنے اخلاف کا بھی خیال نہ کریں گے۔ علاوہ اسکے انگلستان کے لوگ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ موروثیت کے خیال میں استحفاظ و انتقال دونوں عنصر ہیں اور اسکے ساتھ ہی ارتقا کا اصول اس سے خارج نہیں ہے۔ اس میں نئی چیزوں کے حاصل کرنیکی کامل آزادی ہے مگر جو کچھ حاصل ہو جائے اُسے وہ محفوظ کرلیتا ہے۔ ہمارا سیاسی نظام دنیا کی ترتیب اور بقائے عالم کے طریق سے بالکل متحد و متفق ہے اور وہ ایک دائمی شئے ہے جسکے اجزائے متفرقہ بدلتے رہتے ہیں مگر اسکی ہیئت مجموعی بحال رہتی ہے۔ اُس میں نہایت دانائی کے ساتھ نسل انسانی کے پُراسرار اصول قائم کردیئے گئے ہیں جس سے وہ بحیثیت مجموعی کبھی ایک وقت میں نہ بڈھا ہوتا ہے نہ ادھیڑ نہ جوان، مگر اس میں انحطاط، زوال، تجدید اور ترقی کا ایک دائمی سلسلہ جاری رہتا ہے پس اس طرح سلطنت میں فطرت کے اصول کو قائم رکھنے سے ہم جس امر کو ترقی دیتے ہیں وہ بالکل نیا نہیں ہوتا اور جس چیز کو قائم رکھتے ہیں وہ بالکل از کار رفتہ نہیں ہوسکتی۔ موروثی طریق کے پسند کرنیکے باعث ہم نے اپنے نظم سلطنت میں خون کا سا تعلق پیدا کردیا اور اپنے ملک کے نظام سلطنت کو اپنے عزیز ترین خانگی روابط سے وابستہ کردیا ہے۔ اپنے سیاسی قوانین سے ہمیں اپنے اہل خاندان کی سی محبت ہوگئی ہے۔ ہم اپنی سلطنت، اپنے گھر اپنے مقبرے اور اپنی عبادتگاہ کو ایک دوسرے سے جدا نہیں سمجھتے یکساں جوش دل کے ساتھ سب پر نظر کرتے ہیں اور ایک کی خوبیوں کا عکس دوسرے پر پڑتا ہے۔"

۵۱، قانون کا احترام

اعیانی حکومت کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے قیام کی حفاظت کے خیال سے خارجی نظم و ترتیب کو برقرار رکھے۔ اس خیال سے وہ قانون کی محافظت اور قانونی صورتوں کو ٹھیک ٹھیک قائم رکھنے کی بھی کوشش کرتی ہے۔ جب تک کہ اپنی ہستی کے معرض خطر میں ہونے سے اُسے کوئی اشتعال نہ ہو جائے، اُس وقت تک اعیانی حکومت بجا طور پر یہ فخر کر سکتی ہے کہ اُس نے رعایا اور خود اپنے ارکان دونوں کے معاملے میں عمومی حکومت کی بہ نسبت زیادہ معدلت گستری سے کام لیا ہے۔ اسے محض اتفاقی امر نہیں کہہ سکتے کہ علم قانون کا نشو و نما سب سے زیادہ ایک ایسی قوم کے ہاتھ سے ہوا جو اعیانی حکومت کی اس قدر دلدادہ تھی، یعنی رومیوں کے ہاتھ سے۔ قانون کی ترقی کے لئے اہل وینس نے جو سخت مگر غیر جانبدارانہ طریقہ اختیار کیا وہ بھی تعریف کے قابل ہے۔ یہی حال برن کے قانون کا تھا اور انگریزوں میں پاس قانون کا جیسا زبردست احساس موجود ہے وہ ظاہر ہے اور یہ قوم بھی اعیانی حکومت کی پسند کرنے والی ہے، ازمنۂ وسطیٰ میں خود سلطنت کی حکمت عملی تک کو قانونی فیصلے اور اسکی تعمیل کی ظاہری حیثیت دیجاتی تھی۔

اعیانی حکومت کا زوال

زمانۂ حال کے خیالات، سلطنت کے اعیانی حیثیت کے اس قدر خلاف ہیں کہ انیسویں صدی کے وسط سے پہلے ہی اعیانی سلطنت کی کوئی مثال باقی نہیں رہ سکی۔ قدیم روما کی اعیانی حکومت اولاً عمومیت کے عروج سے شکست ہوئی اور اُسکے بعد جا کر شہنشاہی نے اُسے پامال کیا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں اٹالیا اور جرمانیا کی اعیانی حکومتیں والیان ملک کی ترقی پذیر طاقتوں کے سامنے پست ہوئیں اور آخر الامر اہل شہر کی مخالفت نے انھیں غارت کر دیا۔ اسلئے اب اس زمانے میں اعیانی طبقات کو قوم کے ایک ممیز فرد کی حیثیت سے درمیانی درجہ حاصل ہے، شاہی اقتدار نہیں حاصل ہے۔ ہر جگہ یہ طبقات شاہی یا عمومیت کے تابع ہیں اور اگرچہ یہ طبقات شاہی میں اعتدال اور عمومیت میں رفعت و خودداری پیدا کر سکتے ہیں مگر وہ سلطنت میں خود حکومت کا دعوے نہیں کر سکتے۔

---

# بیسواں باب

## سلطنت کی عمومی صورتیں

### (الف) عمومیت بلا واسطہ (قدیمی عمومیت)

قدیم وجدید عمومیت کا فرق

عمومیت کی نسبت زمانۂ قدیم اور زمانۂ حال کے خیالات میں بہت بڑا فرق ہے، زمانۂ قدیم میں اسکے معنی عوام یا آزاد اور مساوی الحقوق باشندگان شہر کی حکمرانی کے تھے۔ قدما میں لوگ دنیاوی امور کی ابتداء سلطنت سے کرتے تھے اور سیاسی حکمرانی کو سب میں برابر تقسیم کر کے آزادی کو محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ اب اس زمانے کے لوگ شخصی آزادی سے ابتدا کر کے کوشش یہ کرتے تھے کہ حتی الوسع اپنی ذاتی آزادی سلطنت کے حوالے نہ کریں، تاحد امکان سلطنت کی اطاعت کم کریں۔ قدیم عمومیت خواہ قطعی ہو یا اسکی حالت میں کچھ اعتدال پیدا کر دیا گیا ہو مگر ہر حال میں وہ بلا واسطہ ہوتی تھی۔ موجودہ زمانے کی عمومیت بالعموم نیابتی ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اول الذکر کا قیام صرف ایک چھوٹی سی سلطنت میں ممکن ہے، برخلاف اسکے ثانی الذکر ایک بڑی قوم اور اُسکے وسیع ممالک میں بھی رائج ہو سکتی ہے۔

یونان کی عمومیت

اہل یونان چونکہ متعدد چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں منقسم تھے، اس لئے انھوں نے اپنے سیاسی ذوق کا اطمینان اسی میں دیکھا کہ اپنے وہاں عمومیت قائم کریں۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یونان کی قدیم بادشاہتوں اور نام نہاد اعیانی حکومتوں میں بھی کچھ نہ کچھ عمومیت کا اثر پایا جاتا ہے اور موجودہ زمانے کی شاہی اور روما کی اعیانی حکومت کے مقابلے میں اُنکا مابہ الامتیاز یہی تھا۔ اور یہ بھی خیال رکھنے کی بات ہے کہ یونان کے بڑے بڑے فلسفی ایتھنز کی قطعی عمومیت کو ناپسند کرتے تھے[1] مگر وہ سلطنت کی بہترین صورت معتدل عمومیت ہی کو سمجھتے تھے اور اُسے آئینی حکومت کہتے تھے۔

---

[1] اس رائے میں زنوفون، افلاطون، اور ارسطو سب متفق ہیں۔

اتھنز کا نظامِ سلطنت

عمومیت کے انتہائی رنگ کا جلوہ ایتھنز میں نظر آیا اور اتھنز کے نظامِ سلطنت سے بہتر اسکی حقیقت کا پتہ کہیں اور نہیں چل سکتا۔ کسی اور سلطنت میں قوم کی حکومت کو یہ وسعت نہیں حاصل تھی۔ قریب قریب تمام اہم معاملات اکلیسیا (مجلس عام) کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ اسکے اجلاس بہت کثرت سے ہوتے تھے۔ اکثر ہفتے میں ایک مرتبہ اسکا انعقاد ہوا کرتا تھا اگر ہم یہ خیال نہ رکھیں کہ معمولی کاروبار اور پیشے کے کام آزاد اہل شہر نہیں انجام دیتے تھے بلکہ بیشمار غلاموں سے کام لئے جاتے تھے تو بادی النظر میں یہ ناممکن معلوم ہوگا کہ مجلس عام کے اجلاس اس کثرت سے ہوتے ہوں۔

اکلیسیا (مجلس عام)

مختلف النوع عوام کی ظاہری نمایندگی اکلیسیا (مجلس عام) میں ہوتی تھی اُس میں بیس برس سے زائد عمر کے تمام شہری شریک ہوتے تھے۔ صرف وہ لوگ اُس سے خارج تھے جو کسی وجہ سے اپنے ملکی حقوق کھو بیٹھتے تھے۔ اس مجلس میں اہل اتھنز اپنے کو سلطنت کا مالک سمجھتے تھے۔ ہر فرد مجموعی اقتدار اعلیٰ کا ایک جزو ہوتا تھا۔ عمومیت کی اس مخصوص علامت نے کہ کثرت رائے فرمانروائی کرے اور ہر شہری کا حصہ اقتدارِ اعلیٰ میں ہو یہاں پوری ترقی حاصل کر لی تھی۔ ہر شخص کو تقریر کرنیکا آزادانہ حق حاصل تھا، اور سولون کے وقت میں کبرسنی کے جو امتیازات قائم کئے گئے تھے وہ بھی دوسرے قیود کے مانند بار سمجھکر خارج کر دئے گئے تھے۔ مقرروں کو اپنا زور فصاحت دکھانیکے لئے پورا موقع حاصل تھا اور اکثر اس سے سحر کا سا اثر پیدا ہو جاتا تھا۔ یہ بڑی ہی خوش قسمتی تھی کہ پیری کلیس کے سے جلیل القدر مدبر اہل رائے ہونیکے ساتھ زباں آور بھی تھے۔ زیادہ تر ایسا ہوتا تھا کہ چالاک اور حریص لفاظ، عوام کے جذبات کو بھڑکا کر اُن پر قابو حاصل کر لیتے تھے۔ زمانۂ موجودہ کی سلطنتوں میں فصاحت کا وہ اثر نہیں ہے جو اُس زمانے میں تھا۔ اُس وقت سامعین سب ایک جگہ جمع ہوتے تھے اور اُن پر جس زور کا اثر پڑ سکتا تھا وہ اخباروں کے ذریعہ سے منتشر پڑھنے والوں پر نہیں پڑتا۔ مقرر کی آواز اور اسکے انداز بیان سے بھی اُسکے لفظوں میں خاص مفہوم اور زور آجاتا تھا اور سامعین کی تحسین و آفرین سے مباحثے میں ایک زبردست حرکت پیدا ہو جاتی تھی۔ ہمارے زمانے میں پارلیمنٹ کی تقریروں کا یہ اثر نہیں ہوتا جسکی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ مجلس نسبتاً چھوٹی اور منتخب ہوتی ہیں اور کچھ یہ کہ اُنکے اختیار زیادہ محدود ہیں۔

اسکے اختیارات

"اکلیسیا" کے اختیارات سلطنت پر از سرتاپا محیط تھے۔ سولون نے ان اختیارات کو

حکام کے انتخاب حکومت کی نگرانی اور قوانین کے متعلق مشورہ دینے تک محدود رکھا تھا مگر مفکروں کے اثر میں آکر عوام بہت جلد ان حدود سے تجاوز کر گئے۔ عام قوم کے فیصلے ایک مطلق العنان بادشاہ کے فیصلے کی طرح قطعی ہوتے تھے۔ خود مختار بادشاہ کی طرح عوام بھی جو چاہتے تھے حکم دیدیتے تھے، چاہے وہ قانون کے خلاف ہی کیوں نہ ہو[1] قانون کا بنانا، درحقیقت مجلس مقننین سے تعلق رکھتا تھا مگر عملاً قوانین کا آخری تصفیہ اکلیسیا ہی کے مباحثوں اور رایوں سے ہوتا تھا حقیقت میں مجلس مقننین اُن بے شمار مجلسوں میں سے ایک مجلس تھی جو ہر خاص موقع کے لئے منتخب ہوجایا کرتی تھی۔ مجلس عام خود ہی حکومت کے تمام اہم معاملات کا فیصلہ کرتی تھی۔ وہی سفرا کا تقرر کرتی اور انھیں ہدایات دیتی تھی۔ وہی غیر ملک کے ایلچیوں کے بیانات سنتی اور جنگ وصلح کا تصفیہ کرتی۔ وہی سپہ سالاروں کا انتخاب کرتی اور سپاہیوں کی تنخواہوں کا تعین کرتی تھی کہ یہ بھی پہلے سے قرار دیدیا کرتی تھی کہ جنگ کا کیا اسلوب اختیار کیا جاوے۔ مفتوح شہروں اور ملکوں کی قسمت کا فیصلہ اُسی کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ نئے دیوتاؤں کا قبول کرنا مذہبی تہواروں اور نئے کاہنوں کا انتظام کرنا شہریت کے حقوق و امتیازات کا عطا کرنا سب اُسی کے ہاتھ میں تھا، ہر پینٹیبویٹ[35] یا چھتیسویں[36] روز سلطنت کے مداخل ومخارج کی کیفیت اُسکے سامنے پیش ہوتی تھی، وہ محصول لگاتی، غیر ملکیوں کے لئے محصول کی رقم کا تعین کرتی، دارالضرب کا انتظام کرتی اور لوگوں سے آزادانہ امداد کا مطالبہ کرتی تھی، مندروں اور عام عمارتوں، سڑکوں، دیواروں اور جہازوں کے بنانیکے لئے اُسکی منظوری لازمی تھی۔ وہ یہاں تک کر سکتی تھی کہ سرکاری آمدنی سے نیچ کے طور پر لوگوں کو ناٹکوں میں جانیکے لئے رقوم دیدے۔ اُسکے اختیارات معمولی عدالتی کارروائیوں پر حاوی نہیں تھے مگر مستثنیٰ حالات میں جب جرم قانون کے تحت میں نہیں آتا تھا یا جب اہم حالات کے اعتبار سے غیر معمولی کارروائیوں کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ مجرمانہ الزامات پر بحث کرتی، تاوان کا تعین کرتی اور ملزم کے جرم کا بھی تصفیہ کرتی تھی۔ جو خرابیاں اُس میں عمومیت کے دور عروج کے بعد بہت ہی جلد پیدا ہوگئیں اُن سے ناجائز عدالتی کارروائیوں کو اور بھی ترقی ہوگئی۔

---

[1] دیکھو ارسطو، "سیاسیات" ۴؛ ۴ اور ۶۔

اسکی خصوصیت

مجلس کے اندر جو اہل شہر موجود ہوتے تھے انھیں کی کثرت رائے قطعی ہوتی تھی۔ قوم کے ادنیٰ طبقوں تک کی ذہنی قوت میں ایسی ترقی ہوگئی تھی کہ قدیم یا جدید کسی سلطنت میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ وہ ایس کلوس اور سوفوکلیس کے افسانہائے غم کو بخوبی سمجھ سکتے تھے۔ دے موس تھنیس کی تقریروں کو سنتے تھے، تجارت اور شہنشاہی اور ہر قسم کے کاروبار کے منافع کثیر نے انھیں دولتمند بنا دیا تھا لیکن اس قابلیت کے لوگوں میں بھی زیادہ حصہ ایسا تھا کہ وہ زبان آوروں کی پرفن ترغیبات کو روک نہیں سکتا تھا اور اپنے اختیار کو دانائی اور انصاف سے عمل میں لانے سے گریز کرجاتا تھا۔ زیادہ معزز اور دولتمند شہری جو تعداد میں قلیل تھے اُنکے ساتھ زیادتی اور بدسلوکی ہوتی تھی، چنانچہ زنوفون اپنے وطن کے متعلق لکھتا ہے کہ عمومیت کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ بدکردار اچھے رہیں اور نیکوکار پریشان ہوں[1]

سینیات

سولون کے نظام حکومت کا منشا یہ تھا کہ اکلیسیا کے اختیارات ایک حد تک "بولے" (یعنی مجلس شیوخ) کے تابع ہوں۔ سولون نے اس آخرالذکر مجلس کی بنا قوم کے چار قبائل کے اعیانی انتظام کے موافق رکھی تھی۔ قبائل کے ارکان چار طبقوں میں تقسیم کئے گئے تھے۔ اور اُن میں سے اعلیٰ اور دولتمند طبقے کے حقوق و فرائض زیادہ قرار دئے گئے تھے تاکہ سینیات میں دولت اور تعلیم کو غلبہ حاصل رہے لیکن کلائیس تھینس کے وقت (۵۱۰ ق م) سے یہ مجلس روز بروز عوام کے اثر میں زیادہ آتی گئی۔ پانچسو ارکان کی سینیات عوام الناس کی ایک چھوٹی سی مجلس بن گئی، جسکے ارکان کے تقرر میں دولت و تعلیم کا مطلق لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔

---

[1] زینوفون نے اپنی کتاب "جمہوریت ایتھنز" میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اہل ایتھنز اچھے اور بُرے لوگوں میں تمیز کرنیکی پوری صلاحیت رکھتے ہیں اگر وہ بروں کو ترجیح دیتے اور اچھوں سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ یقین یہ کیا جاتا ہے کہ شخص واحد کی خوبی عوام کے لئے مفید نہیں بلکہ مضر ہوتی ہے اور یہاں مقصود سلطنت کا عمدہ انتظام نہیں ہے بلکہ عوام کی آزادی اور اقتدار سے غرض ہے (لیکن یاد رہے کہ اب یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ یہ کتاب زینوفون کی طرف منسوب کردی گئی ہے جو حقیقت میں اسکی تصنیف نہیں ہے اور عمومیت کی مخالفت میں ہے پس اُسے ایک موثر استدلال کی طور پر نقل کرنا مناسب نہیں یہ کتاب ۴۲۴ق م کے کچھ قبل یا بعد لکھی گئی تھی یعنی زینوفون کے مرنے سے ۶۹ برس پہلے)

ارکان کا انتخاب تک نہیں ہوتا تھا بلکہ قرعہ اندازی سے لوگ لیلئے جاتے اور اُسکے بعد پھر پچاس پچاس کے دس حصوں میں تقسیم کئے جاتے تھے اور ہر ایک حصہ باری باری چھتیسویں روز کاموں کا انصرام اپنے ہاتھ میں لے لیتا تھا۔ اس قسم کی جماعت عوام پر کوئی آزادانہ اختیار عمل میں نہیں لا سکتی تھی کیونکہ عوام ہی اُسے کبھی آسمان پر چڑھاتے تھے اور کبھی زمین پر گرا دیتے تھے۔ اُسکا کام صرف اتنا تھا کہ مجلس عام میں پیش کرنیکے لئے کام تجویز کرے اور عوام الناس کو حکومت خود اختیاری کے کام میں مدد دے۔

آرخون

"آرخون" اولاً اُن اعلیٰ حکام کو کہتے تھے جو ایوپریدوں میں سے ہوتے تھے اور سولون کے نظام سلطنت کے موافق اُنکا انتخاب سب سے دولتمند طبقے سے ہوتا تھا مگر جب عمومیت کو ترقی ہوئی تو نسب و دولت کی جگہ گروہ بندی نے لیلی اور آرخون عوام کے خادم اور بے شمار عدالتوں کے بے اختیار صدر رہ گئے۔

عدالتیں

عدالتوں کا انتظام بھی عمومی طریق پر ہوتا تھا اور وہ بھی ایک طرح کی عام مجلسیں ہوگئی تھیں۔ جن میں چھ ہزار سے کم اہل رائے شریک نہیں ہوتے تھے۔ ہر معاملے کا فیصلہ اُسکی اہمیت کے اعتبار سے ہوتا تھا کسی میں سو اہل رائے ہوتے تھے اور کسی میں ہزار۔ عدالت کے منافع اور اثر سے فائدہ اُٹھانے کا خیال ایک مرض مُزمن کی طرح تمام اہل ایتھنز میں سرایت کر گیا تھا۔ اُس سے ایک نہایت مذموم پیشہ مفت خوری کا نکل آیا تھا۔ ارسٹوفانیس نے ویسپس میں اسکی ہجو خوب لکھی ہے۔ عوام کے منتخب کردہ حکام اپنے کو عوام کی حکومت کا حامی اور ترقی دینے والا خیال کرتے تھے اور بے غرضانہ انصاف کرنیکے بجائے وہ فریقانہ مناقشات و اغراض میں پھنس جاتے تھے، اور عدالتیں خانگی اور سرکاری معرکہ آرائی کا دنگل بنجاتی تھیں۔ ان مفت خوروں اور ججوں کی رشوت ستانی اور تباہ کاری بہت جلد ترقی کر گئی اور عوام کی آزادانہ خود داری نے انصاف کو بالکل غارت کر دیا۔

---

# اکیسواں باب

## (ب) بلا واسطہ عمومیت پر تنقید

بلا واسطہ عمومیت کے خصوصیات

بلا واسطہ عمومیت کی کیفیت مع اُسکے عیب و صواب کے ذہین و فطین اہل ایتھنز کی تاریخ میں روشن حرفوں میں لکھی ہوئی ہمیشہ کے لئے موجود ہے۔

عمومیت اقتدار کے مقابلے میں آزادی کو ترجیح دیتی ہے۔ اہل ایتھنز کی حُریت پسندی اُنکے فنون لطیفہ کے کمال کا باعث تھی جسکی داد آج تک دیجارہی ہے لیکن عمومیت جس طرح سب کو آزادی دیتی ہے، اُسی طرح حکومت میں بھی سب کو شامل کرتی ہے۔ اہل ملک کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ بذات خاص حکومت کریں، یعنی حکومت کیلئے بہت وسیع قومی مجلسیں قائم کریں۔ لیکن یہ صرف چھوٹی سلطنتوں اور ایسی قوموں میں ممکن ہے جنھیں سلطنت کے باقاعدہ کاروبار میں وقت صرف کرنیکے لئے کافی فرصت ہو اور پھر اس سے یہ لازم آتا ہے کہ یا تو طرز معاشرت اور کاروبار میں نہایت سادگی ہو جیسا کہ کوہستان کی چھوٹی چھوٹی قوموں میں ہوتا ہے یا ایک ایسا مزدوری پیشہ گروہ موجود ہو جسے شہریت کے حقوق میں دخل نہ ہو متمدن قوم میں بلا واسطہ عمومیت ہمیشہ بے اصل ہوتی ہے، کیونکہ جب تک آبادی میں غلاموں کا ایک طبقہ نہ ہو اس قسم کی عمومیت قائم نہیں رہ سکتی۔

عوام کے جذبات اور حرص و طمع کا خطرہ

ان وسیع مجالس عامہ میں بہت آسانی سے اپنے غیر محدود اختیار کا خیال پیدا ہوجاتا ہے، جس سے ہر طرح کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اور اکثر مطلق العنانانہ حرص و طمع کو قانون و حق کی جگہ ملجاتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہر شخص فرداً فرداً اپنی جگہ پر ایماندار اور دور اندیش ہو مگر مجلس میں جاکر عام جوش میں سب بہہ جاتے ہیں اور جس تجویز کو ذرا دیر پہلے وہ بلا پس و پیش مسترد کر دیتے اس دفور جوش میں وہ اُسی کو منظور کر لیتے ہیں۔ مقررین صرف عوام کے جوش کو اُبھار کر اپنا اثر پیدا کرتے ہیں اور جب ایک مرتبہ یہ طوفان برپا ہوجاتا ہے تو پھر اُسکی زیادتی کو روکنے کے لئے کسی قسم کی شرم و حیا بھی کام نہیں دیتی[1]

[1] برک نے اس خیال کو نہایت خوبی سے اپنے "خیالات دربارۂ انقلاب فرانس" میں ظاہر کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ

قوی اخلاق کی اہمیت

پس اگر عمومیت کا ایک عمدہ نظامِ سلطنت بنانا ہو تو اسکے لئے ضروری ہے کہ ملک کے حصۂ غالب میں سیاسی اہمیت و قابلیت موجود ہو۔ انھیں اخلاق اور تعلیم دونوں میں اعلیٰ مرتبہ حاصل کرنا چاہئے۔ لیکن ایتھنز کی تاریخ اس تجربے کے خلاف متنبہ کر رہی ہے۔ ایک ایسی قوم میں جس نے اس قدر نمایاں ذہنی ترقی حاصل کر لی تھی، جس نے مصیبت اور خطرے کے وقتوں میں اپنے اخلاق کا سکہ جما دیا تھا، اُس میں بھی خالص جمہوریت بہت تھوڑی ہی مدت تک ابتذال اور تباہی سے محفوظ رہ سکی۔ جب ایتھنز کی قوت و ثروت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچا ہوا تھا اُسوقت بھی اُسکی اس عظمت کا باعث قوم کی حکومت نہیں تھی بلکہ عملاً اُس حکومت کا ترک کر دینا اور اسے ایک شخصِ واحد کو تفویض کر دینا اسکا سبب تھا۔ پیری کلیس کے زمانے کے متعلق تھیوکیڈیڈیس لکھتا ہے کہ ایتھنز[1] میں عمومیت محض نام کو تھی ورنہ در اصل وہاں ایک شخص کی حکومت تھی جو شہریوں میں سب سے برتر تھا۔

عوام جب ایک مرتبہ مئے اقتدار سے سرمست ہو گئے تو پھر وہ اپنی خوبیوں کو برقرار نہ رکھ سکے۔ جب تک لوگوں کو خدا کی گرفت کا خوف، رسم و رواج کے قیود کا لحاظ اور بہترین اشخاص کے اقتدار کی وقعت کا خیال رہتا ہے اُسی وقت تک سلطنت کی عمومی صورتیں قائم رہ سکتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ عمومی سلطنت میں معاملات ملکی میں دخل رکھنے سے عوام کی سطح بلند ہو جاتی ہے اور دوسری سلطنتوں کے باشندوں کے مقابلے میں انھیں اپنے قوٰے کے نشو و نما کا زیادہ احساس ہوتا ہے اور اس اعتبار سے

(بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ) جہاں عوام کو مطلق اور بے قید اختیار حاصل ہوتا ہے وہاں لوگوں کو اپنی قوت پر بہت زیادہ اعتماد ہوتا ہے کیونکہ اُنکے اعتماد کی بنا قوی ہوتی ہے۔ زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ وہ خود ہی اپنے آلۂ کار ہوتے ہیں وہ اپنے مقصود اصلی سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے وہ دنیا کی سب سے بڑی قوت یعنی عزت و وقعت کے احساس کی ذمہ داری کو کم محسوس کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے عام کاموں میں ہر شخص پر فرداً فرداً بدنامی کا جو بار پڑیگا وہ بہت کم ہوگا۔ اختیار کے غلط استعمال کرنیوالوں کی تعداد جسقدر زیادہ ہوگی اُسی قدر رائے عامہ کا اثر کم ہوگا۔ اُنکا خود اپنے فعل کو پسند کرنا اُنکی نظر میں پسندیدگی عام کا حکم رکھتا ہے اسلئے ایک کامل عمومیت دنیا میں سب سے زیادہ بے شرم شئے ہے، اور جسطرح یہ سب سے زیادہ بے شرم ہے اسیطرح سب سے زیادہ نڈر بھی ہے۔

[1] تھیوکیڈیڈیس، جلد ۲، صفحہ ۶۹۔

وہ دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اُن میں ہر فرد مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیشے کی زندگی تک محدود نہ رہے بلکہ کچھ زیادہ وسیع النظری اختیار کرے اور تاریخ کے اہم قوانین اور قوم کی مجموعی زندگی سے آشنا ہوجائے، لیکن جب غیر محدود طاقت کا خیال غالب آجاتا ہے تو ہیبت و وقعت کا احساس بہت جلد غائب ہوجاتا ہے اور چونکہ سلطنتوں کی دوسری قسموں کے مانند عمومیت میں حاکم و محکوم کا امتیاز نہیں ہوتا اس لئے اختیارات بہت آسانی سے خراب کردیئے جاتے ہیں۔ عوام بُری خواہشات کے تابع ہوجاتے ہیں، اپنے سے معزز و برتر قلیل التعداد جماعت سے اُنھیں حسد ہوجاتا ہے اور وہ اُسے پریشان کرنے لگتے ہیں کیونکہ اُس جماعت کا وجود بجائے خود عامۃ الناس کے لئے ایک دائمی ملامت و لعنت کا باعث ہوتا ہے۔ عوام الناس کی بدترین صفات اپنا اثر دکھانے لگتی ہیں۔ غرور، حرص و ہوا کے آزادانہ اظہار، کثیر التعداد بیکار تغیرات کی خواہش و قساوتِ قلبی کا زور ہوجاتا ہے۔ جمہور جس قدر خود اپنے اوپر حکمرانی کو سہل کرتے جاتے ہیں اُسی قدر دوسروں پر اُنکی حکمرانی زیادہ تکلیف دہ ہوتی جاتی ہے۔ فرقہ بندیاں قائم ہوجاتی ہیں اور آپس کی منافرت حب الوطنی سے زیادہ ہوجاتی ہے اور انکی مہلک جنگ و جدل میں ملک تباہ و برباد ہوجاتا ہے مسلسل تغیرات سے سلطنت خطرے میں پڑ جاتی ہے اور کسی ایک حالت پر استقلال نہ ہونیکے باعث تباہ ہوجاتی ہے۔ چنانچہ سلطنت ایتھنز کی عظمت اگرچہ بہت ہی تابناک تھی مگر یہ عظمت و شوکت بہت ہی تھوڑے دنوں تک قائم رہی اور اسکے بعد ایک ایسے طویل انحطاط کا زمانہ آیا جس سے ایتھنز پھر سنبھل نہ سکا[1]

حُبِ مساوات

ہر عمومی سلطنت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں مساوات کی محبت پائی جاتی ہے۔ ایتھنز میں یہ اصول جس انتہائی حد تک بلا خیال کسی اور امر کے ترقی کر گیا تھا اسکی مثال زمانہ مابعد کی کسی عمومی سلطنت میں نہیں ملتی۔ جہاں تک ممکن تھا اہل شہر خود ہی براہ راست سلطنت کے کام انجام دیتے تھے کیونکہ نیابت کے طریقے میں منتخب شدہ نمایندوں کو

---

[1] ایتھنز کی تاریخ کا عظیم الشان دور کلائس تھینیس (۵۱۰ ق م) کے وقت سے شروع ہوا۔ جس نے خالص عمومیت قائم کی تھی اور پیری کلیس (۴۲۹ ق م) کے انتقال پر ختم ہوا اس طرح یہ دور صرف ۸۲ برس رہا۔

کچھ نہ کچھ سبقت و فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔ جب کسی عہدے پر ریاسیات میں چند اشخاص کے مقرر کرنیکی ضرورت ہوتی تھی تو اہل ایتھنز انتخاب کے بجائے قرعہ اندازی کے مجہول طریقے کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ انتخاب کی حالت میں ذہنی اور اخلاقی خوبیوں کا خیال کرنا پڑتا تھا۔ حکام میں جلد جلد تغیر و تبدل ہوتا رہتا تھا تاکہ مدت اختیار کی طوالت کے باعث انھیں عوام پر برتری نہ حاصل ہو جائے[۱] حکام کے وجود سے اطاعت لازم آتی تھی اور یہ امر فی نفسہ عمومی اصول مساوات کے خلاف تھا۔ پس اگر اس عدم مساوات سے چارہ نہیں تھا تو یہ ضروری تھا کہ جہاں تک ہو سکے قرعہ اندازی اور کثرت تغیرات کے ذریعے سے وہ اثر گھٹا دیا جائے۔ عمومیت جس مساوات کو پسند کرتی ہے وہ تعداد کی مساوات ہے، اُسکا اصول موضوعہ یہ نہیں ہے کہ ہر شخص کی حیثیت اُسکے حسب لیاقت ہو بلکہ "جیسا ایک ویسا دوسرا"۔[۲]

نفی بلد

عمومی مساوات کا دوسرا نتیجہ نفی بلد ہے۔ یونانیوں میں اسکی کارروائی علانیہ ہوتی تھی اور اسے لوگ قریب قریب عزت کے مرادف سمجھتے تھے مگر موجودہ سلطنتوں میں اگرچہ عملاً یہ طریقہ رائج ہے مگر باضابطہ تسلیم نہیں کیا جاتا اور علی العموم ذلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جس نظام سلطنت کو اپنی بقا کی خواہش ہو اُسکے لئے لازمی ہے کہ اُسے یہ اختیار حاصل ہو کہ جن اشخاص کو وہ اپنے وجود کے منافی سمجھے اُنھیں خارج کر دے۔ عمومیت پر یہ الزام نہ لگانا چاہئے کہ وہ اپنے ایسے شہریوں کو جلاوطن کر دیتی ہے جنکی شخصی فوقیت عام مساوات کیلئے خطرناک ہوتی ہے جیسا کہ ایتھنز میں ہوا کرتا تھا مگر عمومیت کے فوائد میں یہ امر ضرور بحث طلب ہے کہ وہ عوام الناس کی ذلت پسندیوں کو تو برداشت کر لیتی ہے مگر مخصوص افراد کی بلندی و برتری کی تاب نہیں لا سکتی۔

بلا واسطہ عمومیت صرف چھوٹی اور غیر ترقی یافتہ سلطنت میں قائم رہ سکتی ہے

خلاصہ یہ کہ جس قسم کی بلا واسطہ جمہوریت یونان میں قائم تھی وہ صرف چھوٹی سلطنتوں، خاصکر زراعت پیشہ اور گلہ بان قوم کے لئے موزوں ہے[۳] کیونکہ اُن کے طرز زندگی میں

---

[۱] ارسطو "سیاسیات" جلد ۶؛ ۱، ۸۔

[۲] " " جلد ۵؛ ۱، ۷، اور جلد ۶؛ ۱، ۶۔

[۳] ارسطو نے اس رائے کو شرح و بسط سے بیان کیا ہے ("سیاسیات" جلد ۶؛ ۲، اور آگے)

قدیم رسم و رواج کی سادگی باقی رہتی ہے۔ ایک اعلیٰ تمدن اور وسیع تعلقات کی قوم میں اُس سے ایک فوری جوش پیدا ہوجاتا ہے مگر وہ بہت جلد ناکافی اور مضر ثابت ہوجاتا ہے۔ ایک صورت میں عمومیت فطرت کے موافق اور بااعتدال معلوم ہوتی ہے، دوسری صورت میں وہ اوباشی وزیاں کاری کی طرف مائل ہوجاتی ہے۔ اس صورت میں وہ جس آزادی کی توقع دلاتی ہے وہ تمام اعلیٰ صفات پر ایک ناروا زیادتی اور عوام الناس کی بے قید وحشیانہ حرص وہوس کا آلہ بن جاتی ہے۔ ترقی پذیر تمدن جب ایک مرتبہ اپنے اختلافات اور متبائن حالات کو قائم کردیتا ہے تو پھر مساوات کے تمام دعوے محض دروغ بافی اور فساد معلوم ہوتے ہیں۔

---

(بقیۂ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) یونان کے تجربے سے اس کی تصدیق ہوچکی تھی، اور زمانۂ مابعد میں سوئزرلینڈ میں بھی اس خیال کی صحت ثابت ہوگئی۔

# بائیسواں باب

## (ج) نیابتی عمومیت اور موجودہ زمانہ کی جمہوریت

بلا واسطہ حکومت عوام کے بجائے نیابتی حکومت کا قائم ہونا

اس زمانے میں بلا واسطہ عمومیت صرف نہایت ہی مستثنیٰ اور بہت ہی سفید صورت حالات میں قائم رہ سکی ہے اور اس پر بھی ایتھنز کی بہ نسبت اسکی حالت میں بہت زیادہ اعتدال رہا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے بعض کوہستانی صوبوں میں ابتک اسکا وجود پایا جاتا ہے۔ مجلس عامہ سال میں ایک مرتبہ جمع ہوتی ہے اور اس چھوٹی سی جمہوریہ کے عہدوں اور اعزازوں کی تقسیم ہاتھوں کے شمار سے ہوتی ہے، بالعموم یہ اعزاز سب سے زیادہ معزز خاندانوں کو دیے جاتے ہیں۔ یہ مجلس عام اُن قوانین کو بھی منظور کرتی ہے جنھیں کونسلیں (مجالس خاص) تیار کرتی ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی عمومیات جن پر یورپی زندگی کی عام رفتار کا اثر بہت ہی کم پڑا ہے وہ اس اعتبار سے عزت و توقیر کی مستحق ہیں کہ اُنکی پانچسو برس کی تاریخ بہت ہی مردانہ واقعات سے بھری ہوئی ہے اور ظلم و زیادتی کا دھبا اُن پر کم لگا ہے۔ نیز اُن کے رسم و رواج کی سادگی اور باشندوں کا امن اور فراغبالی سے زندگی بسر کرنا بھی سزاوار وقعت ہے، لیکن ادھر قریب زمانے میں اُن میں یہ میلان پیدا ہوگیا ہے کہ جس قسم کی نیابتی صورت حکومت، سوئٹزرلینڈ کے دوسرے صوبوں اور ممالک متحدہ امریکہ میں رائج ہے ویسی ہی حکومت اپنے یہاں بھی رائج کریں۔ چنانچہ ۱۷۹۳ء اور ۱۸۴۸ء کی فرانسیسی تحریکات نے نیابتی نظام سلطنت کے قائم کرنیکی کوشش کی تھی اور موجودہ زمانے میں عمومیت کی حامی جماعتوں میں ہر جگہ یہی خیال غالب ہے۔ پس موجودہ زمانے کی عمومیت کو نیابتی عمومیت کہنا بالکل بجا ہے۔

نیابتی عمومیت کی ابتدا امریکہ سے ہوئی

جس طرح آئینی بادشاہی کی ابتدا انگلستان سے ہوئی، اسی طرح نیابتی عمومیت یا بالفاظ اہل امریکہ جمہوریت کی موجودہ صورت کا نشو و نما شمالی امریکہ میں ہوا۔ یہ امر خیال کرنیکا ہے کہ موجودہ زمانے کی سلطنت کی یہ دونوں خاص صورتیں اینگلو سیکسن ہی

قوم ہی کی سیاسی طباعی کا نتیجہ ہیں۔

اسکے پیدا ہونیکے اسباب

ایک جدید عمومی نظامِ سلطنت کی ابتدا اور اُسکے نشو و نما کیلئے متعدد اسباب جمع ہو گئے تھے۔ ایک حد تک اس ملک کی وسعت بھی اسکا سبب تھی، جہاں زمین کو قابل کاشت بنانے کے قبل سخت محنت کی ضرورت تھی۔ ابتدائی تاریخ سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وسیع ممالک عمومیت کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ بالعموم بڑے بڑے بادشاہوں کی جانب سے اُن ملکوں میں نئی آبادیاں قائم کی گئی تھیں اور آبادکار سختی کے ساتھ بادشاہت کے تابع رکھے گئے تھے۔ جنوبی امریکہ میں بھی نئی آبادکاریاں قائم ہوئی تھیں اور زمین کے وسیع قطعات پر کم تعداد آبادی کو پھیلا کر اُنھیں قابل پیداوار بنا دیا تھا مگر باوجود اس کے وہاں ایک مدت دراز تک کوئی عمومیہ قائم نہیں ہوئی۔ اُسکی راہ میں زمین کی خصوصیت نہیں بلکہ باشندوں کی خصلت حائل تھی؛ مگر پھر بھی وہ ملک کی وسیع زمین پر پوری آزادی کے ساتھ آسانی سے اپنے تئیں پھیلا سکے اور اُنھیں جو سخت مقابلہ فطرت کے ساتھ کرنا پڑا اُس نے اُنکی قوتِ عمل اور اُنکے ارادے کی پختگی کو برانگیختہ کر دیا۔

نیو انگلینڈ دنیا انگلستان

انگریز آبادکار اپنے قدیم وطن سے خود اختیاری حکومت کی قدرشناسی، آزادی کا احساس اور قانون کی الفت اپنے ساتھ لائے تھے۔ نئی دنیا میں اُنھیں جاگیرداروں اور امیروں کے انتظامات کے ظلم و جور سے بھی نجات حاصل ہو گئی۔ ان آبادکاروں میں اول روز سے کامل مساوات کا عملدرآمد جاری ہو گیا تھا۔ پیورٹین جو نیو انگلینڈ میں آکر آباد ہوئے تھے وہ انگلستان کے طبقۂ متوسط سے تعلق رکھتے تھے۔ اُنکا مذہبی عقیدہ ہر قسم کی کلیسائی حکومت کے خلاف تھا۔ اُنکی خواہش یہ تھی کہ وہ عیسائیوں کی ایک عالمگیر اقسیسیت میں شریک ہوں، وہ ایک دوسرے کو آپس میں بھائی بھائی سمجھتے تھے۔ وہ بحر اطلس کے دوسری طرف اس غرض سے گئے تھے کہ وہ اسقفی کلیسا اور اُس کی حمایتی سلطنت کے ظلم و ستم سے نجات پا جائیں اور اپنی مذہبی اور اپنی سیاسی آزادی کو برقرار رکھیں۔ اُنکے خیالات عمومیت کے ساتھ ہی مذہبی حکومت کی طرف بھی مائل تھے۔ وہ انگلستان کی شاہی اور پارلیمنٹی حکومت سے منحرف نہیں تھے مگر وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ حکومت کی براہ راست تعدی سے آزاد ہو جائیں۔ "آبائے زائرین" نے پلائی متھ میں اتر کر جس پہلے معاہدۂ باہمی مورخہ ۱۱ر نومبر ۱۶۲۰ء پر دستخط کئے تھے اُس سے شمالی امریکہ کی

عمومیت کے بدو وآغاز پر روشنی پڑتی ہے۔ اُنکے الفاظ یہ تھے "بسم اللہ آمین۔ ہم جنکے نام نیچے لکھے ہوئے ہیں اور جو بادشاہ جلالتماب شاہ جیمس کی وفادار رعایا ہیں، ہم خدا کی عظمت عیسوی مذہب کی ترقی اور اپنے بادشاہ اور ملک کی عزت کے خیال سے یہ سفر اختیار کر کے ورجینیا کے شمالی حصوں میں یہ پہلی نوآبادی قائم کرنے آئے ہیں۔ ہم اپنی اس تحریر کے ذریعے سے خدائے عزوجل اور ایک دوسرے کے روبرو باہدگر مستحکم عہد کرتے اور خود کو ایک ملکی جماعت قرار دیتے ہیں تاکہ ہم اپنا نظم ونسق، اپنی بقا کا انتظام بہتر طریق سے کر سکیں۔ اور اپنے مذکورۂ بالا مقاصد کو پورا کر سکیں اور اسی عہد کے ذریعے سے وقتاً فوقتاً اس قسم کے منصفانہ اور مساویانہ قوانین وضوابط وضع کریں نظام سلطنت بنائیں اور عہدے قائم کریں جو اس نوآبادی کی عام جماعت کی بہبود کیلئے سب سے زیادہ موزوں ومناسب معلوم ہوں۔ اور ہم ان قوانین وضوابط وغیرہ کی ہر طرح کی مناسب فرمانبرداری واطاعت کا وعدہ کرتے ہیں" روڈ آئیلینڈ، نیوہیون، کونکٹیکٹ اور پراوڈنس میں جو لوگ اول اول ترک وطن کر کے آئے انھوں نے بھی اسی قسم کی کارروائی اختیار کی۔ پس اس طرح اُن جماعتوں نے جو نیو انگلینڈ کے حلقۂ نوآبادی پر مشتمل ہیں اور جنہیں سب کا سرگروہ میساچوسٹ تھا، انھوں نے حکومت کی ایک ایسی صورت اختیار کی جو آزاد اشخاص کا مشترکہ کام معلوم ہوتی تھی۔

ورجینیا

جنوبی حلقے کے حالات اس سے بالکل مختلف تھے۔ اسی حلقے کو اولاً ورجینیا کہتے تھے مگر بعد کو ورجینیا کا لفظ اس حلقے کی سب سے زیادہ اہم نوآبادی کے لئے مختص ہوگیا تھا۔ وہاں اسقفی کلیسا اور اسکا اعیانی نظام معاً تسلیم کر لیا گیا۔ اگرچہ آبادکار زیادہ تر متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے مگر اُس آبادکاری کے انتظام میں مذہبی اغراض کے بجائے اقتصادی اغراض زیادہ غالب تھے۔ علاوہ اسکے جماعت اعیان کے بہت سے ارکان ایسے تھے جو وہاں بڑی بڑی جائدادوں کے مالک تھے۔ بعد کو طلب معاش میں بہت سے بیفکروں نے یہاں آکر آبادی کو بڑھا دیا اور لنڈن کی پولس نے مجرموں اور اوباشوں کو بھی وہاں منتقل کرنا شروع کر دیا۔

کیرولینا

تاہم ورجینیا تک میں بھی یہ نہو سکا کہ انگلستان کے مانند اعیانی نظام سلطنت قائم ہو جاتا اور شیفٹسبری کی خواہش پر لاک نے ۱۶۶۹ء میں کیرولینا کے لئے

اس قسم کا نظام سلطنت تیار کرنیکی جو یادگار کوشش کی وہ بالکل ہی ناکام رہی آباد کار اسے گوارا نہیں کرتے تھے کہ جس صورت میں وہ کہیں نہ کہیں خود آزادانہ زمین کے مالک ہوسکتے تھے اُس حالت میں وہ رئیسوں اور زمینداروں کی مستاجری قبول کریں چنانچہ ۱۶۹۳ء میں لاک کا نظام سلطنت منسوخ کر دیا گیا۔ شمالی اور جنوبی دونوں نو آبادیوں میں چونکہ آباد کار بوجہ بُعدِ مسافت کے بذات خاص مجتمع نہیں ہوسکتے تھے اس لئے انھوں نے نیابتی مجلسیں قائم کریں، جنکے قائم مقاموں کا انتخاب آزادانہ ہوتا تھا اور یہی مجلسیں نو آبادی کی خود مختاری کو قائم رکھتیں اور اسکے نظم و نسق کی نگرانی کرتی تھیں۔ اس انتظام کی ابتدا کا سراغ گزشتہ زمانے میں ۱۶۱۹ء تک ملتا ہے اور بہت جلد یہی طریقہ تمام نو آبادیوں میں رائج ہوگیا۔

نیو یارک اور پنسلونیا

وسطی حلقے میں غیر ملکی عناصر بہت کثرت کے ساتھ مل گئے تھے اور نیو یارک (جو اولاً نیو ایمسٹرڈم کہلاتا تھا) اور پنسلونیا میں اُسکا زیادہ غلبہ تھا مگر وہاں بھی انگریزی قوم کے اثر سے اصولاً وہی نظام سلطنت اختیار کیا گیا جو اور جگہ اختیار کیا گیا تھا۔ جن امور میں سب نو آبادیاں یکساں تھیں وہ حسب ذیل ہیں :—

نو آبادیوں کے نظامہائے سلطنت کے مشترک عناصر

(الف) انگریزی قانون جس میں زمیندارانہ اور جاگیردارانہ مستاجری کا دخل نہ ہو اقتصادی اصول کی بنیاد زمین کی آزاد ملکیت پر ہو۔

(ب) مرتبے اور حقوق میں کامل مساوات ہو اور انگلستان میں جس قسم کی اعیانی حکومت اُسوقت تک قائم تھی اُسکا کوئی اثر نہ ہو، لیکن نسل کے نمایاں فرق سے اس مساوات میں خلل آگیا تھا "رڈ انڈین"، یعنی ملک کے اصلی باشندے سفید رنگ لوگوں کے ہم پایہ نہیں قرار دیئے گئے تھے نہ انھیں حکومت میں کچھ حصہ دیا گیا۔ حبشیوں کی حالت اس سے بہت گری ہوئی تھی۔ یہ حبشی افریقہ سے لائے ہوئے غلاموں کی اولاد تھے۔ بالعموم وہ سفید رنگ آباد کاروں کی ملک تھے اور اگر شاذ و نادر وہ آزادی بھی حاصل کر لیتے تھے تو بھی شہریت کے سیاسی حقوق انھیں ہرگز ہرگز نہیں ملتے تھے۔

(ج) سلطنت کی مدد کے بجائے خود اپنے زور بازو پر اعتماد کرنیکی مستقل عادت۔ اس کی کیفیت ابتدائی آباد کاری میں خوب واضح نظر آتی ہے جب کہ ہمسائے لکڑیوں کے مکان بنانے میں ایک دوسری کی مدد کرتے تھے۔

(د) قومی مدرسوں کے ذریعے قوم کی عام تعلیم۔ اس قسم کے مدرسے بہت ہی ابتدائی زمانے میں دیہاتیوں نے اپنے بچوں کے لئے قائم کر لیے تھے اور بہت سی نو آبادیوں میں اُنکی حاضری لازمی قرار پا گئی تھی۔

(ھ) دیہات کا آزادانہ انتظام اور صوبوں کا خود مختارانہ نظم و نسق۔

(و) عہدہ داروں کی مختصر تعداد۔ اُن میں سب سے زیادہ اہم عہدہ کل نو آبادیوں کے گورنر (والی) کا ہوتا تھا۔ یہ والی اجازت یافتہ (chartered) نو آبادیوں میں آبادکاروں کی طرف سے منتخب ہوتے تھے اور زمیندارانہ نو آبادیوں میں زمینداروں کی طرف سے نامزد ہوتے تھے اور شاہی نو آبادیوں میں انگریزی حکومت کی طرف سے اُنکا تقرر ہوتا تھا۔ اسکے بعد دوسرا درجہ ججوں کے صدر کا ہوتا تھا۔ ان دونوں عہدہ داروں کو اہل ملک کے نمایندوں کے ساتھ ملکر کام کرنا ہوتا تھا۔ والی کے ساتھ اہل کاؤنسل ہوتے تھے اور ججوں کے ساتھ پنچ (juror)؛ ناظمان امن کو انگلستان میں بادشاہ معززین میں سے نامزد کرتا تھا مگر امریکہ میں ہمیشہ زمین کے آزاد کاشتکار ہی ناظم امن ہوتے تھے۔

(ز) مستقل فوج شاید ہی کہیں ہوتی ہو۔ اُسکے بجائے ملیشیا (محافظ ملک فوج) ہوا کرتی تھی۔

(ح) ایک دار المبعوثین کا وجود جسے ہر نو آبادی میں آزاد اشخاص منتخب کرتے تھے۔ یہ دار المبعوثین قوانین کے بنانے میں سینیات کے ساتھ ملکر کام کرتا تھا مگر محاصل کی منظوری اور نظم و نسق کی نگرانی میں وہ تنہا کارروائی کرتا تھا۔

(ط) عہدوں کے لئے مختصر مدت کا رواج تاکہ کثرت کے ساتھ تغیر کا موقع مل سکے۔

(ی) سب سے آخر میں اخباروں کی آزادی کا تدریجی نشو و نما اور اتحاد عمل کی آزادی تھی۔

انھیں بنیادوں پر ہر ایک نو آبادی میں انگلستان سے تفریق ہونے سے بہت قبل ایک خود مختارانہ نیابتی نظامِ حکومت قائم ہو گیا تھا اور اولاً خود تاج برطانیہ کی طرف سے اُسکی ہمت افزائی ہوئی تھی۔ پس جب ۱۷۷۶ء میں اعلان آزادی نے انگلستان کے بادشاہ اور پارلیمنٹ سے تعلقات منقطع کر دیئے تو نئی جمہوریتیں فوراً مکمل حالت میں قائم ہو گئیں۔

اتحاد ۱۷۸۷ء میں اتحاد کا متحدہ نظام سلطنت صرف اتنا ہی تھا کہ یہی صوبہ وار حکومتوں کا طریقہ وسیع پیمانے پر اُس مجموعی سلطنت پر عائد کر دیا جائے جو اُسوقت قائم ہو گئی تھی۔

۲۔ فرانس فرانسیسیوں نے ۱۷۹۳ء اور ۱۷۹۵ء میں اور پھر ۱۸۴۸ء اور ۱۸۷۰ء میں سلطنت کی

اس نئی صورت کی نقل کی مگر انھیں مستقل کامیابی نہیں حاصل ہوئی۔ فرانسیسیوں نے دیوانہ وار جوش کے ساتھ آزادی، مساوات واخوت، کے سیاسی خیالات کو قبول کیا مگر ان کے روایات شاہانہ تھے اور انکے رسم ورواج میں جمہوریت کا اثر بہت ہی خفیف تھا۔ انکا میلان ہمیشہ سے یہ رہا کہ خود اپنی مدد کرنیکے بجائے سلطنت سے مدد کے خواہاں ہوں۔ سلطنت کی شان وشوکت اور اسکے اقتدار کو آئینی زندگی کی پابندی قانون اور بے نمائش محنت پر ترجیح دیں۔ فرانسیسیوں کا مرکزیت کا رجحان جمہوریت کے بجائے ہمیشہ شاہی طرف زیادہ رہا ہے (الف)

۴۔ سوئزرلینڈ

فرانس کے برخلاف امریکہ کی نیابتی حکومت سوئزرلینڈ کو راس آگئی، حالانکہ فرانسیسیوں ہی کے توسط سے یہ طریق حکومت وہاں پہنچا تھا۔

سوئزرلینڈ میں بڑے بڑے صوبوں میں اعیانی طریق پر حکمرانی ہوتی تھی۔ برن، فرائیبرگ، سولیر اور لیوزرن وغیرہ میں امرا کا ایک موروثی طبقہ تھا اور زیورچ، بازل، شف ہاوزن وغیرہ میں اہل شہر کی مجلسیں تھیں جو اپنے میں کسی اور کو داخل نہیں کرتی تھیں لیکن عوام کی آزادی قائم تھی اور اُسی پر صوبجاتی انتظام کی بنیاد رکھی گئی تھی اور جمہوریت ہی قوم کا سیاسی منتہائے خیال تھی اور اُسکا اثر عوام کے عادات واخلاق میں راسخ ہوگیا تھا۔ نہ کوئی مستقل فوج تھی اور نہ دائمی عہدہ دار تھے۔ سوئزرلینڈ کی خودمختاری حکمرانوں اور امیروں سے کشمکش کے بعد حاصل ہوئی تھی۔ پس جدید خیالات کے موافق ملکی آزادی کو تمام طبقات اور کل ملک پر وسعت دیدی گئی اور امرا اور ذی اثر اہل شہر کے امتیازات منسوخ کردیے گئے تو اُس سے غیر متوقع امر ظہور میں نہیں آیا۔ اس تغیر سے صرف یہ ہوا کہ اعیانی جمہوریت کے بجائے نیابتی جمہوریت مکمل ہوگئی۔[۱]

---

(الف) (۱۸۷۰ء سے فرانس میں جمہوریت قائم ہوگئی ہے اور اب شاہی کی بازگشت کی کچھ امید باقی نہیں رہی ہے۔ انگریزی مترجم)

[۱] دیکھو ۱۸۰۳ء کا "ایکٹ آف میڈیئیشن" ۲۰، ۳ اور بلنچلی "سوئزرلینڈ کی متفقیت کا قانون"، جلد ۱ صفحہ ۴۲۴۔ ۱۸۴۸ء و ۱۸۷۴ء کے اتحادی نظامِ سلطنت کی دفعہ (۴) حسب ذیل ہے۔ "سوئزرلینڈ میں نہ کوئی رعایا ہے اور نہ عہدے، نہ نسب نہ خاندان یا شخصیت کا کوئی امتیازی حق ہے"۔

تمام سوئزرلینڈ کو ایک نیابتی عمومیت میں متحد کرنیکی کوشش میں جو نظام سلطنت ۱۷۹۸ء میں نافذ کیا گیا اُسے بھی استقلال نہیں حاصل ہوا۔ قدیم صوبوں کی آزادی کی روایات اور اندرونی مخالفت کے عناصر اس قدر قوی تھے کہ اُنکا ہلویشیا کی جمہوریت کے تابع ہونا ممکن نہ تھا اور یہ جمہوریت بہت جلد منسوخ کر دیگئی، لیکن اکثر صوبوں اور خاصکر شہروں اور نئے صوبوں میں ۱۸۱۴ء کے بعد اعیانی حقوق کی گونہ رجعت کے باوجود نیابتی طریقے قائم رہے۔ ۱۸۳۰ء کے بعد کی اصلاحی تحریکات نے نیابتی صورت کو زیادہ آزادانہ طور پر ظاہر ہونیکا موقع دیا اور ۱۸۴۸ء میں متفقیت پر بھی اُسکا عملدرآمد ہوگیا۔

۴۔ قدیم وجدید عمومیت کے فرق

زمانۂ حال کی عمومیت قدیم یونانی صورت سے اصلاً مختلف ہے۔ فارس کے رہنے والے ہتانہ[ف۵] نے (ہیرودوتوس، مقالہ ۳، فصل ۸۲) قدیم عمومیت کی یہ پانچ خصوصیتیں گنائی ہیں (۱) تمام حقوق کی مساوات (۲) مشرقی مطلق العنانوں سے خود مختارانہ اختیار کا اخراج (۳) قرعہ اندازی سے عہدہ داروں کا تقرر۔ (۴) عہدہ داروں کی ذمہ داری (۵) مجلس عامہ میں عام مباحثہ اور فیصلہ۔ ان میں سے تین خصوصیتیں موجودہ سلطنت میں بھی مسلم ہیں خواہ وہ سلطنت آئینی بادشاہی ہو یا جمہوریت۔ مگر دوسری دو خصوصیتیں (یعنی قرعہ اندازی سے عہدہ داروں کا تقرر اور مجلس عامہ) اب متروک ہوگئی ہیں۔

قدیم عمومیت تمام اہل ملک کو یکساں طور پر حکومت میں شریک کرتی تھی۔ زمانۂ حال کی عمومیت بہترین اشخاص کو قائم مقام منتخب کرنے میں گویا اعیانی امتیاز پر کاربند ہوتی ہے اور اس اعتبار سے وہ عمومیت کی زیادہ اعلیٰ واشرف صورت ہے۔ اقتدار اعلیٰ کا حق مجموعۃً تمام اہل ملک یعنی قوم کو دیا گیا ہے مگر اس حق کا عملدرآمد سب سے قابل لوگوں کو تفویض ہوتا ہے جو تمام قوم کے نمایندے ہوتے ہیں۔

اہل ملک ملکی معاملات میں بطریق ذیل اب بھی براہ راست دخل رکھتے ہیں:۔

(الف) آئینی قوانین پر رائے دینے میں۔ سوئزرلینڈ میں ۱۸۳۰ء سے عام طور پر یہ اصول مسلم ہوگیا ہے کہ آئینی قوانین کے لئے تمام اہل ملک کی کثرت رائے ضروری ہے۔

[ف۵] (قدیم فارسی میں اس نام کا تلفظ ہُتانَ تھا) گو کہ کتابت "اُتانَ" ہوتی تھی۔ یونانیوں نے اُسے اوتانیس ( otanes ) بنالیا تھا۔ یہ فرناسپ کا بیٹا تھا۔ اردو مترجم)

اس میں ان لوگوں کا شمار نہیں ہے، جو رائے دینے سے گریز کریں۔ برخلاف اسکے ممالک متحدہ امریکہ میں رائے دہی کا کام تمام قوم کو تفویض نہیں کیا گیا ہے بلکہ قائم مقاموں کی ان متعدد مجلسوں کو دیا گیا ہے جو خاص اسی غرض سے منتخب ہوں (اسکو کانفرانس یا مجلس عارضی کہتے ہیں)

(ب) بعض اوقات دوسرے قوانین پر بھی رائے دینے میں[1] اس صورت میں عام فیصلے کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔ ایک اثباتی یعنی اہل ملک کا کسی فیصلے کو منظور کرلینا جس سے قانون کو جواز حاصل ہو جائے (یہ مراجعہ کہلاتا ہے)۔ دوسری صورت منفی یعنی ابوانہائے مبعوثین کے منظور کرلینے کے بعد قوم کو اس قانون کے نامنظور کردینے کا موقع دیا جائے۔ ثانی الذکر صورت میں جو لوگ قانون کے خلاف رائے دیں انکی تعداد تمام اہل ملک کی تعداد کے نصف سے زائد ہونا چاہئے برخلاف اس کے اول الذکر صورت میں رائے دینے والوں کی معمولی کثرتِ رائے ہی سے فیصلہ ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں طریقے خالص عمومیت سے ماخوذ ہیں اور چونکہ ان سے عوام الناس میں بہت آسانی سے اشتعال پیدا ہو جانے کا احتمال رہتا ہے اس لئے وہ علم و تہذیب کے لئے خطرے سے خالی نہیں ہیں۔ اولاً ان قواعد کو سوئزرلینڈ کے چند منفرد صوبوں نے جاری کیا اُس کے بعد ۱۸۷۴ء میں کل اتحاد کے لئے وہ منظور کرلئے گئے[2]

---

[1] نظام سلطنت زیورچ بابت ۱۸۳۱ء دفعہ ۹۳۔ "آئینی تغیر کی کوئی تجویز جس پر مجلس عظمیٰ میں دوبار بحث ہوچکی ہو اگر منظور ہو جائے تو تمام اہل ملک کے سامنے منظوری یا نامنظوری کیلئے پیش کیجائے"۔ سوئس متفقیت کا ۱۸۴۸ء اور ۱۸۷۴ء کا اتحادی نظام سلطنت دفعہ (۶) "اتحاد، صوبجاتی نظامہائے سلطنت کی حفاظت کی ذمہ داری کرتا ہے، بشرطیکہ اُسے قوم نے قبول کرلیا ہو اور اہل ملک کی ادنیٰ اکثرت رائے بھی جسوقت اسکی نظر ثانی کی خواہش کرے اُس پر نظر ثانی کیجائے"۔

[2] ۱۸۷۴ء کے اتحادی نظامِ سلطنت کی دفعہ ۸۹ حسب ذیل ہے:

"وہ اتحادی قوانین یا فیصلے جو تمام مشترکیت پر عاید ہوتے ہیں اور زیادہ فوری اہمیت کے نہیں ہوتے وہ قوم کی منظوری یا نامنظوری کے لئے پیش کئے جاسکتے ہیں بشرطیکہ تیس ہزار حق رائے دہی رکھنے والے باشندگان سوئزرلینڈ یا آٹھ صوبہ جات اُسکا مطالبہ کریں"۔

(ج) مجلس واضع قوانین کے ارکان کے انتخاب میں۔ یہ انتخابات بالعموم برابر کے انتخابی حلقے اور سر شماری کے حسابی طریق پر مبنی ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی اُنکی بنا تنظیمی تقسیم یعنی کمیون پر بھی ہوتی ہے۔ پس عام طور پر نیابت نامکمل رہتی ہے اور اکثر اُسکا فیصلہ فریقانہ خیالات سے ہوتا ہے۔ یہ خرابی نیابتی حکومت کا لازمی خاصہ یا اُسی تک محدود نہیں ہے بلکہ آئینی بادشاہت میں بھی اسی طرح عیاں ہے۔

۵۔ نیابتی جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ

اعلیٰ اقتدار کا باقاعدہ عملدرآمد علی العموم بہت وسیع مجلسوں کو سپرد ہوتا ہے جو با اقتدار قوم کی نہایت ہی اتم و اکمل نیابت کی حیثیت سے منتخب ہوتی ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ میں سوئٹزرلینڈ میں شہروں کی مجالسِ عظمیٰ اور زرعی صوبوں کی "مجالس ملکی" درحقیقت اصلی مجالس کی وسعت دادہ صورتیں تھیں۔ جنھوں نے اختیارات کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا اور انھیں مجلسوں میں اہم معاملات کے لئے (اور شہروں میں قانون سازی کی ضرورت سے بھی) صوبے کے دوسرے ارکان کی کمیٹیوں کا اضافہ کر لیا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے میں مجالسِ عظمیٰ حکومت سے علٰحدہ ہیں اور انھیں باضابطہ اقتدار اعلیٰ حاصل ہونیکے باعث اُنکا مرتبہ بھی بلند ہو گیا ہے [1]۔ متفقی مجلس کو، جس میں دو ایوان ہوتے ہیں، متفقی حکومت کے مقابلے میں یہی درجہ حاصل ہوتا ہے [2]۔

شمالی امریکہ میں قومی موتمر اور ہر ریاست کی جماعتہائے واضع قانون دو دو ایوانوں پر مشتمل ہیں اور حکومت سے جدا حیثیت رکھنے میں، سوئٹزرلینڈ سے بھی بڑھی ہوئی ہیں۔

---

[1] ۱۸۳۱ء کے زیورچ کے نظام سلطنت کی دفعہ ۳۸ حسب ذیل ہے:۔
"نظام سلطنت کے بموجب اعلیٰ اختیار کا عملدرآمد مجلس عظمیٰ کو سپرد کیا گیا ہے۔ قانون کا بنانا اور مقامی نظم ونسق کی نگرانی کرنا اسی مجلس سے متعلق ہے اور صوبے کے خارجی تعلقات میں یہی مجلس اُسکی نمایندگی کرتی ہے۔"

[2] ۱۸۴۸ء کے اتحادی نظام سلطنت کی دفعہ (۶۰) حسب ذیل ہے:۔
"مشترکیت کے اختیارات اعلیٰ کا عملدرآمد اتحادی مجلس کے سپرد ہے۔ جسکے دو حصے ہیں ایک نیشنل کاؤنسل (مجلس قومی) اور دوسری کاؤنسل آف اسٹیٹس (مجلس طبقات)۔" ۱۸۷۴ء کے اتحادی نظام سلطنت کی دفعہ (۱۷) حسب ذیل ہے:۔ "قوم اور صوبہ جات کے حقوق کو محفوظ رکھتے ہوئے مشترکیت کے اعلیٰ اختیارات کا نفاذ اتحادی مجلس کے ذریعے سے ہوگا۔"

۲۔ انتظامی اختیار

اب حکومت میں رعایا کا براہ راست کوئی دخل نہیں رہا ہے۔ جن سلطنتوں نے اغراضِ قانون سازی میں خالص عمومیت کو قائم رکھا ہے، وہاں بھی یہی حال ہے ہر جگہ حکومت کا کام رعایا کے با اختیار نائبوں کو سپرد ہے، جو رعایا کے نام سے اُسے عمل میں لاتے ہیں۔ بعض سلطنتوں میں حاکمِ اعلےٰ کا انتخاب رعایا براہ راست کرتی ہے مثلاً اکثر ریاستہائے امریکہ کے گورنر (والی) اور جینوا کے حکام شہر کا انتخاب تمام اہل ملک کرتے ہیں لہ ممالک متحدہ امریکہ کے رئیس جمہوریہ کا انتخاب وہ رائے دہندگان کرتے ہیں جو خود ابتدائی انتخاب کنندوں کی طرف سے منتخب ہوتے ہیں۔ برعکس اسکے بعض دوسری سلطنتوں میں اس انتخاب کا اختیار مجلسِ واضع قانون کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اس طرح خاص عہدوں کے تقرر میں وہ گویا رعایا کی نمایندگی کرتی ہے۔ یہ آخر الذکر طریقہ سوئزرلینڈ کی بیشتر جمہوریتوں میں رائج ہے۔ جہاں مجلس عظمیٰ اربابِ حکومت اور اعلےٰ ججوں کا تقرر کرتی ہے۔ یہی کیفیت فرانس اور امریکہ کی بعض ریاستوں کی ہے۔ ظاہر ہے کہ مقدم الذکر صورت میں حکومت کو زیادہ آزادی اور قوت حاصل ہوتی ہے خاصکر ایوانہائے مبعوثین کے مقابلے میں کیونکہ اُسے یہ دعوےٰ ہوتا ہے کہ ان ایوانوں کی طرح وہ بھی رعایا کی نمایندہ ہے اور نسبتاً اُسے عوام کا زیادہ اعتماد حاصل ہونے کا دعوےٰ ہوتا ہے۔ موخر الذکر صورت میں حکومت کا مدار مجلسِ قانون سازی پر زیادہ ہوتا ہے کیونکہ وہی اُسے وجود میں لاتی ہے اور اس لئے اسکا امکان کم ہوتا ہے کہ ایک قوت دوسری کو اُس کی حد کے اندر محدود کردیگی اور اس پر روک قائم رکھے گی (جؔ)

---

لہ فرانسیسی نظام سلطنت ۱۸۴۸ء کی دفعہ ۴۳ کی رو سے بھی ایسا ہی تھا: "فرانسیسی قوم، عاملانہ اختیار ایک شہری کو عطا کردیتی ہے۔ جو صدر جمہوریہ کا لقب پاتا ہے۔" دیکھو توک ول کی کتاب "جمہوریت امریکہ میں" جلد ۱۔ (معلوم ہوتا ہے کہ بلنچلی اس مقام پر دفعہ ۴۶ کا حوالہ دینا چاہتا تھا جو حسب ذیل ہے: "صدر کا انتخاب خفیہ رائے دہی کے ذریعے سے رایوں کے قطعی غلبے پر ہوتا ہے اور اس انتخاب میں فرانس اور الجیریا کے تمام اضلاع کے انتخاب کنندے شامل ہوتے ہیں" دیکھو لافیرایر اور بات بی کی کتاب کا مقدمہ صفحہ ۱۳۸۔ انگریزی مترجم)

(ج) (عاملانہ حکومت کے سرگروہ کے انتخاب کے ان دونوں طریقوں کا اہم فرق، فرانس کے ۱۸۴۸ء کے

۷۔ عدالتی اختیارات

عدالتی اختیارات بھی قوم کے نام سے نافذ ہوتے ہیں لیکن جج جنھیں خاص قابلیت یا تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے بالعموم یا تو حکومت کی طرف سے نامزد کیے جاتے ہیں جیسا کہ ممالک متحدہ امریکہ اور جمہوریۂ فرانس میں ہوتا ہے، یا مجلس قانون سازی کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں، جیسا کہ سوئزرلینڈ میں ہوتا ہے۔ مگر جوری (پنچایت) کے ذریعے سے رعایا کو براہ راست حصہ بھی ملتا ہے کیونکہ جورر (پنچ) بذریعۂ قرعہ اندازی تمام جماعت رعایا میں سے منتخب ہوتے ہیں۔

۸۔ مقامی انتظامات

ہر ایک نیابتی عمومیت میں کمیٹوں کا نظام حکومت خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ نظم و ترتیب کی بنیاد مستحکم وہی ہوتا ہے۔ کمیٹوں میں اہل شہر کو معاملاتِ عامہ اور حکومت خود اختیاری میں حصہ لینے کی اور مدنی آزادی کی تعلیم حاصل ہوتی ہے۔ انھیں مقامی انتظامات، بالخصوص انکے چھوٹے اور دیہاتی حلقوں میں ابتک یہ ممکن ہے کہ کل باشندے مقامی مجلس میں یکجا ہوسکیں۔ البتہ شہروں میں نیابت کی ضرورت ہوتی ہے۔ سوئزرلینڈ اور شمالی امریکہ کی جمہوریتیں، تاریخی طور پر جب اپنی بنا کا سراغ لگائیں گی تو یہی معلوم ہوگا کہ انکی ابتدا آزادانہ مقامی نظام حکومت سے ہوئی ہے۔ فرانس کے بارے میں اگر یہ کلیہ صادق نہیں آتا تو اس سے صرف اس امر کا مزید ثبوت ملتا ہے کہ فرانسیسیوں کا طبعی میلان جمہوری حکومت کی طرف نہیں ہے۔

قوم کو خود اپنے اقتدار اعلیٰ کے براہ راست استعمال میں جو نہایت خفیف حصہ حاصل ہے اُس سے قطع نظر کرکے جب ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نیابتی عمومیت میں قاعدہ یہ ہے کہ قوم اپنے حکام کے ذریعے سے حکمرانی کرتی ہے اور اپنے نائبوں کے ذریعے سے قانون بناتی اور نظم و نسق کی نگرانی کرتی ہے۔ اس امر میں موجودہ نظام سلطنت کو ان سلطنتوں سے خاص مشابہت حاصل ہے جو حاکم و محکوم کے درمیان فرق کرتی ہیں۔

---

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ۔ نظام سلطنت سے بہت صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ موسیو گریوی نے یہ تحریک کی تھی کہ رئیس جمہوریہ کو مجلس قومی منتخب کرے، مگر فیصلہ یہ ہوا کہ عام رائے سے اسکا انتخاب ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو برابر کی طاقتیں قائم ہوگئیں۔ ایک رئیس جمہوریہ، دوسری مجلس قومی اور ان دونوں کے درمیان اختلافات کے طے کرنیکا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اسی صورتِ معاملات سے نپولین سوم کو موقع ملگیا کہ اُس نے دوبارہ شہنشاہی قائم کردی۔ انگریزی مترجم۔)

# تیئیسواں باب

## (د) نیابتی حکومت عوام پر بحث

مونتسکیو نے عمومیت کا اصول نیک کرداری کو قرار دیا ہے۔ مگر نیک کرداری کا سب سے پہلا سیاسی اصول یہ ہے کہ حکمرانوں کی اخلاقی خوبیوں کی قدر و وقعت کیجائے نہ یہ کہ سب لوگوں کے درمیان مساوات قائم ہو۔ اور خالص عمومیت میں حکمرانوں کی اخلاقی خوبیوں کی قدرشناسی کا وجود کسی طرح پایا نہیں جاتا۔ ہاں صرف اتنا سچ ہے کہ ایک اچھی حکومت کی عملی ضروریات کے لئے ایک حد تک نیکوکرداری لابدی ہے اور اسکے فقدان سے بہت جلد سلطنت کا تباہ ہو جانا لازم ہے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ نیکوکرداری نیابتی عمومیت کا سیاسی اصول بن گئی ہے۔ یہ نیابتی حکومت صرف یہی نہیں کہ نسبتاً معتدل ہے بلکہ معزز تر بھی ہے کیونکہ انتخاب کے طریقے سے اسے اعیانی حکومت کے فواید کا کچھ حصہ حاصل ہو جاتا ہے۔

اسکا اصول یہ ہے کہ قوم کے بہترین افراد قوم کے نام اور اسکے حکم سے حکومت کرتے ہیں مگر بڑی مشکل یہ ہے کہ انتخاب کا انتظام کیونکر کیا جائے کہ بہترین قابلیت اور بہترین اخلاق کے لوگ منتخب ہو سکیں۔

موجودہ زمانے میں عمومیت کا میلان یہ ہے کہ صرف انتخاب کنندوں کی تعداد پر انتخاب کا انتظام رکھا جائے، چونکہ عمومیت مساوات پر زیادہ زور دیتی ہے اس لئے وہ بہت آسانی سے اپنی تنظیمات کے لئے حسابی قواعد مقرر کرلیتی ہے۔ وہ اہل ملک کا شمار کرلیتی اور برابر تعداد کو برابر حق دیدیتی ہے۔

لیکن یہ طریقہ بلاواسطہ عمومیت کے لئے زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہ تمام اہل ملک کو اختیارات کے استعمال کا یکساں حق دیتی ہے۔ نیابتی عمومیت کے لئے یہ اسقدر موزوں نہیں ہے کیونکہ اس میں اہل ملک کی قابلیت اور اہلیت کے اعتبار سے فرق کیا جاتا اور معاملات عامہ کا نظم و نسق صرف بہتر لوگوں کو سپرد ہوتا ہے۔ پس آخرالذکر صورت میں منتخب شدہ لوگوں کے اوصاف کا خیال کیا جاتا ہے اور اس حالت میں یہ بالکل خلاف قیاس

معلوم ہوتا ہے کہ اسکی انتخابی تقسیم صرف تعداد کی بنا پر ہو۔ علاوہ اسکے اس طریقے کے نقائص نیابتی سلطنت میں زیادہ نقصان رساں ہیں۔ بلا واسطہ عمومیت کی جمعیت عامہ محض مساوی الحقوق عوام کا مجمع نہیں ہوتی بلکہ اس پر حکام اعلیٰ مقررین اور معززین کا اثر پڑتا ہے اور اس لئے باغلب وجوہ کثرت رائے کا فیصلہ تمام باشندوں کے صحیح خیالات کا ترجمان ہوتا ہے مگر نیابتی عمومیت میں قوم اس طرح مجتمع نہیں ہوتی بلکہ مختلف حلقوں میں منقسم ہوتی ہے جن کا تعداد کے اعتبار سے مساوی ہونا تو ممکن ہے مگر اوصاف کے اعتبار سے مجموعی قوم سے انکا تناسب ایک دوسرے سے بہت مغایر ہوتا ہے اور اس لئے یہ حلقے قوم کے نہایت غیر مساوی ٹکڑے ہوتے ہیں۔

کیا یہ دعوے کرنا ممکن ہے کہ برٹنی کے زرعی اضلاع یا لیون کے صنعتی اضلاع پیرس کے انتخابی حلقوں سے تمامتر مشابہ ہیں، جہاں ہر شخص کو یہ نظر آسکتا ہے کہ حقیقی اتحاد کے بغیر قوم کے نہایت ہی متمول اور نہایت ہی تعلیم یافتہ ارکان، بیشمار مختلف درجوں کے معمولی شہری اور صناع اور ادنے درجے کے انبوہ (جنکا مثل فرانس میں کہیں اور نہیں مل سکتا) سب ایکدم ہی میں خلط ملط ہیں۔ انتخابی حلقوں کے اس فرق کا عقلی اقتضا یہ ہے کہ انکی رایوں کی مختلف قیمت مقرر ہونا چاہئے، صحیح نیابت اس طور پر حاصل ہوسکتی ہے کہ انتخابات کا انتظام یوں کیا جائے کہ قوم کے ہر ایک عنصر اور ہر ایک مقصد کی نیابت اس تعلق کے تناسب کے ساتھ ہو جو مجموعے کے ساتھ اُسے حاصل ہے۔ تعداد کی ایک قدر و قیمت ضرور ہے مگر وہ فی نفسہ کافی نہیں ہے۔ جائداد، تعلیم، پیشے اور طرز زندگی وغیرہ کے مانند دوسرے اوصاف پر بھی خیال کرنا ضروری ہے اور انسب یہ ہے کہ اُسے قوم کی محض فرضی زیر تقسیموں پر نافذ کرنیکے بجائے، قوم کے ذی حیات اجزا پر اُسکا نفاذ کیا جائے۔

عملی قاعدہ

پس نیابتی جمہوریت کے لئے دو بنیادی اصول قرار دیے جاسکتے ہیں:—

(۱) جب تمام اہل ملک مجموعتاً کارروائی کریں یا جب کل قوم کی رائے لیجائے تو اُس وقت صرف رایوں کی تعداد کا شمار کرلینا کافی ہے جیسا کہ بلا واسطہ عمومیت میں ہوتا ہے۔

(۲) برخلاف اسکے جب قوم کے مختلف اجزا کل قوم کے لئے نائب منتخب کرتے ہوں اُسوقت صرف رایوں کا شمار کرنا کافی نہیں ہے۔ اجزا کی ترتیب اُنکے اوصاف کے اعتبار سے

ہونا چاہئے تاکہ بہترین آدمیوں کے انتخاب کا تیقن ہوسکے اور قوم کے علمی، اخلاقی اور مادی (مالی) عناصر سب کو مناسب حصہ مل سکے۔

نیابتی عمومیت کے مضار و مفاد

نیابتی عمومیت کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ اقتدار اعلیٰ کا حق کثیر کو عطا کرتی ہے مگر اس اقتدار کا عملدرآمد ایک قلیل جماعت کو تفویض کرتی ہے۔ اس اطمینان کی غرض سے کہ یہ قلیل جماعت حصۂ کثیر کی مرضی کے موافق عمل کریگی حصۂ کثیر اُن لوگوں کے انتخاب کو اپنے اختیار میں رکھتا ہے جو اُسکے نام سے حکومت کرتے ہیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد نئے انتخابات ہوتے رہتے ہیں۔

یہ نظام سلطنت اسے تسلیم کرتا ہے کہ حصۂ کثیر جس حکومت خود اختیاری کا اپنے فطری حق کے طور پر دعوے کرتا ہے، اُسے واقعی عملی طور پر انجام دینے کی نہ اُسے قابلیت ہے نہ فرصت، مگر وہ حصۂ کثیر کو اس قابل سمجھتا ہے کہ اُسے سلطنت کے معاملات کی اتنی سمجھ اور اُن سے اتنی دلچسپی ہے کہ وہ انتخابات میں حصہ لے سکے اور اپنی نیابت کے لئے بہترین آدمیوں کو منتخب کر سکے۔

بلا واسطہ عمومیت کے مقابلے میں یہ نیابتی حکومت عام اہل ملک سے کمتر اظہار قابلیت کی خواہاں ہوتی ہے مگر نمایندوں سے نسبتاً زیادہ اظہار قابلیت چاہتی ہے۔ وہ آزاد و مساوی الدرجہ اہل ملک کی خود اعتمادی پر بھروسا کرتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی توقع رکھتی ہے کہ وہ اپنے بہترین آدمیوں کے انتخاب میں اعتدال سے کام لیں گے اور جب تک اُنکے نمایندوں کو حصۂ کثیر کا اعتماد حاصل رہے اُسوقت تک وہ بطیب خاطر اُنکی حکومت کے مطیع رہیں گے۔

اقتدار کی کم

متواتر انتخابات حکمرانوں کو محکوموں کی مرضی کے تابع بنا دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی درمیانی وقفے میں اُن محکوموں کو بھی اطاعت کرنا پڑتی ہے۔ رعایا کی آزادی حکومت کے اقتدار کی بہ نسبت زیادہ مستحکم بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ حکام اعلیٰ جمہوریت کے سرگروہ ہونیکے بجائے اُسکے خادم خیال کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ بقول گیزو حکومت صرف اوپر سے ہوسکتی ہے نیچے سے نہیں ہوسکتی مگر نیابتی عمومیت یہ کوشش کرتی ہے کہ جہانتک ہوسکے نیچے سے حکومت کرنیکی صورت قائم رہے۔ پس اس طرح حکومت محض ایک انتظام کے مشابہ ہو جاتی ہے اور سلطنت وسیع پیمانے پر ایک کمپنی یا ایک بڑی اقتصادی

تنظیم بن جاتی ہے۔

واضع قوانین جماعتوں میں اقتدار کی کمزوری بہت ہی کم ظاہر ہوتی ہے بلکہ وہاں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ نائبین اپنے کو قوم کے مرادف سمجھکر اقتدار علی الاطلاق کے مغالطے میں پڑ جائیں گے، برخلاف اسکے، حکومت کو اپنے اختیار کے حقیقتاً مضبوط اور زور دار کرنیکے لئے بڑی مشکلیں پیش آتی ہیں۔ انتخابات کے کثرت سے ہونے سے حکومت کی حالت غیر مطمئن ہو جاتی ہے اور اُسے قوم کی تغیر پذیر رائے کے تابع بنا دیتی ہے۔ جب تک حصۂ کثیر اُسکی تائید کرتا رہتا ہے اُسی وقت تک اُسے تقویت رہتی ہے اور وہ وسیع اور دور رس تجاویز کو اُسی وقت عمل میں لاسکتی ہے جب یہ تجاویز قوم کے مزاج اور روایات کے موافق ہوں اور اس طرح انکی بقا کی طرف سے اطمینان ہو جائے۔

شان و شوکت اور اجتماعی قوت کی کمی

حکومت کے ارکان میں نمایش نہیں ہوتی۔ انکی حیثیت معمولی افراد قوم کی سی ہوتی ہے۔ شاہی اور اعیانی حکومتیں جس قسم کی شان و شوکت میں گھری ہوتی ہیں اُن کا یہاں کہیں نام و نشان نہیں ہوتا۔ فطری حالت اس قدر مد نظر ہوتی ہے کہ درباری سفارتوں کے مصنوعی طمطراق کی گنجایش یہاں نہیں ہوتی عمومیت اسے زیادہ پسند کرتی ہے کہ اُس کی نمایندگی محض وکیل یا قنصل کے ذریعے سے ہو۔ بہت بڑی مستقل فوج اس کی طمانیت اور آزادی کے لئے ایک مستقل خطرہ ہوگی اور اُسے بڑے پیمانے پر محافظ قوم اور محافظ ملک فوج قائم رکھنا پڑتی ہے۔ ہر جزو کی خود مختارانہ کارروائی اور آزادانہ عمل کے مقابلے میں تمام طاقتوں کی اجتماعی حالت کو کم نشو و نما حاصل ہوتا ہے۔

عام تنظیمات کی خوبی

خدمت عامہ کے انتظامات بالعموم اچھے اور بعض اوقات نہایت ہی افضل ہوتے ہیں۔ عمومیت میں ہر شخص اس امر کا متوقع ہوتا ہے کہ وہاں مفید عام اور کار خیر کے بیشمار انتظامات ہوں گے۔ عمدہ سڑکیں ہوں گی، آمد و رفت اور رسل و رسایل کے ذرائع اچھے ہوں گے، بکثرت قومی مدرسے ہوں گے، دلچسپ تہوار اور دعوتیں وغیرہ ہوتی ہوں گی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ دفتر دار حکام اور انکی صبر آزما کارروائیوں سے نجات ہوگی۔

ترقی علوم کی طرف سے غفلت

دوسری طرف نظام سلطنت میں علوم و فنون کے اعلےٰ و افضل مقاصد کی طرف سلطنت کو متوجہ کرنے میں دوسرے نظامہائے سلطنت کی بہ نسبت زیادہ دشواری پیش آتی ہے۔ جس قوم میں عمومیت کا رواج ہو وہ جب ایسی صورتوں کو پورا کرنا چاہے جنکے مفاد قومی کی

قدر و منزلت کا اندازہ کرنا عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہو تو اُس قوم کیلئے ضروری ہے کہ وہ تہذیب و تمدن کے بہت اعلےٰ درجے پر پہنچ گئی ہو۔

عوام کے اخلاق کا بلند ہونا

اس نظامِ سلطنت سے آزادی کے جس مردانہ احساس کا اظہار ہوتا ہے اور جس پر اسکی بنیاد قائم ہوتی ہے وہ احساس متوسط طبقے کے لوگوں کے خیالات کو بلند کر دیتا ہے، اور یہی متوسط طبقہ سلطنت کا خاص پشت پناہ ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے معاملاتِ عامہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق کے باعث تمام اہلِ ملک کی ذہنی قابلیت کو نشو و نما حاصل ہوتی ہے اور اُنکے اخلاق میں مضبوطی آجاتی ہے، جب وطن سے کام لینے کے لئے پوری وسعت اور آزادی حاصل ہوتی ہے اور نازک موقعوں پر اہلِ ملک وطن کے لئے بہت بڑی بڑی قربانیاں کرنیکے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس نظامِ سلطنت میں اعیانی خیالات کی ترقی کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں اور قوم اس قسم کے خیالات کو بدگمانی اور مخالفت کی نظر سے دیکھتی ہے، لیکن اس خیال کے لوگ اگر اپنے پر نخوت دعووں سے مساوات کے احساس کو صدمہ نہ پہنچائیں اور بہبودِ عامہ کے لئے وہی جوش و انہماک ظاہر کریں جو بہترین عمومیت پسندوں سے ظاہر ہوتے ہیں تو اس خیال کے لوگوں کی بھی وقعت ہو سکتی ہے۔

---

**تعلیق۔** روبرٹ فون مول نے (انسائکلوپیڈیا صفحہ ۶ ۴۴ میں) مذکورۂ بالا دعوی کی مخالفت کی ہے کہ نیابتی عمومیت میں تعداد کے اصول کو قطعی فیصلہ کن نہ قرار دینا چاہئے وہ کہتا ہے کہ "یہ کہنا کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو کہ انتخاب میں حصہ لینے کو افراد کا شخصی حق نہ سمجھنا چاہئے بلکہ اُسے ایک مفوضہ فرض یا عہدہ تصور کرنا چاہئے تاہم اس امر پر اسکا کوئی اثر نہیں پڑتا کہ قوم ہی اپنے اقتدارِ اعلیٰ کو نیابت کے ذریعے سے عمل میں لاتی ہے۔ قوم کے اقتدارِ اعلیٰ کی بنیاد اس پر ہے کہ ہر شخص کو حکمرانی میں حصہ لینے کا خلقی حق حاصل ہے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ حکومت کے موجودہ نظریے میں یہی خیال پیشِ نظر ہے خاصکر روسو نے اپنے نظریے کی بنا اسی پر رکھی ہے مگر نتیجہ یہ ہے کہ یہ خیال شخصی اور جمہوری حقوق کی پیچیدگیوں میں اُلجھکر رہ گیا، اس سے صاف ہو کر کبھی نہیں نکلا۔ اس نظریے میں جسے معاشرتی سلطنت کہتے ہیں اسکی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ موروثی سلطنت کو الٹ دیا ہے جس شخص نے قوم کی وحدت اور اہلِ ملک کی مجموعی ہیئت کا فرق سمجھ لیا ہے، اس پر یہ غلطی صاف عیاں ہے۔ انتخاب کنندہ رائے دہی کا حق فطرت سے نہیں بلکہ سلطنت سے حاصل کرتا ہے۔ انتخاب کا کوئی سا طریقہ ہو وہ بہبودِ عام کیلئے سلطنت کا ایک انتظام ہے۔ (اس باب کے مباحث کیلئے مل کی کتاب "نیابتی حکومت" Representative Government دیکھنا چاہئے۔)

انگریزی مترجم

# چوبیسواں باب

## سلطنت کی مرکب صورتیں

مرکب سلطنتوں کی مختلف صورتیں

اس وقت تک ہم صرف مفرد سلطنت کے متعلق بحث کرتے رہے ہیں لیکن بعض سلطنتیں مرکب بھی ہوتی ہیں جس سلطنت کے اجزا بجائے خود سلطنت ہوں یا اُن اجزا کی تنظیم و ترتیب سلطنتوں کے شکل ہو اُسے مرکب سلطنت کہتے ہیں۔ اِن مخلوط سلطنتوں کے تمام داخلی اجزا ایک نہ ایک مفرد سلطنت کی ہیئت رکھتے ہیں اور محض اس لحاظ سے مخلوط سلطنتوں میں کوئی خاص بات بیان کے قابل نہیں ہے۔ مثلاً ممکن ہے کہ اجتماعی سلطنت اور اس کے منفرد اجزا کی یا سلطنت اعلےٰ اور اسکے توابع کی تنظیم شاہی طریق پر یا نیابتی عمومیت کے اصول کے مطابق ہو۔

لیکن ہمیشہ یہ نہیں ہوتا کہ اجتماعی سلطنت اور اسکی منفرد سلطنتوں کے نظام سلطنت ایک ہی سے ہوں۔ ۱۸۱۵ء کی جرمانی مشترکیت با اقتدار حکمرانوں کی ایک عدیدیت تھی اور عوام کو اُس میں نیابت کا کوئی حق نہیں تھا درآنحالیکہ اسکی منفرد سلطنتوں میں رفتہ رفتہ آئینی بادشاہی رواج پاتی جارہی تھی۔ انگلستان میں آئینی بادشاہت ہے مگر اُس کے ایشیائی مقبوضات میں خودمختارانہ حکومت ہوتی ہے اور اسکی بعض بعض نوآبادیوں میں برطانوی سیادت وصیانت کے زیر اثر نیم آزاد جمہوریت قائم ہے۔

جہاں قومیت، تمدن اور تاریخی حالات میں بہت زیادہ فرق ہو، وہاں نظام سلطنت کا اختلاف فطرت کے موافق اور نظر بحالات جایز ہے لیکن جہاں حالات یکساں ہوں (جیسا کہ جرمانیا کی مشترکیت میں ہے) وہاں اس قسم کا فرق فطرت اور ہم آہنگی دونوں کے خلاف ہے۔

تمام مرکب سلطنتوں میں ہمیں ایک نئے فرق مراتب سے سابقہ پڑتا ہے یعنی مجتمعہ یا اعلےٰ سلطنت کے اقتدار اور جداگانہ سلطنتوں یا توابع کا تعلق فیمابین کیا ہو۔

(۱) قبضۂ دیگر سلطنتوں پر ایک سلطنت کی مطلق العنان حکمرانی

اس فرق مراتب کو پیش نظر رکھ کر حسب ذیل تقسیمیں قرار دیجا سکتی ہیں:۔

۱۔ اعلےٰ سلطنت اپنے ماتحت توابع پر خود مختارانہ حکومت کرتی ہو۔ اس صنف میں یورپی طاقتوں کے متعدد، خاصکر ایشیائی اور افریقی مقبوضات داخل ہیں صرف اعلیٰ سلطنت میں آزادانہ نظام عمل ہوتا ہے، توابع غیر آزاد اور غیر ملکی حکومت کے ماتحت ہیں۔ اعلیٰ سلطنت اور ماتحت سلطنتوں کے درمیان تخالف بہت ہی نمایاں ہوتا ہے اور تصادم سے بچنے کیلئے حکمراں سلطنت کو اپنی پوری قوت صرف کردینا پڑتی ہے۔

بقیہ دیگر سلطنتوں کی سیادت یا صیانت

۲۔ ماتحت سلطنتوں پر ایک اعلےٰ طاقت کی سیادت قائم ہو، یا ایک زبردست سلطنت اپنے سے کمزور سلطنتوں کی صیانت کرتی ہو۔ اس صورت میں ماتحت یا محروسہ سلطنتوں کے لئے ایک حد تک آزادی ممکن ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں مقدس رومی شہنشاہی اور اس زمانے میں ترکی شہنشاہی اس امر کی مثالیں ہیں کہ ماتحت سلطنتوں سے ملکر ایک مجموعی سلطنت بن گئی۔ موجودہ زمانے میں سیادت کے مقابلے میں حمیت کو ترجیح دیجاتی ہے اور حقیقت میں جب تک دونوں سلطنتوں کی طاقت میں بہت بڑا فرق نہ ہو اسوقت تک سیادت محض بے معنی ہے، اور ایک آزاد قوم کبھی اُسے پسند نہیں کرسکتی۔ نپولین نے رائن کی سلطنتہائے متفقہ پر یا انگریزوں نے جزایر یونان پر[الف] یا یورپی طاقتوں نے مولڈیویہ اور ولاخیا پر[ب] جس قسم کی سیادتیں قائم کیں وہ اسکی مثالیں ہیں۔

۳۔ نوآبادیوں اور ملک آبائی کی نسبت

۳۔ ملک آبائی اور اسکی وہ نوآبادیاں جو ابھی تک آزاد نہیں ہوئی ہیں مگر اُنھوں نے کم وبیش ایک مکمل سلطنت کی حیثیت پیدا کرلی ہے ان میں اسی قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔ البتہ فرزندانہ اطاعت سے اُس میں گونہ ترمیم ہوجاتی ہے اور وہ زیادہ اعلےٰ وارفع نظر آتے ہیں۔ نوآبادی کے اندرونی انتظام میں جب معقول حد تک آزادی حاصل ہوجاتی ہے،

(الف)۔ (ڈینمارک کے شہزادے جارج کو یونان کے تخت پر بہ لقب جارج اول متمکن کرنیکے بعد انگریزوں نے ازخود اس حمیت کو ترک کردیا۔ انگریزی مترجم)

(ب)۔ (یہ حمیت ۱۸۵۶ء کے معاہدۂ پیرس کی رو سے قائم ہوئی تھی۔ ۱۸۵۸ء میں چھ طاقتوں نے بابعالی سے ان دونوں صوبوں کی حکومت کے انتظام کیلئے ایک قرارداد کی۔ دوسرے سال یہ دونوں صوبے ایک ہی شہزادے کو اپنا والی منتخب کرکے متحد ہوگئے اور اُسوقت سے سلطنت رومانیا کے نام سے مشہور ہیں۔ انگریزی مترجم)

اُسوقت بھی اُسے اپنے بیرونی تعلقات کے معاملے میں ملک آبائی کی صیانت کی ضرورت باقی رہتی ہے اور اس لئے نوآبادی اپنے ملک آبائی کے تفوق کے تسلیم کرنے پر رضامند رہتی ہے۔ اسکی پہلی مثال کناڈا اور انگلستان کے تعلقات سے ظاہر ہوئی۔

۴۔ مشترکیت یا ذاتی اتحاد میں متعلقہ سلطنتوں کو بالعموم اپنی پوری وقعت اور آزادی حاصل رہتی ہے، گوکہ مخصوص حالات میں عام اغراض کی ضرورت سے قیود بھی عاید ہوسکتے ہیں۔ ہر ایک سلطنت کا انتظام بجائے خود مکمل ہوتا ہے مگر مجموعی سلطنت کو ترقی نہیں ہوتی اور خاص حالات اور زیادہ بیرونی تعلقات کے علاوہ اسکی کوئی شخصیت نہیں ہوتی چونکہ سلطنت کے اجزائے ضروریہ یعنی قانون سازی، حکومت اور اختیار عدالتی اُس میں نہیں ہوتے، اس لئے واقعی سلطنت ہونیکے بجائے وہ سلطنت کا ایک ہیولیٰ ہوتا ہے۔ اسکی حالت ایک دائمی بین الاقوام محالفے اور ایک باقاعدہ سلطنت کے بین بین ہوتی ہے اور اسلئے ناکمل اور تغیر پذیر رہتی ہے۔

۴۔ مشترکیت یا اتحاد ذاتی۔

سلطنت کی اس صورت میں کل آبادی ایک نسل کی ہوسکتی ہے مگر ان میں حقیقی متحدہ قومیت نہیں ہوتی اور متفقہ معاشرت وطاقت کی ترقی بڑی مشکل سے ہوتی ہے۔ جس اتحاد ذاتی میں کم از کم ایک بادشاہ سب کا سرتاج ہوتا ہے اُس میں یہ نقص اُس مشترکیت کی بہ نسبت کم نظر آتا ہے جس میں کوئی متحدہ کارکن مطلقاً نہیں ہوتا مگر یہ دونوں صورتیں عملی ضروریات کیلئے بالکل ناموزوں ہیں۔ موجودہ زمانے میں ۱۸۱۵ء کی جرمانی مشترکیت اس کی بہترین مثال اور اسکے نقائص کی واضح ترین شہادت ہے۔

۵۔ متفقیت، شہنشاہی متفقہ یا اتحاد حقیقی ان سب کی قدر مشترک یہ ہے کہ متفقہ اور منفردہ دونوں سلطنتوں کا انتظام بجائے خود مکمل ہوتا ہے۔ متفقیت میں منفردہ سلطنتوں کو نسبتاً زیادہ آزادی حاصل ہوتی ہے کیونکہ ہر ایک کی حکومت کلیتاً اُسی سے متعلق ہوتی ہے۔ برخلاف اسکے اتحاد حقیقی میں متفقہ سلطنت کا سرگروہ اپنی خاص مملکت کا حکمران بھی ہوتا ہے اور اس لئے اقتدار اعلیٰ نسبتاً کم حاصل ہوتا ہے۔ (ج)

۵۔ متفقیت شہنشاہی متفقہ اور اتحاد حقیقی۔

متفقیت اور متفقہ شہنشاہی میں ایک منتظم قوم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی

(ج)۔ (معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر بلنچلی خلط مبحث میں پڑگیا۔ اس نے مجموعی سلطنت کے سرگروہ کی آزادی کو خود مجموعی سلطنت کی آزادی سے خلط ملط کر دیا ہے۔ انگریزی مترجم)

اُسکی ہر منفرد سلطنت کی قوم الگ منتظم ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم اہل امریکہ کا نام لیتے ہیں اور اہل پنسلوینیا اور اہل ورجینیا بھی کہتے ہیں۔ سوئس قوم کا لفظ بھی بولتے ہیں اور اہل برن اور اہل جنیوا بھی کہتے ہیں۔ لفظ جرمانی کا بھی استعمال کرتے ہیں اور اُس کے ساتھ پروشی، سکسونی اور بویریمی کے الفاظ بھی بولتے ہیں۔ لیکن جداگانہ سلطنتیں کسی نوع سے توابع نہیں ہیں۔ اپنے حدود کے اندر وہ ایک منفرد سلطنت کے مانند آزاد ہیں[۱]۔

مخلوط سلطنت کے شرائط لازمی۔

ان دونوں قسم کی سلطنتوں کا ایک ہی خطے پر ایک ساتھ قائم رہنا صرف اس طرح ممکن ہے کہ (۱) ہر ایک کے اختیارات کا فرق قطعی طور پر معین کر دیا جائے اور اختلافات کو صلح و آشتی کے ساتھ طے کر لینے کے قواعد مقرر ہو جائیں اور (۲) حکمران اور بنائے جماعتیں جہانتک ممکن ہو ایک دوسرے سے آزاد اور علٰحدہ رکھی جائیں، شخصی فرائض کی علٰحدگی سلطنتہائے متحدہ امریکہ میں سب سے زیادہ مکمل ہے۔ اختیارات کا امتیاز سوئٹزرلینڈ کے نظام سلطنت میں بہت وضوح کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے[۲]۔ جرمانیا کی شہنشاہی میں

---

[۱] گ۔ وائتس نے لکھا ہے کہ "مشترکیت اور سلطنتہائے منفردہ دونوں کی قوت کو اپنی حد کے اندر خود مختار ہونا چاہئے۔ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے کی جانب سے اختیار تفویض نہیں ہونا چاہئے"۔ "سیاسیات کی اصولی خصوصیات" صفحہ ۴۴)۔ (بلنچلی کی کتاب کی چھٹی اشاعت کا مدیر کہتا ہے: "۱۸۷۱ء سے ابتک متفقیت کی عام حالت اور خاصکر جرمانی شہنشاہی کے قانونی نظام کے متعلق متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں مگر ابھی تک اس مشکل مسئلے کا کوئی تشفی بخش حل نہیں ہوا ہے۔

اصل کتاب میں جو خیال ظاہر کیا گیا ہے اُسے اولاً توک ول نے پیدا کیا اور وائتس نے اُسے مدوّن کیا۔ مگر یہ خیال اس اقتدار اعلٰے کی اصلیت کے منافی ہے جو سلطنت میں سب سے بڑی طاقت ہوتا ہے اور اس لئے اپنے حدود اور اپنے اغراض دونوں کے اعتبار سے وہ ناقابل تقسیم ہے۔

[۲] اس بحث پر کہ سوئسی متفقیت کو قوانین متفقیت کے نافذ کرنیکے کیا ذرائع حاصل ہیں دیکھو ریوٹی من کی کتاب: "شمالی امریکی قانون متفقیت کا مقابلہ سوئسی تنظیمات سیاسی کے ساتھ" دو حصے۔ مطبوعۂ زیورچ۔

اگرچہ شاہ پروشیا بہ حیثیت شہنشاہ کے تمام متفقیت کا واحد سرگروہ سمجھا جاتا ہے اور منفرد سلطنتوں کے ایوانوں سے ڈائٹ پوری طرح پر ممیز اور علحدہ ہے تاہم متفقہ حکومت اور منفردہ سلطنتوں کے کارکنوں میں بہت قریبی تعلقات ہوتے ہیں۔ متفقیت اور اسکے ارکان کے جداگانہ اختیارات مطلقاً واضح نہیں کئے گئے ہیں بلکہ درحقیقت قصداً غیر معین چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ لیکن ان قواعد کی وجہ سے کہ شہنشاہی قانون ہمیشہ صوبجاتی قانون پر فائق ہوتا ہے اور ہر ایک شہنشاہی قانون کے لئے مجلس متفقہ کی منظوری ضروری ہے۔ متفقہ سلطنتوں کی حفاظت اور خود مختاری کا کافی سامان کردیا گیا ہے اور انھیں قواعد سے اولاً تو اختلافات کی روک ہوجاتی ہے اور اگر احیاناً اختلافات پیدا بھی ہوں تو بہت جلد طے ہوجاتے ہیں۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مجتمعہ سلطنت معمولاً غیر ملکی معاملات سے تعلق رکھتی ہے اور مستثنیٰ طور پر ایسے اندرونی معاملات میں دخل دیتی ہے جنکی اہمیت عام ہوتی ہے معہذا منفرد سلطنتوں کی خودمختاری سے اندرونی نظم ونسق کا کام لیا جاتا ہے اور شاذ ونادر ہی بیرونی معاملات میں اُن کا دخل ہوتا ہے۔

---

# ساتواں مقالہ

## اقتدار اعلیٰ اور اُسکے کارکن اعضا

## سلطنت کے عمال اور عہدے

# پہلا باب

## اقتدار اعلیٰ کا تصور

اقتدار اعلیٰ کی اصطلاح

سلطنت، طاقتِ قومی کا مجسمہ اور اُسکی شخصیت ہے۔ اسی طاقت کو اسکی اعلیٰ ترین منزلت اور وسیع ترین قوت کی حالت میں "اقتدار اعلیٰ" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

اقتدار اعلیٰ کی اصطلاح پہلے پہل فرانس میں پیدا ہوئی اور فرانسیسی ہی علوم میں ابتداءً اِسے نشوونما حاصل ہوئی۔ بودین نے اُسے قانونِ عامہ کا بنیادی تصور بنادیا۔ اُسوقت سے اس لفظ اور اس خیال نے جدید نظامہائے سلطنت کے نشوونما اور زمانۂ جدید کی تمام سیاسیات پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ میں اقتدار شاہانہ یا اقتدار اعلیٰ کا لفظ اور بھی زیادہ وسیع معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ ہر ذی اختیار جسکا فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا تھا اور جسکا مرافعہ کسی بالادست کے روبرو نہیں ہوسکتا تھا اسے "صاحب اقتدار اعلیٰ" کہتے تھے۔ اعلیٰ ترین عدالتوں کو عدالتِ ذی اقتدار کہتے تھے پس اس طرح سلطنت کے اندر بہت سے ذی اقتدار عہدے اور جماعتیں ہوا کرتی تھیں لیکن بتدریج یہ لفظ خالص انتظامی شاخوں کیلئے متروک ہوتا گیا اور سلطنت کی سب سے اعلیٰ حکمران طاقت کے لئے محدود ہوگیا اور اس لفظ کے تصور کا اطلاق صرف سلطنت کی مجموعی طاقت پر ہونے لگا۔

فرانس میں اقتدار کا تصور، اقتدار بحیثیت [illegible]

سولھویں صدی کے بعد سے فرانسیسی سیاسیات کے مرکزی میلانات اور فرانسیسی بادشاہوں کے

اختیار مطلق حاصل کرنیکی کوششیں اس خیال پر کلیۃً حاوی ہو گئیں تھیں۔ بودین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اقتدار اعلیٰ سلطنت کی دائمی اور علی الاطلاق طاقت کا نام ہے اور اس لفظ کا یہی مفہوم رائج ہو گیا۔ لوئی چہاردہم اور ۱۷۹۳ء کی مجلس ملکی کے انقلابی، دونوں یکساں طور پر خود کو مقتدر علی الاطلاق سمجھتے تھے[1] مگر دونوں غلطی میں مبتلا تھے۔ جدید دنیا کی حکومت میں اختیار مطلق کا کہیں پتہ بھی نہیں ہے، اور نہ دنیا میں آزادی مطلق کا کہیں وجود ہے۔ اس لامحدود اقتدار اعلیٰ سے نہ تو سیاسی آزادی کو موافقت ہو سکی اور نہ سلطنت کے دوسرے اجزا و عناصر کا حق اس سے مطابقت رکھ سکتا ہے اور جہاں کہیں لوگوں نے اسکے عمل میں لانیکی کوشش کی ہے، تاریخ نے اُنکے ادعا کا بطلان ثابت کر دیا ہے۔ خود مجموعی سلطنت تک کو اقتدار مطلق نہیں حاصل ہے کیونکہ خارجی طور پر وہ دوسری سلطنتوں کے حقوق سے محدود ہے اور داخلی طور پر خود اپنی نوعیت اور اپنے منفرد ارکان کے حقوق کی پابند ہے[2]۔

اقتدار اعلیٰ کیلئے جرمانی زبان کی اصطلاحات

جرمانی زبان میں اس خیال کے کامل طور پر ظاہر کرنیکے لئے کوئی مناسب لفظ نہیں ہے لفظ "اوبرگیوالت" Obergewalt یعنی طاقت اعلیٰ یا سوئٹزرلینڈ والوں کا قدیم فقرہ جسکے معنی ہیں: "برترین اور وسیع ترین اقتدار" اس سے صرف اندرونی اقتدار کا خیال پیدا ہوتا ہے، بیرونی آزادی کا تصور نہیں قائم ہوتا۔ لفظ "اسٹاٹس ہوہائت" Staatsheheit سے سلطنت کے اختیار کے بجائے زیادہ تر اُس کی عظمت و جلال کا اظہار ہوتا ہے اور "اسٹاٹس گیوالت" Staatsgewalt میں عظمت سے زیادہ طاقت کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ اسلئے اہل جرمانیا

---

[1] تیرس اپنی "تاریخ انقلاب فرانس" میں لکھتا ہے کہ انقلابیوں کی رائے میں قوم اپنے اس اختیار کو کبھی اپنے سے جدا نہیں کر سکتی کہ وہ اپنے حسب خواہش جسوقت جو چاہے کرے اور جو چاہے حکم دے۔ یہی اقتدار اُنکے اقتدار مطلق کی بنا ہے اور یہ اقتدار اُس سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ پس قوم یہ نہیں کر سکتی کہ وہ خود کو لوئی چہاردہم کی فرمانبرداری کا پابند کر دے" سیئے نے اس نظریئے کی غلطی کو تسلیم کیا ہے۔

[2] ہنوور کے اعلان مشتہرہ ۱۸۱۴ء میں مرقوم ہے کہ "اقتدار شاہانہ کے حقوق میں مطلق العنانی کا کوئی خیال شامل نہیں ہے۔ برطانیۂ عظمیٰ کا بادشاہ اپنے اقتدار شاہانہ کے اعتبار سے یورپ کے کسی حکمراں سے کم نہیں ہے اور اسکی رعایا کی آزادی اُسکے تخت کے الٹ دینے کے بجائے اسکے استحکام کا باعث ہے۔

اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات

مجبور ہیں کہ اقتدار اعلیٰ کے مفہوم کے ادا کرنیکے لئے دونوں لفظ استعمال کریں یعنی Statshoheitumd Statagewalt لیکن اسکے ساتھ ہی ان جرمانی الفاظ میں ایک خاص فائدہ یہی ہے کہ فرانسیسی اصطلاح کی بہ نسبت اُن سے مغالطہ ہونیکا اندیشہ کم ہے۔ ان میں اختیار مطلق کے مفہوم کے پیدا ہونیکا احتمال نہیں رہتا۔

اقتدار اعلیٰ کے مفہوم میں امور ذیل داخل ہیں:۔

۱۔ اقتدار سلطنت کا کسی دوسری سلطنت کی ماتحتی سے آزاد ہونا۔ تاہم اس آزادی کو بھی مطلق آزادی نہیں بلکہ ایک نسبتی آزادی سمجھنا چاہئے۔ قانون اقوام جو تمام سلطنتوں کو ایک باہمی تنظیم قانونی میں منضبط کرتا ہے وہ سلطنتوں کے اقتدار اعلیٰ کے لئے اُس آئینی قانون سے زیادہ منافی نہیں ہے جو سلطنت کے حدود کے اندر اُن کے اختیار عامہ کے عملدرآمد کو محدود کرتا ہے۔ ایک مرکب سلطنت کے اندر منفرد سلطنتیں بھی اقتدار شاہانہ رکھ سکتی ہیں۔ گو کہ غیر ملکی حکمت عملی اور فوج کی نگرانی وغیرہ کے سے اہم معاملات میں وہ سلطنت اعلیٰ کے تابع ہوتی ہیں۔

۲۔ اعلیٰ منزلت عامہ جسے اہل روما Majestas (جلالت) کہتے تھے۔

۳۔ اختیارات عامہ کا مخصوص نہ ہونا بلکہ مکمل اور وافر ہونا۔ اقتدار اعلیٰ چند منفرد اور مخصوص حقوق کے مجموعے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک عام اور وسیع حق ہے۔ یہ مرکزی تصور کی حیثیت رکھتا ہے اور قانون عامہ میں اسکی اہمیت ویسی ہی ہے جیسے قانون ذاتی میں ملک کی اہمیت ہے۔

۴۔ علاوہ اسکے یہ اقتدار اعلیٰ سلطنت میں سب سے بلند شئے ہے۔ پس کوئی سیاسی طاقت اس سے بالاتر نہیں ہو سکتی۔ ازمنۂ وسطیٰ کے فرانسیسی امرا جب اہم معاملات میں بہ حیثیت آقائے اعلیٰ کے بادشاہ کی اطاعت پر مجبور ہوئے تو پھر وہ خود با اقتدار نہیں رہے۔ جرمانیا کے الیکٹر (حکمرانان ولایات) چودھویں صدی سے اپنی اپنی مملکت کے اندر اپنے اقتدار اعلیٰ کو قائم کئے ہوئے تھے (الف) کیونکہ وہ اختیار اعلیٰ کو

(الف) جرمانیا کے دوسرے حکمرانوں کے مقابلے میں الیکٹروں (حکمرانان انتخاب کنندہ) کے اقتدار اعلیٰ کی بنا اُس زریں فرمان پر ہے جو ۱۳۵۶ء میں چارلس چہارم نے شائع کیا تھا۔ انگریزی مترجم)

اپنے حق خاص کے طور پر اُن مملکتوں میں کام میں لاتے رہے تھے۔

۵۔ چونکہ سلطنت ایک عضوی جسم ہے اس لئے اُسکی خوشحالی کے لئے وحدتِ اقتدار کا ہونا ایک لازمی شرط ہے[۱] اقتدار اعلےٰ کے منقسم ہو جانے سے سلطنت معطل اور زوال پذیر ہو جاتی ہے اور اس لئے سلطنت کے تومند رہنے کیلئے وحدت عمل لابدی ہے۔

---

[۱] ایمانوئیل ہیرمن فشتے کا یہ کہنا کہ سلطنت کا "وحدت عمل" ہی اقتدار اعلیٰ ہے۔ حد سے بڑھ جانا ہے۔ کامل اختیار و جلالت اقتدار اعلیٰ کے اصل الاصل ہیں۔

## تعلیقات

(۱) روسو، جسکے نظریات کو فرانسیسی انقلاب نے واقعہ کی صورت میں بدل دیا تھا۔ وہ اقتدار اعلیٰ کو "مرضی عامہ" پر مبنی کرتا ہے۔ اور اس طرح اس نے یہ غلطی کی ہے کہ "مرضی اعلیٰ" کو "اقتدار اعلیٰ" کے بجائے رکھ دیا اسکے بعد وہ یہ دلیل لایا ہے کہ چونکہ اختیار منتقل ہوسکتا ہے مگر مرضی منتقل نہیں ہوسکتی (معاہدہ معاشری ۲، ۱) اس لئے اقتدار اعلیٰ ناقابل انفکاک ہے۔ وہ قانون کو یہ سمجھا ہے کہ قانون بنفسہٖ مرضی کی پیداوار ہے، اسکی تحدید نہیں ہے۔ "مرضی" میں وہ "چاہیئے" کو بھول جاتا ہے، اور ابتدائی غلطی متعدد دوسری غلطیوں کا منبع ہے۔ مرضی انسانی جذبہ کا ظہور و بیان ہے مگر اقتدار اعلیٰ کسی طرح کی سلطنت کا قانونی ادارہ نہیں ہے۔ مرضی قانون کے عمل میں آنے کی محرک اور اس کے تغیرات کی موجب ہوسکتی ہے، مگر موزنی نفسہٖ قانون نہیں ہے۔ فرمانروا کی مرضی کے لئے اقتدار اعلیٰ شرط مقدم ہے مگر اُسکا عکس نہیں ہے۔

(۲) یہ امر طریق استدلال کے خلاف ہے کہ اقتدار اعلیٰ، سلطنت و قانون کا منبع سمجھا جائے اور صاحب اقتدار، سلطنت سے بالاتر قرار دیا جائے۔ سلطنت کا اقتدار اور جاہ و جلال سلطنتوں کے وجود کو پہلے ہی تسلیم کر لیتا ہے۔ پس اقتدار اعلیٰ قانون عامہ کے اندر داخل ہے۔ اُس سے بالاتر نہیں ہے۔

(۳) کونسٹانس فرانٹس کا دعوےٰ یہ ہے کہ اختیار کے بعد سلطنت کا "حسِ ارادی" اقتدار اعلیٰ کی خاص صفت ہے۔ مگر حس اگرچہ حق کے عمل میں لانے اور قانون کے نافذ کرنیکے لئے ضروری ہے مگر خود حق یا قانون کی لازمی شرط نہیں ہے۔

# دوسرا باب

## قوم یا سلطنت کا اقتدار اعلیٰ اور حکمران کا اقتدار اعلیٰ

اقتدار اعلیٰ کا تعلق کس سے ہے؟ سیاسی جماعتیں اس سوال کے جواب میں مختلف الرائے ہیں بلکہ جو شخص علمی حیثیت سے اسکا مطالعہ کر رہا ہو اُسے بھی بہت سی مشکلات اور تعصبات پر غالب آنا پڑتا ہے۔

ایک رائے یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ قوم کو حاصل ہوتا ہے۔ روسو کے زمانے اور انقلاب فرانس کے وقت سے اس رائے کی اشاعت بہت وسعت سے ہوئی ہے۔ یہ رائے اگر صحیح ہے تو سوال یہ ہے کہ قوم کیا ہے؟ بعضوں کے نزدیک، قوم، افراد کے اُس مجموعے کا نام ہے جو سلطنت کے اندر متحد ہو گئے ہوں یعنی سلطنت کو ریزہ ریزہ کر کے "اعلیٰ اقتدار" اس بے نظم و ترتیب مجموعے کو یا ان افراد کے حصۂ کثیر کو عطا کر دیا گیا ہے۔ یہ انتہائی بچگی رائے خود سلطنت کے وجود کے منافی ہے۔ حالانکہ سلطنت ہی اقتدار اعلیٰ کی بنیاد ہے۔ یہ رائے کسی نظام سلطنت سے مطابقت نہیں پیدا کر سکتی کیونکہ وہاں بھی سلطنت کے اختیارات کا عملدرآمد ایک باترتیب قومی مجلس کے ہاتھ میں ہوتا ہے، بے ترتیب مجمعوں کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔

بعض دوسرے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ سب اہل ملک برابر حیثیت سے ایک یا زاید مجلسوں میں مجموعی طور پر رائے دیں، یعنی یہ لوگ حکومت عوام میں عوام کے اقتدار اعلیٰ کو زیر نظر رکھیں۔ قوم کے اقتدار اعلیٰ کے اصول سے اگر یہی مفہوم ہو اور حکومت اسی صورت تک محدود رہے تو اُسکے بھی ایک معنی ہو سکتے ہیں اور اُسے ہم صحیح سمجھ سکتے ہیں مگر نہایت ہی عمومیت میں اس اصول کا پوری طرح استعمال نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس طرز حکومت میں بالعموم اقتدار اعلیٰ کا استعمال اہل ملک براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ اپنے نائبوں کے ذریعے سے کرتے ہیں۔ اسکے سوا اور کسی قسم کی حکومت سے یہ اصول مطابقت نہیں پیدا کر سکتا کیونکہ اس میں یہ لازم آتا ہے کہ سلطنت کا سرتاج کمترین باشندۂ ملک کے برابر ہو

اور حکمران چونکہ تعداد میں قلیل ہوتے ہیں لہٰذا اسلئے وہ اپنی رعایا کے حصۂ کثیر کے تابع ہوجائینگے۔ پس اسکے معنی یہ ہیں کہ جسم سلطنت میں پانوؤں کو وہ مرتبہ ملے جو سر کا ہے اور سر پاؤوں کی جگہ لے لے۔

۳- بایں ہمہ یہ رائیں اصلاح پیش کرنیکی گنجائش کو گویا وہ تمام دنیا کی مسلمہ رائیں ہیں۔

بعض وقت مذکورۂ بالا دونوں رائیں ایک دوسرے میں خلط ملط کردیجاتی ہیں۔ پہلی رائے طوائف الملوکی کی طرف لیجاتی ہے اور دوسری خالص عمومیت کی طرف اور بایں ہمہ انکے موئید عام طور پر یہ دعوے کرتے ہیں کہ وہ تمام دکمال صحیح ہیں لیکن یہی وہ امر ہے جو نظریات میں خطرناک ہے۔ انکا مفہوم اور انکا اقتضا یہ ہے کہ بلاواسطہ عمومیت کے علاوہ اور تمام نظامہائے سلطنت برباد کردیے جائیں۔

ان رایوں کی تائید ایسے فریقوں نے کی ہے جو ایک دوسرے کے بالکل مخالف تھے[1] مگر یہ تمام فریق ہمیشہ وہی رہے ہیں جو موجودہ نظام سلطنت یا حکومت سے شاکی تھے اور اُسے

---

[1] یہاں ہمارا اشارہ فرقۂ یسوعیون Jesuits کے قاید لائیتنس کے اور اُسی فرقے کے دو اور شخصوں بیلرمن اور ماریانا کے نظریوں کی طرف ہے جنہوں نے قوم کے اقتدار اعلےٰ کو اس غرض سے اپنی حمایت میں لے لیا تھا کہ وہ سلطنت کے اوپر کلیسا کے اور بادشاہوں کے اوپر پوپ کے تفوق کو قائم کریں۔ بادشاہوں کو اختیار قوم سے حاصل ہوتا ہے اور صرف پوپ کو خدا کی طرف سے اختیار حاصل ہوتا ہے (سولھویں اور سترھویں صدی میں قوم کے اقتدار اعلیٰ کا اصول جس طرح پیدا ہوا اور ایک طرف فرقۂ یسوعی اور دوسری طرف فلسفی مقننوں نے اُسے جسطرح ترقی دی اسکے لئے گیرکی تصانیف دیکھنا چاہئیں) لیکن اس اصول کی اشاعت میں روسو کا اثر سب سے بڑھا ہوا تھا۔ اُسکے خیال کے موافق افراد کا مجموعہ جو اپنے معاشرتی معاہدے کی رو سے متحد ہو۔ وہی صاحب اقتدار اعلیٰ ہے یعنی ہر شخص ایک ہی وقت میں صاحب اقتدار بھی ہے اور ماتحت بھی ہے۔ اقتدار اعلیٰ عام مرضی کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے اور یہ اقتدار اعلیٰ ناقابل انفکاک ہے نتیجہ یہ ہے کہ حصۂ کثیر اگر چاہے تو حکام کی اطاعت سے انکار کردے اور نظام سلطنت کو بدل دے۔ ایسا کرنے میں وہ صرف اپنے اقتدار اعلیٰ پر عمل کرتا ہے اور اُسکی مرضی کے مقابلے میں خود بنائی جماعت کا حاصل کردہ اختیار کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ آخر الکلام یہ کہ روسو کی رائے کے موافق قوم کی جماعت کے لئے کوئی بنیادی قانون نہیں ہوسکتا۔ تمام قوانین صرف قوم کی مرضی کا ظہور ہیں اور جب اُنکی رائے بدل جائے تو قوانین کا اثر زائل ہوجاتا ہے۔

اُلٹ دینا چاہتے تھے۔ فرانسیسی انقلاب کے وقت قوم کا اقتدار اعلیٰ تباہی و بربادی کا ایک مہلک آلہ بن گیا تھا۔ مجلس قومی نے اپنے ۲۰ اپریل ۱۷۹۲ء کے اعلان جنگ میں روسو کے نظریے کو باضابطہ شائع کیا اور لکھا "کہ اس میں مطلق شک نہیں کہ فرانسیسی قوم نے صاف طور پر یہ اعلان کر دیا ہے کہ اقتدار اعلیٰ کا تعلق صرف قوم سے ہے اور وہ اس ناقابل انتقال اختیار کو کسی دوسرے کو تفویض نہیں کر سکتی، انکی اعلیٰ مرضی کے علاوہ آمد پر اگر کوئی قید عاید ہو سکتی ہے تو وہ آئندہ نسلوں کے حقوق ہیں۔ قوم نے اس امر کو تسلیم کر لیا ہے کہ کوئی رواج کوئی معاہدہ انسان کی سوسائٹی (نظم معاشرت) کو کسی ایسے اقتدار کے تابع نہیں کر سکتا جس کے واپس لینے کا انھیں حق نہ ہو۔ ہر قوم کو خود ہی اپنے لئے قوانین بنانیکا اختیار ہے اور اُنکے بدلنے کا ناقابل انتقال اختیار بھی اُسی کو حاصل ہے۔ یہ کسی ایک شخص کا حق نہیں ہے بلکہ سب کا حق ہے"۔ بادشاہی کے برباد ہو جانیکے بعد جو مجلس عام برپا ہوئی اُس نے اس اصول سے کم و بیش نتائج ظاہر کئے۔

لیکن ہم نے اپنے زمانہ میں بھی اس اصول کا پیرس کے اوتیل دِ وِل (ٹاؤن ہال) میں دوبارہ اعلان ہوتے سنا ہے۔ اس قسم کے اقتدار اعلیٰ کے عمل سے سرکش اہل پیرس نے فروری ۱۸۴۸ء میں آئینی بادشاہی کو منسوخ کر دیا، جمہوریت کا اعلان کیا اور امارت مطلق کو ایک عارضی حکومت کے سپرد کر دیا۔ لامارتین کے ایک سرکاری اعلان میں یہ الفاظ درج ہیں کہ "ہر فرانسیسی جو سن بلوغ کو پہنچ گیا ہو اُسکا شمار ملک کے شہریوں میں ہے اور ملک کا ہر شہری رائے دہندہ ہے اور ہر رائے دہندہ ذی اقتدار ہے یہ حق سب کو یکساں اور کامل طور پر حاصل ہے۔ کوئی باشندۂ ملک دوسرے سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ "میرا اقتدار اعلیٰ تجھ سے زیادہ ہے"، اپنی طاقت پر غور کرو۔ اسکو کام میں لانیکے لئے تیار ہو جاؤ اور خود کو اپنے اقتدار اعلیٰ پر قابض ہونیکا اہل ثابت کرو"۔

بعض فرانسیسی مدبروں نے یہ کوشش کی ہے کہ اس قومی اقتدار اعلیٰ کے تباہ کن خیال کے مقابلے میں عقل یا انصاف کے اقتدار اعلیٰ کا ایک دوسرا خیال قائم کریں[1]۔ اُنکی یہ کوششیں

---

[1] مثلاً رایر کولرڈ نے اپنی ۲۷ مئی ۱۸۲۰ء کی تقریر میں کہا تھا کہ "سوسائٹی کے دو عنصر ہیں ایک مادی یعنی افراد اور اُنکی قوت و مرضی، دوسرا اخلاقی یعنی قانون، جو اغراض جائز کا نتیجہ ہے۔ کیا تم سوسائٹی کو مادی عنصر سے پیدا کرنا پسند کرتے ہو؟ اس صورت میں افراد یا اُنکی رایوں کے حصۂ کثیر کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوگا۔

نیک ارادے سے ہوئیں مگر اُن میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اُن لوگوں نے اس طریقے سے قوم کے اقتدار اعلیٰ کے بُرے مصرفوں کے روکنے کی کوشش کی مگر وہ اس امر کو بھول گئے کہ کسی حق کا تعلق "شخص" ہی سے ہوسکتا ہے اور سیاسی تفوق کسی سیاسی شخصیت ہی کی طرف منسوب ہوسکتا ہے۔ ایک غلطی تو یہ ہے کہ سلطنت کی اصولی ہیئت صرف کامل عمومیت ہی تسلیم کیجاتی ہے۔ اب دوسری غلطی یہ ہوئی کہ اسکے مقابلے میں تخیل پرستی (یا حکومت ذہنی) قائم کی گئی۔ مقصود یہ ہے کہ قوم کا حصۂ کثیر خیالات کے تابع ہوکر کام کرے مگر شخصیت ہمیشہ خیال کی بہ نسبت زیادہ قوی رہتی ہے۔

۵۔ قوم کا اقتدار اعلیٰ اس حیثیت سے کہ قوم ایک شخص واحد ہے

ایک دوسری رائے یہ ہے کہ قوم کو ایک شخص واحد سمجھے جو اگرچہ کافی طور پر منظم نہ ہوگئی ہو تاہم اُس میں انتظام کے قبول کرنیکی قابلیت موجود ہو اور اس واحد حیثیت سے اُسکا اقتدار اعلیٰ تسلیم کیا جائے، جسکا مفہوم یہ ہے کہ قوم اپنی زبان، اپنے حسیات، اور اپنے معاشری امتیازات کے ساتھ اپنے حسب مرضی سلطنت میں بھی تغیر کرنیکا حق رکھتی ہے۔

ہم اس سے پہلے (مقالہ ۲، باب ۲ میں) یہ تسلیم کرچکے ہیں کہ ملت People میں قوم nation بننے کا مادہ موجود ہوتا ہے، اور اس لئے ہمیں یہ ماننا پڑیگا کہ اقتدار اعلیٰ کی بنا پڑنے کیلئے یہ ایک فطری شرط ہے مگر یہ صرف امکان ہے اُسکا حصول نہیں ہے۔ اس مفہوم میں قوم کا اقتدار اعلیٰ ایک غیر ترقی یافتہ اور خام شئے ہے جسے سلطنت کا پیشرو کہنا چاہئے۔

۶۔ قوم یا سلطنت کا اقتدار اعلیٰ

یہ ممکن ہے اور یہی ہونا چاہئے کہ ہم nation یا People کو سیاسی مفہوم میں

---

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ۔ اسی کو قوم کا اقتدار اعلیٰ کہتے ہیں۔ اگر یہ کورانہ و ظالمانہ اقتدار اعلیٰ طوعاً یا کرہاً اپنی حالت کو بدلے بغیر ایک یا چند افراد کے ہاتھ میں منتقل ہوجائے تو یہ نسبتاً ایک زیادہ عاقلانہ اور معتدلانہ قوت بن جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ قوت ہی رہتا ہے۔ یہی مطلق العنانانہ قوت اور امتیاز خاص کا مبدا بن جاتا ہے کیا اسکے برخلاف تم سوسائٹی کو اخلاقی عنصر یعنی "حق" سے پیدا کرنا پسند کرتے ہو؟ ایسی صورت میں انصاف کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے، کیونکہ حق کا اصول انصاف ہے۔ آزاد نظامہائے سلطنت کا مقصد یہ ہے کہ قوت کو معزول کرکے انصاف کو حکمران بنادے (اس پر بلنچلی کا اعتراض یہ ہے کہ قوم مادی عنصر نہیں ہے، اور اس خیال میں بھی قانون عامہ کو افراد کی مرضی سے اخذ کرنیکی پرانی غلطی ہے۔ اردو مترجم) دیکھو ارسطو "سیاسیات" مقالہ ۳، فصل ۱۱ ف ۱۹۔ انگریزی مترجم)

ایک زندہ مجسمہ سمجھیں جسکے سر اور اعضا ہوتے ہیں گویا وہ سلطنت کی ذی حیات (یا عضوی) شخصیت ہے۔
جب تک سلطنت ایک شخص کی حیثیت رکھتی ہے اسوقت تک اسکے لئے خود مختاری،
عزت، طاقت، اعلیٰ اختیار اور وحدتِ عمل کا ہونا لازمی ہے۔ اسے ایک لفظ میں یوں کہئے کہ
اسکے لئے "اقتدار اعلیٰ" ضروری ہے۔ سلطنت بحیثیت ایک شخص کے صاحب اقتدار اعلیٰ
ہے اور اسی لئے ہم سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ سلطنت سے
مقدم، سلطنت سے خارج یا سلطنت سے بالاتر کوئی شئے نہیں ہے۔ یہ خود سلطنت ہی کی
قوت اور اسی کی عظمت و شوکت ہے۔ یہ تمام مجموعے کا حق ہے اور جس طرح کل اپنے کسی
جزو سے بالیقین قوی ہوتا ہے اسی طرح کل سلطنت کا اقتدار اعلیٰ بھی سلطنت کے
کسی جزو کے اقتدار اعلیٰ سے یقیناً بالاتر ہے۔

اگر فریقانہ مناقشات نے ابتری نہ برپا کردی ہوتی، تو سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کو
قوم کا اقتدار اعلیٰ کہنا بالکل درست ہوتا بشرطیکہ قوم سے ہم صرف منفرد اشخاص کا انبوہ نہ سمجھیں
بلکہ اُسے ایک منتظم سیاسی مجموعہ سمجھیں، جس میں سر کو سب سے بلند درجہ حاصل ہو اور ہر عضو اپنی
مناسب جگہ پر ہو۔ اس مفہوم میں فرانسیسی مصنفین نے فرانسیسی محاورے کے موافق nation
کے اقتدار اعلیٰ سے بحث کی ہے [۳] جو جرمانی زبان کے خلاف ہے جیسا کہ مقالہ ۲ باب ۲ میں
مفصلاً بیان ہو چکا ہے۔ غلط فہمیوں سے بچنے کیلئے ہم نے مبہم فقرہ "سلطنت کا اقتدار اعلیٰ"
استعمال کیا ہے۔

سلطنت کے اس اقتدار اعلیٰ پر داخلی اور خارجی دونوں طریق پر نظر کیجا سکتی ہے۔

[۳] اسٹیٹو نے اپنے رسالے بابت ۱۸۴۸ء میں کہتا ہے: کوئی شخص قوم nation کے اقتدار اعلیٰ سے
انکار نہیں کر سکتا بشرطیکہ قوم سے آئینی حیثیت سے تمام قوم مراد ہو جس میں بادشاہ اور رعایا دونوں داخل ہوں،
اگر قوم کا کوئی جزو صرف اپنے لئے اقتدار اعلیٰ کا دعوےٰ کرے اور کہے کہ "میں سلطنت ہوں"
تو اس سے کچھ بحث نہیں کہ وہ جزو بادشاہ ہے، پارلیمنٹ ہے یا گروہ عوام ہے۔ یہ اصول غلط ہے
اور غلط اصول کے نتیجے ہمیشہ خطرناک ہوتے ہیں" سسمونڈی نے بھی People کے اقتدار اعلیٰ
اور nation کے اقتدار اعلیٰ میں ایسا ہی سخت فرق کیا ہے اور اول الذکر کو مسترد اور ثانی الذکر کو
قبول کیا ہے (دیکھو سسمونڈی کی تصنیفات جلد ۱ صفحہ ۸۸)

خارجی حیثیت سے یہ کہ کوئی خاص سلطنت دوسری سلطنتوں کے تعلقات کے اعتبار سے کس حد تک خود مختار ہے۔ کلیسا کے تعلق کو اسی ضمن میں سمجھنا چاہئے۔ داخلی حیثیت سے یہ کہ جماعتِ عامہ کو قانون سازی کا حق کس حد تک حاصل ہے۔

انگلستان میں اس مفہوم میں اقتدار اعلیٰ پارلیمنٹ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے[الف] جو کل قوم کی نیابت کرتی ہے اور جسکا سرگروہ بادشاہ ہوتا ہے[ب]۔ یہ امر صرف انگلستان کے

---

(الف) انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں پارلیمنٹ میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "ہ ججوں نے ہمیں اس امر سے مطلع کیا ہے کہ ہماری شاہی حیثیت کسی وقت بھی اس سے بلند نہیں ہوتی جیسی کہ پارلیمنٹ کے دوران اجتماع میں ہوتی ہے، جب کہ ہم اور تم (علی الترتیب) بحیثیت سر اور دیگر اعضا کے ایک جسمِ سیاسی میں متحد ہوجاتے ہیں۔ پس اس ایوان کے ادنیٰ ترین رکن کے خلاف بھی جو کچھ کیا جائے وہ گویا ہماری ذات خاص اور تمام دربار پارلیمنٹ کے خلاف کیا گیا ہے۔"

(ب) [بادشاہ کو پارلیمنٹ کا ایک جزء قرار دیتے ہیں بلنچلی کو انگلستان کے آئینی مقننوں کی تائید حاصل ہے، چنانچہ بلیک اسٹون اپنی تشریحات Commentarias کی کتاب دوم باب دوم میں لکھتا ہے کہ "پارلیمنٹ کے اجزائے ترکیبی میں ذی عظمت بادشاہ (جو اپنی شاہانہ سیاسی حیثیت سے شریک ہوتا ہے) اور ملک کے تینوں طبقات داخل ہیں۔ مقتدایان دین اور امرائے دنیاوی مع بادشاہ کے ایک دیوان میں بیٹھتے ہیں اور عوام اپنے طور پر دوسرے ایوان میں نشست کرتے ہیں"۔ ڈائیسی نے اپنی کتاب "قانون نظام سلطنت" میں لکھا ہے کہ "پارلیمنٹ" کا لفظ اگرچہ عام بول چال میں اکثر کچھ اور ہی معنی میں استعمال ہوتا ہے مگر ایک مقنن کی زبان سے جب یہ لفظ نکلتا ہے تو اس سے مراد بادشاہ، دارالامرا، اور دارالعوام سے ہوتی ہے"۔ مگر عام بول چال کی طرح تاریخی حیثیت سے بھی پارلیمنٹ بادشاہ سے ایک ممیز شئے ہے اور اُس سے مراد طبقات رعایا کی وہ مجلس ہے جسکے مشورے اور مرضی کے بغیر بادشاہ کوئی قانون نہیں بنا سکتا۔ یہ ایک پرانی غلطی ہے اور بار بار اسکی تصحیح کی گئی ہے کہ ملک کے تین طبقات سے مقصود بادشاہ، امرا اور عوام نہیں ہیں بلکہ ملک کے تین طبقات پادری، امرا اور عوام ہیں اور جہانتک ان تینوں طبقات کا تعلق پارلیمنٹ سے ہے وہ بقول بلیک اسٹون مقتدایان دین امرائے دنیاوی اور ارکان دارالعوام ہیں۔ تیرھویں صدی میں قسیسوں سے بحیثیت مجموعی یہ خواہش کیگئی تھی کہ وہ پارلیمنٹ کا ایک طبقہ بن جائیں، مگر انھوں نے اس سے انکار کر دیا (اینسن نے اپنی کتاب نظام سلطنت کے قانون و رواج" میں پارلیمنٹ کی یہ تعریف کی ہے کہ "وہ ملک کے تین طبقوں کا اجتماع ہے جن میں سے ایک طبقہ اُس میں شامل ہونے سے برابر انکار کرتا رہا ہے") بغیر بادشاہ کی طلبی کے

نظام سلطنت کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ زمانۂ حال کی نیابتی تنظیمات کا اساسی اصول یہی ہے۔
حکمراں، جسم قوم کا سر سمجھا جاتا ہے مگر اسی وجہ سے وہ قوم کا ایک عضو بھی شمار ہوتا ہے لیکن
سب سے اعلیٰ اقتدار یعنی قانون سازی کا اختیار سرگروہ کو تفویض نہیں ہوتا بلکہ اُسکے ساتھ
ایک نیابتی جماعت بھی ہوتی ہے گویا یوں کہنا چاہئے کہ کل مجموعۂ سلطنت کو یہ کام سپرد ہوتا ہے۔
موروثیت کا خیال جو سلطنت کو حکمراں کی ملک قرار دیتا ہے اور اس لئے اقتدار اعلیٰ کو صرف
حکمراں تک محدود رکھتا ہے اور مطلق العنانی کا کلیہ جو سلطنت اور حکمران کو ایک ہی شئے
قرار دیتا ہے، یہ دونوں اس امر کو نہیں سمجھتے کہ حکمراں کی تمام طاقت فی نفسہٖ قوم ہی کی مجموعی
طاقت کا نام ہے اور اگرچہ حکمرانوں اور خاندانوں کا زوال ہوتا رہتا ہے مگر قوم اور سلطنت کا
قانونی وجود بدستور باقی رہتا ہے[1]

بقیۂ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ طبقات کی مجلس پارلیمنٹ نہیں ہوسکتی اور اگر وہ بادشاہ کی طلبی سے نہ منعقد ہوئی تو
اُسکی حیثیت محض ایک "مجلس عارضی" کی ہے۔ (انگریزی مترجم)

[1] تسویپ فل سلطنت کے اس اقتدار اعلیٰ کو باطل قرار دیتا ہے۔ اُسکا دعوے یہ ہے کہ شاہیوں میں
صرف بادشاہ کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کیا جاتا ہے اور جمہوریتوں میں رعایا کا اور اس خیال کو وہ صرف جرمانیا
ہی کی سلطنتوں تک محدود بھی نہیں رکھتا، لیکن اس صورت میں ہم روما کے قانون عامہ کی کیا تعبیر کرینگے
جو شہنشاہی اور جمہوریت دونوں کے تحت میں رومی قوم کو اقتدار اعلیٰ عطا کرتا تھا اور قانون کو ہمیشہ رومی قوم
کی مرضی قرار دیتا تھا۔ معہذا جمہوریت کے زمانہ میں قنصلوں کو شاہانہ اختیارات عطا ہوتے اور اعلیٰ
انتظامی اختیار اور محصول لگانیکا حق سینیٹ کے ہاتھ میں رہتا تھا (جو بالیقین حکومتی اقتدار اعلیٰ کی ایک
صفت ہے) علاوہ اسکے انگلستان کے قانون عامہ کی کیونکر تعبیر کیجائیگی جو پارلیمنٹ اور قوم کے اقتدار اعلیٰ کو
بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ سے ہم آہنگ بنا دیتا ہے۔ قانون قوم کی رو سے جرمانیا کی سلطنتیں بھی اپنے حکمرانوں
سے علحدہ صاحب اقتدار اعلیٰ سمجھی جاتی ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ جب دوسری سلطنتوں کے مقابلے میں
اُنکی شخصیت تسلیم کیجاتی ہے تو انھیں کے افراد ملک اور انھیں کے حکمرانوں کے مقابلے میں انکی شخصیت
کیوں نہ تسلیم کیجائے۔ جرمانیا میں قوانین سلطنت کے قوانین ہوتے ہیں اور قومی یا سرکاری قرضے
حکمرانوں کے قرضے سے ایک جداگانہ شئے سمجھے جاتے ہیں۔ منشا یہ ہے کہ حکمرانوں کے موروثی یا مطلق العنانی
اختیار کی روایات باقیات کے باوجود جرمانیا کا قانون عامہ تمام دوسری متمدن سلطنتوں کی طرح

۷۔ حکمرانوں کا اقتدار اعلیٰ

تمام قوم کے اقتدار اعلیٰ کے علاوہ سلطنت کے اندر ایک اور اقتدار اعلیٰ ہوتا ہے یہ اقتدار سلطنت کے سب سے اعلیٰ رکن، سردار یا حکمرانوں کا اقتدار ہے اور چونکہ یہ اقتدار شاہی میں بہت صاف نظر آتا ہے اس لئے اُسے بادشاہ کا اقتدار شاہانہ کہنا چاہئے۔ تنظیم سیاسی کے تمام دیگر ارکان اور منفرد اہل ملک کے مقابلے میں قوم کے بادشاہ کو ایک مفہوم میں صاحب اقتدارِ اعلیٰ کہتے ہیں اور ہر ایک شاہی سلطنت میں اقتدار اعلیٰ بادشاہی کی طرف منسوب ہوتا ہے۔

سلطنت کا اقتدار اعلیٰ اور بادشاہ کا اقتدار اعلیٰ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ اس سے اقتدار اعلیٰ کی اس طرح تقسیم نہیں ہو جاتی کہ اُسکا نصف حصہ قوم سے متعلق ہو جائے اور نصف حصہ بادشاہ سے۔ اختیارات کے لئے کوشش کرنیوالی دو رقیب طاقتیں نہیں ہوتیں اختیارات کی وحدت و عمومیت دونوں میں شامل ہے مگر یہ عیاں ہے کہ کل جس میں سر بھی داخل ہے تنہا سر سے برتر ہے۔ تمام قوم یا سلطنت قانون بناتی ہے مگر سرگروہ کو جو اعلیٰ اختیارات حاصل ہوتے ہیں، قانونی حدود کے اندر وہ انھیں عمل میں لانیکے لئے بالکل آزاد ہوتا ہے۔ سلطنت کا اقتدار اعلیٰ بالتخصیص قانون سے تعلق رکھتا ہے اور بادشاہ کا اقتدار اعلیٰ حکومت یا نظم و نسق سے متعلق ہوتا ہے۔ جہاں اول الذکر بیکار ہوتا ہے وہاں موخرالذکر کام دیتا ہے۔ واقعتاً ان دونوں میں تصادم بہت کم ہوتا ہے اور اصولاً بالکل ناممکن ہے کیونکہ اُسکے معنی یہ ہونگے کہ تنہا سرگروہ تمام سلطنت سے جس میں خود وہ سرگروہ بھی داخل ہے مقابلہ کرے اور یہ بمنزلہ اسکے ہے کہ کوئی شخص خود اپنے سے مقابلہ کرے۔

قوم کے عمومی اقتدار اعلیٰ اور بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ میں کبھی اصلی اتفاق نہیں ہو سکتا، مگر

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ۔ یہ تسلیم کرتا ہے کہ قوم محض رعایا کے مجموعے سے ایک جداگانہ اور بالاتر شئے ہے اور سلطنت کی ایک ہستی اور اُسکی ایک عظمت و قوت ہے جسکا خاتمہ صرف بادشاہوں کی عظمت و قوت پر ہو جاتا ہے۔ میں تسوپفل کی اس رائے کو مانتا ہوں کہ اقتدار اعلیٰ کو تمام و کمال بادشاہ کے لئے تسلیم کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُسکا اقتدار غیر محدود ہو گیا ہے لیکن زمانۂ جدید کی تاریخ نے بالاجبث ذکرار یہ ثابت کردیا ہے کہ یہ اخراجی اصول جرمانیا اور نیز لاطینی ممالک میں مطلق العنانی اور قومی حقوق کی تحقیر کے لئے ایک زبردست مؤید بن گیا ہے۔

سلطنت کے اقتدارِ اعلےٰ اور بادشاہ کے اقتدارِ اعلےٰ میں ویسی ہی موافقت ہے جیسی موافقت کل جسم انسان اور اُسکے سر کے درمیان ہوتی ہے۔

**تعلیق**۔ قوم کے اقتدار اعلےٰ کا فقرہ بعض وقت حصۂ کثیر کا غلبہ ظاہر کرنے کے لئے نہیں بلکہ سلطنت کی اُس شکل یا حکومت کے اُس طرز کے اظہار کے لئے استعمال ہوتا ہے جو قوم کے حصۂ کثیر کی ہستی و بہبود کے منافی ہونیکے باعث بقا کی قابلیت نہیں رکھتی یا یہ کہ سلطنت یا حکومت کی صورتِ موجودہ قوم کے حسب خواہ ہے۔ یہ خیال فی نفسہٖ صحیح ہے مگر اس کے اظہار کا انداز بُرا اختیار کیا گیا ہے۔

علاوہ اس کے اگر قوم کے اقتدار اعلےٰ کا یہ مفہوم ہو کہ سلطنت کا اختیار اولاً قوم کے حصۂ کثیر کی مرضی سے اخذ کیا گیا ہے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ بہت سی عمومیات اور (رومی شہنشاہی یا فرانسیسی شہنشاہی کے مثل) بعض بعض شاہیوں کے نظام سلطنت کی بنیاد بھی (کم از کم نظری یا اصولی اعتبار سے) قوم کے حصۂ کثیر کے رضامندانہ فعل پر مبنی ہے۔ علیٰ ہذا سوئٹزرلینڈ کے متعدد صوبوں کے نظام سلطنت میں قوم کو صاحب اقتدار اعلےٰ نہیں قرار دیا ہے بلکہ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ "اقتدار اعلےٰ بہ حیثیت مجموعی قوم کو حاصل ہے اور مجلس عظمیٰ اُسے عمل میں لاتی ہے"، لیکن اس اصول کا اطلاق بھی تمام سلطنتوں پر نہیں ہو سکتا اور اقتدار اعلیٰ کا لفظ جس سے ایک دائمی حق کا اظہار ہوتا ہے جب کسی مخصوص اور عارضی کارروائی پر عائد کیا جاتا ہے تو ناموزوں ہو جاتا ہے۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ جیسا کہ اکثر عملاً وقوع پذیر ہوتا رہا ہے، قوم کے اقتدار اعلیٰ کے معنی اگر یہ سمجھے جائیں کہ قوم حکومت سے علیحدہ شئے ہے اور اس قسم کی قوم کو یا کسی طاقتور اور پرجوش مجمع کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے حکومت کو اُلٹ پلٹ کر دے یا نظام سلطنت کو تباہ کر دے تو یہ ایسا خیال ہے جسے قطعاً مردود قرار دینا چاہئے اور جو عمومی اصولوں سے بھی کسی طرح موافق نہیں ہو سکتا۔

(انگلستان میں حال کے زمانے میں اقتدار اعلےٰ کے مسئلے پر زیادہ تر آسٹن کی مشہور تعریف کے موافق بحث ہوئی ہے۔ آسٹن نے اپنی جورسپروڈنس (اصول قانون) کے چھٹے خطبے میں اقتدار اعلیٰ کی تعریف یہ کی ہے کہ اگر کوئی معین و مشخص بالاتر انسانی ہستی عادتاً کسی اپنی ہی سی بالاتر ہستی کی فرماں پذیر نہ ہو اور ایک مخصوص سوسائٹی کا سواد اعظم عادتاً

اُسکا فرماں پذیر ہو تو یہی معین و مشخص بالاتر ہستی اُس سوسائٹی میں صاحبِ اقتدارِ اعلیٰ ہے اور یہ سوسائٹی جس میں وہ بالاتر ہستی بھی شامل ہے، ایک سیاسی اور خودمختار سوسائٹی ہے" اقتدار اعلےٰ کے تصور کا یہ مجرد تجزیہ تاریخ کے بالکل خلاف اور عملی حیثیت سے عسیر الحصول ہے سین نے اپنی تصنیف "قدیمی تاریخ تنظیمات" کے خطبۂ ۱۲ و ۱۳ میں اس پر نکتہ چینی کی ہے۔ انگریزی مترجم۔)

---

# تیسرا باب

## (الف) سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کا تجزیہ

۱۔ جلالت

ہر ایک منضبط شدہ قوم کا یہ حق ہے کہ اُسکا رتبہ اور عظمت تسلیم کی جائے اور اُسکی وقعت کیجائے۔ رومی اسے "جلالت سلطنت" کے نام سے موسوم کرتے تھے اور رومی سلطنت کی عزت، اختیار، بلکہ اُسکی ترتیب و تنظیم تک کے خلاف جو کام ہوتا وہ "جلالتِ سلطنت" کے خلاف ایک جرم سمجھا جاتا تھا۔

۲۔ خود مختاری

سلطنت کا دوسری سلطنتوں سے آزاد اور خود مختار ہونا۔ اگر کوئی سلطنت کسی دوسری سلطنت کے سیاسی تفوق کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو۔ تو اُسکا اقتدار اعلیٰ زائل ہوجاتا ہے۔ اور وہ اُس دوسری سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کے تابع ہوجاتی ہے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر طرح کی تبعیت سے سلطنت کا اقتدار اعلیٰ کلیۃً ضایع ہوجائے اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ تبعیت کامل نہ ہو۔ مرکب سلطنتوں، مشترکتیوں، متفقتیوں اور متفقی شہنشاہیوں میں مختص سلطنتیں اگرچہ بعض اعتبارات سے مجموعے کے تابع ہوتی ہیں، تاہم اُن میں اضافی طور پر اقتدار اعلیٰ باقی رہتا ہے۔ یہ اختیار اگرچہ خارجی حیثیت سے محدود ہوتا ہے مگر داخلی حیثیت سے محدود نہیں ہوتا، چنانچہ سوئٹزرلینڈ میں صوبوں کا اقتدار اعلیٰ مجموعی اقتدار اعلےٰ سے بالکل علیحدہ سمجھا جاتا ہے۔ علیٰ ہٰذا شمالی امریکہ اور جرمانی شہنشاہی میں اتحاد یا شہنشاہی کے اقتدار اعلیٰ اور متحدہ سلطنتوں کے اقتدار اعلیٰ میں فرق ہے۔

کسی منفرد سلطنت کا اضافی اقتدار اعلیٰ اُسی حالت میں ممکن ہوتا ہے جب کہ خود اُسکا ایک سیاسی نظام موجود ہو، یعنی قانون سازی اور نظم و نسق وغیرہ کے سب ضروری اعضا خود اُسی میں موجود ہوں، اور وہ کسی بڑی سلطنت کا محض ایک صوبہ نہ بن گئی ہو۔ اس تغیر حالت کے لئے ایک قطعی حد فاصل قائم کرنا بعض وقت مشکل ہوجاتا ہے۔

خارجی امور میں آج کل سلطنت کا اقتدار اعلیٰ بالعموم مجلس وضع قوانین کے بجائے سلطنت کے صدر یا سرتاج کی ذات سے ظاہر کیا جاتا ہے مگر یہ امر اصول کی بنا پر نہیں ہے۔

محض آسانی کے خیال سے ایسا کیا جاتا ہے۔

حکومت کے پسند کرنے اور اسکے بدل دینے کا اختیار۔

اندرونی تعلقات کے اعتبار سے اقتدار اعلےٰ کا اظہار سب سے پہلے رعایا کے اس حق سے ہوتا ہے کہ وہ اپنی سیاسی ہستی کے لئے جو شکل چاہے پسند کرلے اور اگر ضرورت سمجھے تو اُسے بدل بھی دے۔ اسے قوم کا اختیار ترکیبی کہتے ہیں سلہ یہ اختیار قوم کے ایک جزء یعنی محض اسکے حصۂ کثیر کو تفویض نہیں ہوسکتا بلکہ بلاشک وشبہہ اس حق کا تعلق ایک منتظم قوم کی مجموعی حیثیت سے ہے۔ رعایا فرداً فرداً قوم کے حکم کی مخالفت نہیں کرسکتی خواہ اس میں اُسکے سیاسی حقوق کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچتا ہو کیونکہ جب تک کہ ہر شخص فرداً فرداً قانون عامہ کے معاملات میں اطاعت نہیں کریگا اُسوقت تک سلطنت اپنی صورت، اپنا ربط، اور اپنا نظم قائم نہیں رکھ سکتی۔

اصلاح

تاہم اخلاقی یا آئینی، کسی اعتبار سے بھی یہ امر نظر انداز کرنیکے قابل نہیں ہے کہ آیا تغیر، اصلاح کی صورت میں واقع ہوتا ہے یا انقلاب کی صورت میں۔ اصلاح کے لئے امور ذیل لازمی ہیں:۔

(۱) تغیر نظام سلطنت کی موافقت کے ساتھ واقع ہو۔ یعنی ایک نیابتی جماعت کے توسط سے عمل میں آئے اور بحالات ظاہر آئینی حد کے اندر ہو۔

سلہ واشنگٹن نے اپنے ۱۷۹۶ء کے الوداعی خطبے میں کہا تھا کہ "ہمارے سیاسی انتظامات کی بنیاد قوم کے اس حق پر ہے کہ وہ اپنے نظامہائے سلطنت کو خود بناسکتی اور اُن میں ترمیم کرسکتی ہے لیکن جو نظام سلطنت کسی وقت میں جاری ہو جب تک کہ وہ تمام قوم کی بیّن اور قطعی رائے سے نہ بدلا جائے اُسوقت تک اسکی اطاعت کرنا ہر شخص کا مقدس فرض ہے۔ اس خیال ہی سے کہ قوم کو حکومت کے قائم کرنیکا اختیار و استحقاق ہے یہ لازم آجاتا ہے کہ قوم کے ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ وہ قائم شدہ حکومت کی اطاعت کرے۔ قوانین کے عملدرآمد میں کسی قسم کی مزاحمت، اور کوئی اجتماع، کوئی انجمن کیسی ہی دلفریب نام سے کیوں نہ ہو لیکن اگر اسکی اصلی غرض یہ ہے کہ قائم شدہ قوتوں کے بحث مباحثے یا انکی کارروائی کو اپنی مرضی کے موافق چلائے یا اُن پر حاوی ہوجائے یا اُن کے خلاف کارروائی کرے یا اُنھیں مرعوب کردے تو یہ تمام امور اس بنیادی اصول کے تباہ کرنے اور قوم کو ہلاکت کی طرف لیجانیوالے ہیں "۔

(۲) یہ تغیر نظام سلطنت کے منشائے اصلی کے موافق ہو یعنی قدیم تنظیمات اگر برطرف کیجائیں تو یہ ضروری ہے کہ وہ فی الواقع فرسودہ اور بے جوڑ ہو گئی ہوں اور نئی تنظیمات کے لئے نئے حالات نے راستہ صاف کر دیا ہو۔

انقلاب

اگر نظام سلطنت کے شرائط ظاہری یا اُسکے منشائے باطنی سے انحراف کیا گیا تو پھر یہ تغیر اصلاح نہیں رہتا بلکہ انقلاب ہو جاتا ہے۔

اصلاح کا حق سلطنت کی قوت وطاقت کا ایک لازمی اظہار ہے۔ اس حق میں روک پیدا کرنا قوم کے نشو ونما سے انکار کرنا اور انقلاب کی بنا قائم کرنا ہے۔

آیا انقلاب کا حق بھی کوئی شئے ہے

استیصالی نظریۂ سلطنت کا دعوے ہے کہ انقلاب بھی قوم کا ایک حق ہے لیکن یہ بات قانون عامہ کے تصور ہی کے خلاف ہے۔ انقلاب کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو قائم شدہ نظام سلطنت بزور توڑ دیا جائے یا اُسکے اصولوں سے روگردانی کیجائے۔ پس اصولاً انقلابات کا کوئی حق نہیں ہو سکتا مگر اسکے ساتھ ہی اس میں بھی شک نہیں کہ وہ پرزور نوامیس قدرت سے ہیں جو قانون عامہ کو بدل دیتے ہیں۔ جو طاقتیں شورانگیز طور پر قوم میں تحرک پیدا کر دیتی ہیں اُن پر جہاں کوئی روک نہیں ہوتی وہاں آئینی قانون کے باقاعدہ عملدرآمد میں خلل پڑ جاتا ہے۔ انقلاب کی موجودگی میں قانون بےحقیقت ہو جاتا ہے۔ درحقیقت علی سیاسیات کا یہ بہت بڑا کام ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو انقلابی تحریکات کو آئینی اصلاح کی شاہراہ پر چلا دے۔

مستثنیٰ حالت کے سوا انقلاب کا کوئی حق نہیں ہو سکتا۔ صرف یہی ضرورت اسے روا رکھ سکتی ہے کہ کوئی قوم اپنی ہستی کے بچانے یا اصلاح کے تمام راستوں کے بند ہو جانیکے باعث ترقی حاصل کرنیکے لئے مجبور ہو جائے۔ نظام سلطنت، قوم کا صرف ظاہری انتظام ہے اور اگر اُسکی وجہ سے خود سلطنت تباہی کے گرداب میں پڑ جائے یا بہبود عامہ کے اہم مفاد کو خطرہ پیش آجائے تو پھر "ضرورت کسی قانون کو تسلیم نہیں کرتی"[۲]

[۲] نی بور جو ایسا سخت قدامت پرست تھا کہ جولائی ۱۸۳۰ء کے فرانسیسی انقلاب سے اُسکا دل ٹوٹ گیا تھا، وہ اپنا یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ "اس اصول سے انکار کرنا کہ ضرورت کسی قانون کو تسلیم نہیں کرتی" بدترین ظلم وستم کی اجازت دیتا ہے۔ جب کوئی قوم پیروں کے نیچے روندی جارہی ہو اور اسکے ساتھ ایسا

۴۔ وضع قوانین

اقتدار اعلیٰ کا ایک دوسرا منصب ہے ضروری قوانین کا وضع کرنا۔ نظام سلطنت بنانے کے اقتدار کی طرح توضیع قوانین کا اختیار بھی سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کا نتیجہ اور ساتھ ہی ساتھ اُس اکا صحیح مظہر ہے۔

۵۔ سلطنت کی تمام دوسری طاقتوں کا اس اقتدار اعلیٰ کے تابع ہونا۔

اصولاً تمام اختیارات عامہ اسی اقتدار اعلیٰ کے تابع ہوتے ہیں، چنانچہ نظام سلطنت اور وضع قوانین کے ذریعے سے اقتدار اعلیٰ کی تمام دوسری قوتیں محدود و مرتب کیجاتی ہیں۔ نظامِ سلطنت کے ترتیب دینے اور قانون کے وضع کرنے میں سلطنت کا اقتدار اعلیٰ عملی حیثیت سے ظاہر ہوتا ہے ورنہ عام طور پر وہ ساکت وصامت رہتا ہے۔ شاہی میں یہ خاص بات ہے کہ دوسری قوتوں کے روز روز کے تغیر پذیر افعال بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ میں مجتمع ہو جاتے ہیں۔ قوم بحیثیت مجموعی ساکت رہتی ہے اور اُسکا سرگروہ بالواسطہ یا بلاواسطہ حکام و عمال کے ذریعے سے کام کرتا رہتا ہے۔

لیکن اگر وہ رکن جسے باقاعدہ کام کی فکر کرنا پڑتی ہے، کام کرنیکے قابل نہ رہے مثلاً یہ کہ تخت سلطنت خالی ہو جائے اور نظامِ سلطنت کے موافق کوئی جانشین نامزد نہوا ہو تو اس کمی کو پورا کرنیکے لئے سلطنت کا اقتدار اعلیٰ خود عمل کرنے لگتا ہے۔

۶۔ عدم ذمہ داری

اعلیٰ نقطۂ خیال سے انسان کبھی غیر ذمہ دار نہیں ہوسکتا۔ خود قومیں نہ صرف خدا کے ابدی حکم ہی کی جوابدہ ہیں بلکہ تاریخ کے واقعات کے سامنے بھی وہ جوابدہ ہیں۔ تاہم یہ غیر ممکن ہے کہ سلطنت کے اندر کوئی ایسا محکمہ قائم کیا جائے جسکے روبرو خود قوم بہ حیثیت مجموعی یا اُسکا وہ قائم مقام جسے اعلیٰ اختیار تفویض ہو جوابدہی کے لئے طلب کیا جاسکے، کیونکہ اس صورت میں خود سلطنت اپنے ایک محکمے کے تابع ہو جائیگی اور اس طرح کل جزو کے اور جسم ایک عضو کے تابع ہو جائیگا۔ اگر سلطنت اپنے اقتدار اعلیٰ کے عمل کرنیکے لئے

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ۔ ظالمانہ برتاؤ ہو رہا ہو جسکی اصلاح کی کوئی توقع نہو جسکی ستم شعاری نہ مردوں کے حقوق کا خیال کرے اور نہ عورتوں کی عزت کا پاس، تو یہ ایک انتہائی ضرورت کا موقع ہے اور ایسی صورت میں کوئی فعل اس سے زیادہ حق بجانب نہیں ہوسکتا کہ ایسے ظالموں کے خلاف خروج کیا جائے۔ جو شخص اس سے انکار کرے وہ ایک بدبخت ملعون ہے۔

کسی دوسری سلطنت کو جوابدہ ہو تو اس طرح اُسکا اقتدار اعلیٰ محدود ہو جائیگا۔
بین الاقوامی قانون کی ترقی یا ایک عالمگیر سلطنت کے قائم ہو جانے سے یہ ممکن ہے کہ قوموں کی قانونی ذمہ داری کا کوئی انتظام ہو جائے، اس وقت تو یہ محض ایک خیال ہے ممکن ہے کہ آئندہ زمانے میں حقیقت ہو جائے۔
تمام مخصوص طاقتیں سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کے ارکان کے روبرو جوابدہ ہیں۔ وزرا اور بڑے سے بڑے عمال پر انکے نظم ونسق کی جوابدہی لازم ہے۔

۷، سلطنت کی تمام دوسری طاقتیں اسی اقتدار اعلیٰ کے جوابدہ ہیں۔

**تعلیق** ۔اس زمانے کی مجالس ترکیبی بالعموم ۱۷۸۹ء کی فرانسیسی قومی مجلس کو نظیر قرار دیکر یہ خیال کرتی رہی ہیں کہ اُنکی کارروائی سلطنت کے اقتدار اعلیٰ پر نہیں بلکہ (روسو کے خیال کے موافق) قوم کے اقتدار اعلیٰ پر مبنی ہے لیکن روسو خود اس سے بہت آگے بڑھا ہوا ہے۔ وہ تمام نیابتی مجلسوں کے کامل اقتدار اعلیٰ سے منکر ہے اور اسکا یہ خیال ہے کہ قوم کا سواد اعظم جب وقت چاہے بغیر کوئی وجہ ظاہر کئے ہوئے، براہ راست اپنی مرضی کو مجلس پر عائد کر سکتا ہے اور ایسا کرنا بالکل بجا ہے۔اس اصول کے نتائج اکثر خوفناک دُمدار ستاروں کی طرح سیاسی اُفق پر نمودار ہوتے رہے ہیں اور اُن با اقتدار جماعتوں کو ہیبت زدہ کر دیا ہے جنھوں نے خود ہی عوام کالانعام کو بھڑکایا تھا۔

# چوتھا باب

## (ب) حکمراں کا اقتدار اعلےٰ

موجودہ زمانے کی جمہوریتوں میں سلطنت کے سرگروہ کا اقتدار اعلیٰ تسلیم نہیں کیا جاتا

موجودہ زمانے میں سلطنت کے سرگروہ کا اقتدار اعلےٰ صرف شاہی میں تسلیم کیا جاتا ہے اقتدار اعلیٰ کا فی نفسہٖ مستحق بادشاہ ہی ہوسکتا ہے، رئیس جمہوریہ اُسکا دعویٰ نہیں کرسکتا گو کہ شاہانہ اختیارات کو عمل میں لاتا ہے۔

قدیم رومی جمہوریہ میں "جلالت" قنصلوں کی طرف منسوب تھی جنھوں نے شاہی اختیار کو باخود باتقسیم کرلیا تھا۔ بعد کو یہ (جلالت) سینات سے بھی منسوب ہوگئی۔ جدید جمہوریتیں اقتدار اعلیٰ پر زیادہ رقیبانہ نظر رکھتی ہیں اور حکومت کے سرگروہ اعلیٰ کو محض قوم کا حکم بردار سمجھتی ہیں اور قوم کے اقتدار اعلیٰ کے حقوق اسکی طرف منتقل نہیں ہوسکتے[1]۔

لیکن شاہیوں میں خواہ وہ انتخابی ہوں یا موروثی۔ یہ حق تسلیم کیا جاتا ہے۔

اکثر یہ دعوے کیا جاتا ہے کہ حکمراں کے اقتدار اعلےٰ کا وجود صرف موروثی شاہیوں میں پایا جاتا ہے، لیکن ایسا خیال کرنا درحقیقت فرمانروا کے نفس اختیار کو مبدا اختیار میں خلط کردیتا ہے۔ ایک منتخب شدہ فرمانروا کو اپنی ذاتی حیثیت سے اقتدار اعلیٰ کا حق کسی موروثی فرمانروا سے کم نہیں ہوتا۔ انگلستان کے بادشاہ جارج اول[الف] کا اقتدار شاہانہ کسی طرح اُسکے جانشینوں سے کم نہیں تھا حالانکہ اُسی کے ذات سے یہ نیا خاندان شروع ہوا تھا۔

اس اقتدار کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں (۱) ذاتی

تاہم علمی حیثیت سے ہم حکمران کے ذاتی (original) اور تفویضی (derived)

---

[1] روسو حکمراں کے اقتدار اعلیٰ کو اس بناپر مسترد کرتا ہے کہ مرضی عامہ کل قوم ہی سے متعلق ہوسکتی ہے۔ قوم کے کسی جزء کی مرضی ایک محدود مرضی ہے اور اس لئے زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ فیصلے صادر کرے، قوانین کا بنانا صرف کل قوم ہی کے وسیلے سے ہوسکتا ہے لیکن اقتدار اعلیٰ کو صرف قانون سازی تک محدود رکھنا اور حکومت کے لئے اُسے وسیع نہ کرنا غلطی ہے۔

(الف) (بلنچلی نے یہاں "ولیم (آرنج)" کا نام لیا ہے۔ منتخب شدہ بادشاہ کی یہ مثال زیادہ موزوں ہے مگر ولیم نے کوئی خاندان نہیں قائم کیا۔ انگریزی مترجم)

اقتدار اعلےٰ میں فرق قائم کرسکتے ہیں لیکن اس فرق کا اطلاق سلطنت کے اقتدار اعلےٰ پر نہیں ہوسکتا کیونکہ سلطنت کا اقتدار اعلیٰ ہمیشہ اسکا جزو ذاتی ہوتا ہے اول الذکر اقتدار وہ ہے جو آبائی یا قابضانہ حقوق کے طور پر اصلاً حکمراں کی ذات سے وابستہ ہے۔ اس صفت میں موروثی حکمراں اور فاتح، اور وہ حکمراں داخل ہیں جو خود تاج شاہی اپنے سر پر رکھ لیں جیساکہ چارلس اعظم اور فریڈرک اول شاہ پروسیا نے کیا تھا اور یہی حال جرمانیا کے اُن منتخب شدہ شہنشاہوں کا تھا جو اپنے اقتدار اعلیٰ کا ماخذ انتخاب کنندوں کو نہیں بلکہ خدا کو سمجھتے تھے۔

۲۔ تفویض

ثانی الذکر اقتدار کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ قوم یا انتخاب کنندوں نے اُسے اقتدار تفویض کیا ہے، چنانچہ روما میں شہنشاہی اختیار قوم کا عطا کردہ تھا[۲] موجودہ زمانے کی انتخابی شاہیاں بھی اسی قسم کی ہیں۔

سلطنت کے مختلف فرائض پر بحث کرنیکے بعد ہم حکمراں کے اقتدار اعلیٰ کا تجزیہ کرینگے۔

---

[۲] دیکھو مقالہ ۶، باب ۱۰۔

# پانچواں باب

## تقسیم اختیارات

### (۱) زمانۂ قدیم کی ابتدائی مجلسیں

بلاواسطہ مجالس قانون سازی

مجالس وضع قوانین کے نشو ونما کے لحاظ سے زمانۂ حال کی سلطنتیں قدیم سلطنتوں کے مقابلے میں بہت ہی اعلیٰ درجۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہیں۔ قدیم زمانے میں بھی یہ اصولی خیال پیدا ہوگیا تھا کہ قوم وضع قوانین میں حصہ لیتی ہے اور مجلس واضع قوانین میں قوم کی نیابت ہوتی ہے مگر اُس زمانے میں اہل شہر یکجا جمع ہوجاتے تھے اور اس طرح وہ اس فرض کو براہ راست انجام دیتے تھے۔

یونان کی مجالس عامہ مقابلۃً بہت ابتدائی حالت میں تھیں۔ ایتھنز کے نکس (جائے اجتماع) یا تھیٹر میں اہل شہر کا ایک بے ترتیب مجمع ہوجاتا تھا آدمی گن لئے جاتے تھے اور ہر شخص کو بولنے کا حق حاصل ہوتا تھا۔ اس کے برخلاف روما کی کومیٹیا (مجلس عام) طبقات میں منقسم تھی اور صرف اعلیٰ حکام کے حسب ہدایت کارروائی کرتی تھی[۱]

نیابتی مجالس سے کمتر درجے پر ہیں

اس طریقے میں بہت سی حقیقی خرابیاں ہیں جنکا تدارک زمانۂ موجودہ کے نیابتی طریق سے کیا گیا ہے۔

(۱) جس سلطنت کا رقبہ ایک معمولی قصبے سے زاید ہو اُس میں تمام شہریوں کا براہ راست اجتماع ناممکن ہے۔ وسیع سلطنتوں میں کل قوم کی مجلس کہنے کی بات رہ جاتی ہے چنانچہ روما میں جمہوریت کی آخری صدیوں میں یہی حال تھا۔ اس حالت میں دارالصدر کے عوام کو ایک غیر متناسب غلبہ حاصل ہوجاتا ہے۔

---

[۱] اس وجہ سے اہل روما Comitia Centuriata (سنتوریہ) کو Comitia Tributa (مجلس قبایلی) سے بالاتر سمجھتے تھے۔

(۲) ایسی وسیع اور مختلف النوع مجلس بہت ہی بے قابو ہو جاتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتی ہے کہ عام رائے کا اظہار کردے یا کسی ایسی تجویز کی جو پہلے سے مشتہر ہو چکی ہو منظوری یا نامنظوری دیدے لیکن کسی مجوزہ قانون پر سنجیدگی سے بحث کرنا یا سیاسیات کے پیچیدہ مسائل کو سلجھانا اسکے حیطۂ امکان سے بالکل خارج ہے۔

صرف بہت ہی چھوٹی سلطنتوں میں جہاں ہر کام میں بالکل سادگی ہو قانون سازی کا کام عام مجلس کو سپرد کیا جاسکتا ہے۔

---

# چھٹا باب

## (ب) سلطنت کے سیاسی فرائض کی قدیم تفریق

اگرچہ اقتدارِ اعلیٰ میں ایک بڑی حد تک وحدت اور مرکزیت ہوتی ہے لیکن پھر بھی سلطنت کو مختلف فرائض انجام دینا پڑتے ہیں اور اسی سبب سے سلطنت کے مختلف مناصب اپنی اپنی عملی ضرورتوں کے لحاظ سے مختلف شکلیں بھی اختیار کر لیتے ہیں۔

ارسطو کی تقسیم

ارسطو کی رائے میں یہ فرائض تین ہیں۔

(۱) غور و بحث (شوریٰ)

(۲) نظامت۔

(۳) عدالت۔

وہ اول الذکر کے ضمن میں سلطنت کے اہم معاملات عامہ یعنی جنگ وصلح کے فیصلے، معاہدوں کے قائم کرنے یا اُنکو مسترد کرنے، وضع قوانین، موت، جلا وطنی، اور ضبطی کی سزاؤں اور مالیات کی نگرانی کو داخل سمجھتا ہے پس اس طرح بہت ہی مختلف الحیثیت امور یکجا ہو گئے ہیں۔ بیرونی سیاسیات اور وضع قوانین اور پھر اُسی کے ساتھ فوجداری کا اعلےٰ اختیار اور حکومت کے نظم ونسق کی نگرانی سب اس میں آگئی ہیں مگر تمام سلطنت اور اہل ملک کی حفاظت کے لحاظ سے یہ سارے امور اپنی سیاسی اہمیت کی بنا پر ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ارسطو ان سب کو قانون سازی نہیں بلکہ شوریٰ سمجھتا ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ واقعی قانون سازی کا کام زمانۂ مابعد تک مجالس عامہ کے تحت میں نہیں تھا اور صرف بالواسطہ اُس پر اُنکا اثر پڑتا تھا لیکن اور دوسرے نہایت اہم معاملات میں ان کے غور و بحث کا بہت بڑا اثر تھا۔

ثانی الذکر اختیارات کسی حد تک نظامہائے جدیدہ کے عاملانہ اختیارات کے مماثل ہیں لیکن یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اُنکا تعلق حکمرانی کے سفقتدر حکموں سے ہے۔

تیسری قسم ہمارے عدالتی اختیارات کے مرادف ہے۔

اگرچہ مختلف فرائض اپنی خصوصیات کی وجہ سے خارجی طور پر ایک دوسرے سے ممیز رکھے گئے ہیں مگر کارکن افراد کے اعتبار سے داخلی طور پر وہ متحد ہوجاتے ہیں۔ ابھی ابھی یہ ذکر ہوچکا ہے کہ ایتھنز کی مجلس عام قوانین پر غور و بحث کرتی، حکومت کی اہم کارروائیوں کو عمل میں لاتی، اور عدالتی فرائض کو بھی انجام دیتی تھی۔ وہاں کے آرخون انتظامی عہدہ دار ہوتے تھے مگر اسکے ساتھ ہی اُنھیں عدالتی اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے رومآ کی سلطنت نے اس سے زیادہ ترقی کی تھی اور وہاں فرائض کی تفریق بڑھی ہوئی تھی۔ یونان کی بہ نسبت کومیٹیا (مجلس عام) کے قانونی فرائض، سینات اور حکام کے فرائض سے پوری طرح واضح اور ممیز تھے تاہم "کومیٹیا" میں غیر ملکی معاملات کے اہم مسائل پر بحث ہوتی تھی اور ابتدائی زمانے میں حکم موت کے مرافعے کا فیصلہ بھی وہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح سینات صرف انتظامی ہی امور کو سر انجام نہیں دیتی تھی بلکہ اُسکی منظور شدہ تجویزوں کو قانونی حیثیت حاصل ہوجاتی تھی اور سب سے آخر امر یہ ہے کہ حکام بالعموم انتظامی اور عدالتی دونوں فرائض کے جامع ہوتے تھے جس شخص کو جس حد تک اقتدار (Inperium) حاصل ہوتا تھا اُسکو اسی حد تک عدالتی اختیار (Jurisdictis) بھی حاصل ہوتا تھا۔ علاوہ اسکے اُسے مذہبی فرائض بھی انجام دینا پڑتے تھے اور اپنے احکام اعلامی کے وسیلے سے اُسے ایک طرح کا قانونی اختیار بھی حاصل ہوتا تھا۔ با ایں ہمہ جمہوریۂ روما کی تمام تنظیمات میں صاف یہ نظر آتا ہے کہ ارادۃً یہ کوشش کیجاتی تھی کہ حکومت کے مختلف فرائض ایک دوسرے سے علٰحدہ ہوجائیں۔

مشرقی رومی شہنشاہی میں ایک نیا امتیاز اور قائم ہوا۔ تمام شہنشاہی کے جملہ سرکاری اختیارات بدستور شہنشاہ کے ہاتھ میں رہے مگر صوبوں کی ماتحت حکومت میں ملکی اور فوجی عہدے پوری طرح ایک دوسرے سے علٰحدہ کردیے گئے تھے۔ حکام کے بے انتہا اختیارات کے باعث رعایا پر جب ظلم و ستم ہو رہے تھے اُسوقت رعایا کے مفاد کے خیال سے یہ کارروائی عمل میں نہیں آئی مگر اب تخت کو محفوظ رکھنے کی ضرورت سے اسکے نفاذ پر مجبور ہونا پڑا۔ بہر حال اس سے سیاسی ترقی کا ایک قدم آگے بڑھا جسے زمانۂ حال کی سلطنت نے بھی قبول کرلیا ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ میں سلطنت کی طاقت میں ہر طرف سے روک پیدا ہوکر وہ محدود ہوگئی تھی

لیکن فی نفسہ نہایت ہی مختلف النوع فرائض باہم مجتمع ہو گئے تھے۔ نہ صرف بادشاہ کو بلکہ ہر ایک کاؤنٹ کو ملکی اور فوجی، انتظامی اور عدالتی جملہ اختیارات حاصل ہوتے تھے اور مجالس ملکی وضع قوانین کے ساتھ ہی ساتھ عدالتی فرائض بھی انجام دیتی تھیں۔

بوؤین نے عدالتی فرائض کی علیحدگی پر زور دیا

بوؤین پہلا شخص تھا جس نے اس امر پر توجہ دلائی کہ کم از کم بادشاہ کو یہ چاہئے کہ وہ بذات خاص عدالتی کارروائی نہ کرے بلکہ اس کام کو آزاد ججوں کے ہاتھ میں چھوڑ دے۔ اُس نے قدیم دستور کی حمایت میں بہت سے دلائل بھی بیان کئے ہیں مثلاً یہ کہ بادشاہ کا بذات خاص تمام قوم کے سامنے عدل و داد کرنا بہت اچھا اثر پیدا کرتا ہے مگر اسکے ساتھ ہی اُس نے یہ دکھایا ہے کہ اس سے قوی تر وجوہ اس امر کے موجود ہیں کہ بادشاہ بذات خاص جج کا کام کرنے سے کنارہ کش رہے۔ ایک ہی وقت میں قانون ساز اور جج دونوں ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ انصاف اور حق عفو باہم ملا دئے جائیں، قانون کی پابندی بھی کیجائے اور حسب مرضی وہ ترک بھی کر دیا جائے۔ اگر انصاف پوری طرح نہ ہوا تو متخاصم فریقوں کو کافی آزادی نہیں رہتی اور وہ بادشاہ کے اقتدار کے نیچے دب جاتے ہیں۔ سزا کی دہشت خوفناک طور پر بڑھ جاتی ہے اور اگر بادشاہ کی طبیعت ظلم کی طرف مائل ہوئی تو مقام عدالت پر رعایا کے خون کی نہریں بہنے لگتی ہیں اور قوم کو اپنے سر تاج سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب بادشاہ خود اپنے معاملات میں یا اپنے خلاف جرموں میں فیصلہ کرتا ہے تو صورت معاملات نہایت بدتر ہو جاتی ہے۔ پس بہتر یہی ہے کہ وہ اپنے لئے صرف رحم و عفو کے اختیارات خاص کو محفوظ رکھے۔

درحقیقت بوؤین کو یہ موقع تھا کہ وہ فرانس کی تاریخ سے نظائر پیش کرتا۔ مقدمات کے وقت بادشاہ کی موجودگی کے خلاف امرا کی متعدد پارلیمنٹیں اپنا خیال ظاہر کر چکی تھیں۔ بیشتر سلطنتوں نے بتدریج اس نئے اصول کو اختیار کر لیا، بادشاہوں نے یہ کرنا شروع کیا کہ معمولاً عدالتی کارروائیاں حکام کے سپرد کر دیں اور اپنے لئے صرف فیصلوں کی تصدیق اور بالخصوص حکم موت کی منظوری کو محفوظ رکھا۔

# ساتواں باب

## (ج) تقسیم اختیارات کا جدید اصول

سیاسیات جدیدہ کی رفتار نے یہ خیال پیدا کر دیا ہے کہ سیاسی فرائض کی خارجی تفریق کے لئے یہ ضروری ہے کہ انھیں فرائض کے موافق شخصی طور پر کارکنوں کی بھی تفریق ہو جائے۔

مونتسکیو

مونتسکیو پہلا شخص تھا جس نے شد و مد کے ساتھ اس جدید اصول کا اعلان کیا اُس نے مدنی آزادی اور تحفظ کے نام سے یہ مطالبہ کیا کہ مختلف فرائض عامہ کو مختلف شخصوں کے ہاتھوں سے انجام پانا چاہئے اگر قانون سازی کے اختیارات، عاملانہ اختیارات کے ساتھ ایک ہی شخص بلکہ ایک ہی جماعت حکام کے ہاتھ میں مجتمع ہو جائیں تو پھر آزادی کوئی چیز نہیں رہتی کیونکہ قوم کو یہ خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ بادشاہ یا سینات اپنی جابرانہ کارروائیوں کے لئے من مانے قانون بنائے گا اور اُنکو جابرانہ طور پر عمل میں بھی لائے گا۔ علیٰ ہذا اگر عدالتی اختیار، تشریعی اور عاملانہ اختیار سے جدا نہیں ہے تو بھی آزادی نہیں باقی رہتی۔ اگر عدالتی اختیار قانون سازی کے اختیار کے ساتھ ملا دیا جائیگا تو اہل ملک کی زیست وحیات معرض خطر میں پڑ جائے گی کیونکہ خود جج ہی واضع قانون بھی ہوگا۔ اور اگر عدالتی اختیار، عاملانہ اختیار کے ساتھ ملایا جائے گا تو جج کو ایک ستمگار شخص کی قوت حاصل ہو جائے گی[1]

اعلیٰ قسم کی ... وظائف میں ... زیادہ ہوتی

کسی ایک شخص کے ہاتھ میں ضرورت سے زیادہ اختیارات کے جمع ہو جانے سے شخصی آزادی کے لئے بالیقین خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اختیار کی مختلف شاخیں علیحدہ کر دیجائیں تو ایک دوسرے کے اثر سے اُن میں روک پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس تفریق کے قائم کرنیکی دلیل قاطع یہ سیاسی غرض نہیں ہے کہ اُس سے عملاً ملکی آزادی کی ضمانت ہو جاتی ہے

---

[1] دیکھو مونتسکیو کی "روح قانون" Espoit des lois (میں "انگریزی نظام سلطنت" کا بیان) جلد ۱۱ صفحہ ۶ اور بلنچلی کی "عام نظریۂ سلطنت کی تاریخ" صفحہ ۲۶۷۔

بلکہ اسکی بڑی وجہ نظام عضوی میں پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر کام اُسی وقت خوبی سے انجام پاتا ہے جب کہ اُسکا کارکن عضو خاصکر اسی کے لئے بنایا گیا ہو نہ کہ جب بالکل مختلف فرائض ایک ہی عضو کے حوالے کردیئے جائیں۔ اس امر میں ملکی مُدبّر فطرت ہی کی مثال کی پیروی کرتا ہے۔ آنکھ دیکھنے کے لئے موزوں ہے، کان سننے کیلئے، منھ بولنے کے لئے اور ہاتھ گرفت وعمل کے لئے، اسی طرح جسم سیاسی کے لئے بھی ضروری ہے کہ ہر کام کے لئے ایک جداگانہ کارکن ہو۔

امتیاز ہونا چاہئے نہ کہ تفریق۔

"تفریق اختیارات" کے مقبولِ عام فقرے سے ایک صحیح اصول کا غلط عملدرآمد پیدا ہوجاتا ہے۔ اختیارات میں اگر کلیۃً "تفریق" ہوجائے اور وہ ایک دوسرے سے علٰحدہ کردئے جائیں تو سلطنت کا توحدِ عمل باطل ہوجاتا ہے جس طرح طبعی جسم میں مختلف اعضا ایک دوسرے سے مربوط ہیں اسی طرح سیاسی جسم کے کارکن اعضا کا باہمی ربط انکی تفریق سے کم ضروری نہیں ہے، پس سلطنت کے لئے اتحاد قوت ایک لازمی چیز ہے اس لئے اختیارات میں باعتبار فرائض کے امتیاز ہوسکتا ہے مگر انھیں کلیۃً جدا نہیں ہونا چاہئے۔

اختیارات کی سہ گانہ تقسیم۔

مونٹیسکیو نے تین اختیارات قائم کئے ہیں (۱) اختیار قانون سازی (۲) اختیار عاملانہ (۳) اختیار عدالتی۔

انگریزوں نے بھی اس تقسیم کو اپنا نظریۂ سلطنت بنالیا ہے۔ شمالی امریکہ کے ممالک متحدہ (الف) میں اس سہ گانہ تقسیم پر بہت سختی بلکہ مبالغے کے ساتھ عملدرآمد ہوا ہے اور جدید یورپ کے بہت سے نظامہائے سلطنت نے بھی اسی کو مان لیا ہے۔

اضافے

بعضوں نے مقدماً سلطنت کے وحدت عمل کے خیال سے ان تین اختیارات پر اضافے بھی کئے ہیں۔ ازآنجملہ سلطنت میں (۴) ایک قوت معدلہ کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ بنجمن کلونسٹنٹ کا خیال ہے اور ڈون پیڈرو کے پرتگالی نظام سلطنت میں بھی اُسے اختیار کیا ہے۔

دوسروں نے عاملانہ قوت کے متعلق حسب ذیل اضافے کئے ہیں:۔

(الف) (ممالک متحدہ امریکہ کے واقعی نظام سلطنت نے اُس زمانے کے انگریزی نظام سلطنت کے مروجہ نظریے کی جس درجہ تبعیت کی اُسکے لئے بیجہٹ کی تصنیف انگریزی نظام سلطنت (اشاعت ۱۸۶۷ء صفحہ ۲۰ اور ۲۲ دیکھنا چاہئے۔

(۵) اختیار انتظامی۔
(۶) اختیار نظارت۔
(۷) اختیار نیابت۔

یہ مختلف اختیارات مساوی نہیں ہیں

ایک غلط خیال یہ پھیلا ہوا ہے کہ یہ سب اختیارات ایک دوسرے کے مساوی ہیں۔ یہ خیال سلطنت کی عضوی نوعیت کے خلاف ہے۔ عضوی جسم میں ہر ایک عضو اپنی خاص قوت رکھتا ہے مگر ان عضووں میں سے کسی ایک کی قوت کسی دوسرے عضو کی قوت کے مساوی نہیں ہوتی بلکہ ایک کی قوت دوسرے کی قوت کے یا تو ماتحت ہوتی ہے یا اُس کی بالادست، اور یا پھر اُسکے دوش بدوش کام کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو مجموعے کا ربط و اتحاد قائم نہ رہے گا۔ یہی حال سلطنت کا ہے اگر تمام اعلیٰ اختیارات واقعی مساوی ہوں اور ممالک متحدہ امریکہ کی طرح یہ حالت صرف ظاہری نہ ہو تو سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ "سر کو جسم سے جدا کر کے اُسے جسم کے مساوی کرنا انسان کی جان لئے بغیر ممکن نہیں" (دیکھو بلنچلی کے "اسطالعات" صفحہ ۱۴۶)

دوسری غلطی جو بالکل ہی بچوں کی سی بات معلوم ہوتی ہے یہ ہوا کرتی ہے کہ لوگ سلطنت کے اعضائے عملیہ کو بالکل ایک منطقی قیاس سمجھتے ہیں۔ قانونی قوت، قواعد مرتب کرتی ہے گویا وہ مقدمہ کبریٰ ہے اور عدالتی قوت اُسکے تحت میں کسی خاص واقعے کو جانچتی ہے یعنی وہ مقدمہ صغریٰ ہے اور عاملانہ قوت نتیجہ برآمد کرتی ہے[۱]۔ پس اس طرح پر عدالتی فیصلے میں مختلف قوتوں کے تمام فرائض مجتمع ہو جائیں گے اور حکومت اُن فیصلوں کو عمل میں لانیکے لئے صرف پولس کا کام انجام دینے کے لئے رہ جائیگی۔

الف قانون سازی کی قوت

سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ قانون سازی کی قوت کو دوسری تمام قوتوں سے

---

[۱] مگر مونٹیسکیو نے اسکا تصور اپنے ذہن میں دوسری ہی طرح پر جمایا ہے (۱۱، ص ۶)۔ وہ عدالتی اختیار کو بھی یوں بیان کرتا ہے۔ "اُن امور میں عاملانہ اختیار جو حقوق عامہ سے متعلق ہیں" اور اس طرح اُسے حقیقی "عاملانہ اختیار سے جو حقوق شخصی کے مابین ہوتا ہے" جدا کیا ہے۔ اس عجیب خیال کو اُس کے تتبع میں کانٹ نے "نظریۂ قانون" ف ۴۵) اور اشبٹ لرنے "خطبات بر سیاسیات" ف ۱۵) بھی اختیار کیا ہے۔ بخلاف انکے دیکھو اشتال "سلطنت کا نظریہ" جلد ۲ ف ۲۵۔

ممیز کر کے دیکھئے دوسرے تمام فرائض، خاص خاص کارکنوں سے متعلق ہیں مگر قانون سازی کا معاملہ تمام سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ قانون سازی کی قوت خود قوانین وتنظیمات سلطنت کا تعین کرتی ہے۔ برخلاف اسکے تمام دوسری طاقتیں نافذ الوقت قوانین وتنظیمات کے موافق مختص بدیہی اور تغیر پذیر حالات کے اندر کام کرتی ہیں۔ قوت وضع قوانین کل مجموعے کے مستقل تعلقات کی ترتیب کرتی ہے اور دوسری قوتیں بالعموم ایک خاص مقصد کے لئے کام میں لائی جاتی ہیں اور کل قوم پر اثر نہیں ڈالتیں۔ لیکن جب تک واضع قوانین جماعت کے حقوق کا تعین نہ ہو جائے اُسوقت تک ان دوسری قوتوں کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔

قانون سازی کی قوت صرف حقوق کے عام قواعد یعنی مخصوص الاثر قوانین ہی کا تعین نہیں کرتی بلکہ سلطنت کے تنظیمات کا قائم کرنا اور اُنکا بدلنا بھی اُس سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر وہ موازنۂ مابعد کے عام اقتصادی انتظامات پر نظر ڈالتی ہے، اگر وہ اصول نہیں بلکہ مطالبات کی منظوری دیتی ہے، اگر وہ ملک کے واقعی حالات سے بحث کرتی ہے تو یہ سب اس لئے ہے کہ ان کا تعلق تمام سلطنت سے ہے گو کہ وہ صحیح معنی میں قوانین نہیں ہیں۔

روسو اور اشٹائن کی رائے پر تنقید

روسو قانون سازی اور انتظام کے تعلقات کی توضیح اس طرح کرتا ہے کہ اُن میں وہی فرق ہے جو فرق علم النفس کی رو سے آزادی و قوت میں ہے۔ وضع قانون، ارادۂ عام کا اظہار ہے اور انتظام حکومت کے مخصوص افعال پر شامل ہے۔ "قانون قوم کا ہے عمل بادشاہ کا ہے" لورینٹس فون اشٹائن بھی اسی امتیاز کو تسلیم کرتا ہے، لیکن قوت قانون سازی کے لئے قوانین وتنظیمات کی ضرورت پر عمیق نظر ڈالنا بھی انکے اجرائی قوت آزادی سے کم ضروری نہیں ہے اور دوسری طرف حکومت جو اپنی حکمت عملی کی غایت و ذرائع کا انتخاب کرتی ہے، اُسکے افعال بھی قوت آزادی کے لحاظ سے کم درجے پر نہیں ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ یہ فرق، عام و خاص آزادی یا ایک قائم شدہ نظم اور وقتی کام کے الفاظ سے ظاہر کیا جائے۔

چونکہ کل اپنے ہر ایک جزو یا عضو سے زیادہ ہے، اس لئے قوت قانون سازی تمام دوسری مختص قوتوں سے بالاتر ہے۔

(ب) سلطنت کی دوسری طاقتیں

جدید سلطنتوں میں یہ قوتیں چار مجموعوں میں تقسیم کیجا سکتی ہیں جن کے خصوصیات قطعاً

ایک دوسرے سے الگ ہیں ان میں سے دو سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ بلند تر
(۱) حکومت یا انتظام اور (۲) قوت عدالتی ہیں -

(۱) حکومت یا انتظام - اسکے لئے بالعموم قوت عاملانہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے مگر یہ لفظ نہایت ہی ناموزوں ہے اور اس سے بہت سی لغزشیں پیش آتی، اصول میں غلط فہمیاں اور عمل میں خطائیں واقع ہوتی ہیں۔ اس سے نہ تو حکومت کی اصلی حقیقت ظاہر ہوتی ہے اور نہ وضع قانون اور عدالتی اختیار سے اسکے تعلقات کا اظہار ہوتا ہے -

ایک شخص خود اپنے فیصلے کو یا دوسرے کے حکم و فرمان کو عمل میں لاسکتا ہے، مگر ہر حال میں تعمیل دوسرے درجے پر ہے، فیصلہ یا حکم مقدم شئے ہے لیکن حکومت کے فرائض فی نفسہ مقدم (یا اولین) حیثیت رکھتے ہیں۔ حکومت تجویز اور فیصلہ کرتی ہے، رائے قائم کرتی ہے، اپنی مرضی کا اظہار کرتی ہے۔ کسی کام کا حکم دیتی یا کسی کام سے منع کرتی ہے اور بیشتر حالات میں اُسکے احکام کی تعمیل بغیر کسی عاملانہ جبر کے ہوتی ہے۔ عموماً حکومت کی طرف سے محض ایک اعلان کافی ہوتا ہے اور اسکے احکام کی تعمیل ہوجاتی ہے لیکن جب جبر کی ضرورت لاحق ہو تو یہ بھی بے شبہہ حکومت ہی کا کام ہے مگر چونکہ یہ دوسرے درجے پر ہے اس لئے یہ بالعموم ماتحت عمال، مثلاً پولس وغیرہ کے ذریعے سے عمل میں لایا جاتا ہے۔

اگر دوسروں کے ارادے سے بحث ہو تو بھی لفظ عاملانہ درست نہیں ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ قانون جن امور کو عمومی حیثیت سے قرار دیتا ہے، حکومت انھیں امور کو انفرادی حیثیت سے عمل میں لاتی ہے۔ عموماً قانون عمل میں نہیں لایا جاتا بلکہ اسکا اطلاق اور اسکی پابندی ہوتی ہے۔ کسی قانون کا اعلام اور اُسکا عمل میں لانا ایک ہی شئے نہیں ہیں۔ واضع قوانین، جن قواعد کو منظور کرتا ہے، جن اُصولوں کو وہ ظاہر کرتا ہے، حکومت اپنی کارروائیوں کے قانونی اور آئینی حدود کے طور پر اُنکا احترام کرتی ہے مگر اُن حدود کے اندر وہ خود آزادانہ فیصلے کرتی، دوسری سلطنتوں سے معاملات طے کرتی تحقیقات کیلئے کمیشن مقرر کرتی، قیام امن کیلئے جن کارروائیوں کی ضرورت سمجھتی ہے اُنھیں اختیار کرتی، کارکنوں کا تقرر اور فوج کی نگرانی کرتی ہے، یہ اصطلاح انتظام کرشوالی حکومت اور عدالتوں کے باہمی تعلقات کے لحاظ سے اور بھی کم قابل اطلاق ہے، کسی فیصلے کا عمل میں لانا خود عدالتی قوت کا فعل ہے، کیونکہ انصاف کا انتظام کرنا، زائل شدہ حقوق کا بحال کرنا،

(۱) حکومت یا
اصطلاح قوت
کی تنقید -

اُسی کا کام ہے، اور جب تک خود اُسکی قوت ناکافی نہ ہو جائے اُسوقت تک اُسے حکومت کی قوی تر قوت سے امداد لینے کی ضرورت نہیں ہے، ان دونوں قوتوں کے تعلقات ایسے نہیں ہیں جیسے ایک آقا اور غلام کے ہوتے ہیں۔

حکومت کا اصل الاصول

پس حکومت کا اصل الاصول یہ ہے کہ اُسے یہ اختیار ہو کہ مخصوص حالات میں جو کچھ قرین انصاف یا مفید ہو اُسکا حکم دے سکے۔ اس میں یہ قوت ہو کہ ملک اور قوم کو خاص حملوں اور خطروں سے محفوظ رکھ سکے، ملک اور قوم کی نیابت کر سکے اور اُنھیں عام خرابیوں سے بچا سکے، حکومت وہی چیز ہے جسے یونانی "ارخے"[عہ] اور رومی "امپے ریئم" کہتے تھے اور جسے جرمانی زمانۂ وسطی میں "ولایت" اور "فوگٹائی" (Vogtei[عہ]) کا نام دیا گیا تھا۔ سلطنت کی تمام دوسری جزوی طاقتوں کے مقابلے میں حکومت کارفرما اور بلاشبہہ سب سے بلند طاقت ہے کیونکہ دوسروں سے اُسکا تعلق ایسا ہے جیسا کہ سر کا تعلق جسم کے دوسرے اعضا سے ہے جس شئے کو نیابتی قوت کہتے ہیں وہ بھی اُسی کے اندر داخل ہے۔

سلطنت کی عام کارروائی کی مناسبت سے اُسے "حکومت سیاسی" اور جزئیات کے لحاظ سے "انتظام" کہتے ہیں۔

(۲) قوت عدالتی

عدالتی قوت اکثر فیصلہ کرنیوالی قوت سمجھی جاتی ہے اور یہ غلط بحث فرانسیسی (اور انگریزی) اصطلاح یعنی (قوت انصاف) کے لفظ سے پیدا ہوئی ہے لیکن قوت عدالتی کا اصل الاصول فیصلہ کرنا نہیں بلکہ قانون کے حکم کا معین کرنا ہے (اہل روما اُسے انصاف In jure کہتے تھے In judicio نہیں بلکہ معدلت گستری) فیصلے کا مفہوم اگر یہ ہو کہ خاص حالات میں انصاف کا تعین کر کے اُسکا اعلان کیا جائے تو یہ لازمی طور پر حکومت کا کام نہیں ہے نہ اسے اختیار عامہ کا عمل درآمد کہہ سکتے ہیں۔ روما میں عام طور پر یہ کام ججوں کے بجائے غیر سرکاری اشخاص کو اور ازمنۂ وسطیٰ میں جرمانیا میں ایسسروں کو

---

عہ یونانی میں اس لفظ کے معنی ہیں (۱) آغاز، اصل، ابتدا، عنصر؛ (۲) پیشروی، حکومت، اقتدار اعلیٰ؛ (۳) ملک، قلمرو جس پر حکومت کی جائے۔ ع۔ ص۔

عہ بیلف کی خدمت یا وہ رقبہ جو اُسکے تحت ہو۔ بیلف کو جرمانی زبان میں "فوگٹ" (Vogt) کہتے ہیں۔ ع۔ ص۔

سپرد ہوتا تھا۔ موجودہ زمانے میں یہ کام اکثر عام جوریوں کے سپرد ہوتا ہے۔ برخلاف اسکے قانون کا قائم رکھنا، افراد اور قوم کے حقوق کی حفاظت کرنا، ہمیشہ حاکمانہ یا ناظمانہ فرض سمجھا گیا ہے۔

قوت عدالتی اور حکومت میں ایک حقیقی فرق یہ ہے کہ ثانی الذکر کی طرح اول الذکر کارفرمائی سے واسطہ نہیں رکھتی بلکہ وہ صرف انھیں قوانین کی حفاظت کرتی اور انھیں کو نافذ کرتی ہے جو پہلے سے تسلیم کئے جاچکے ہیں۔ حکومت کے فرائض انسان کے ذہنی قویٰ کے مانند قرار دئے جاسکتے ہیں اور قوائے عدالتی کے فرائض کو ضمیر کہہ سکتے ہیں۔

جدید زمانے کی سلطنتوں میں حکومت اور عدالت کے اختیارات کی علٰحدگی ایک بہت ہی اہم سیاسی ترقی ہے۔ قدیم زمانے اور ازمنہ وسطیٰ میں ایک ہی حاکم دونوں فرائض کو انجام دیتا تھا۔ اس تغیر سے انصاف کی بے لوثی اور اہل ملک کی آزادی کو فائدہ پہنچا ہے اور حکومت کے وقار میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔[1] تجربے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ

---

[1] اس موقع پر واشنگٹن کی ۱۷۹۶ء کی حیرت انگیز الوداعی تقریر کے ان الفاظ کو دیکھنا چاہئے۔ "یہ بھی ایک اہم امر ہے کہ ایک آزاد ملک میں جن لوگوں کو سلطنت کا نظم ونسق سپرد ہو وہ اپنی قوت متخیلہ سے کام لینے میں احتیاط برتیں اور اپنے اپنے آئینی حدود کے اندر رہیں اور اس سے بچتے رہیں کہ ایک محکمہ دوسرے محکمے کے اختیارات میں دخل دے، اس قسم کی دخلندازی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام محکموں کی قوت ایک محکمے میں جمع ہوجاتی ہے، اور حکومت کی شکل جو کچھ بھی ہو مگر حقیقتاً مطلق العنانی پیدا ہوجاتی ہے، انسان کے دل میں حصول قوت کا جو شوق اور پھر اُسے خراب کرنیکا جو میلان طبعاً موجود ہے، بس اُسکا صحیح اندازہ ہی کرلینا اس رائے کی صداقت کے تسلیم کرنیکے لئے کافی ہے۔ سیاسی قوت کو مختلف حصوں میں تقسیم کرکے اور اُسے مختلف لوگوں کے سپرد کرکے ہر ایک کو دوسروں کی دراندازی کے خلاف بہبود عام کا محافظ بنادینے سے جس طرح ایک دوسرے پر روک پیدا ہوجاتی ہے اُسکی ضرورت گزشتہ اور موجودہ تجربوں سے ثابت ہوچکی ہے، ان میں سے بعض تجربے ہمارے ہی ملک میں خود ہمارے ہی آنکھوں کے سامنے ہوئے ہیں، پس ان تفاریق کا قائم کرنا جس قدر ضروری ہے اُسی قدر اُنکا محفوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔"

بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کوئی ممتاز مدبر، یا حکومت کا کوئی فرد (عامل) اچھا جج بھی رہا ہو اور یہی حال اسکے عکس کا ہے۔ عدالتی قوت اگرچہ حکومت سے آزاد ہوتی ہے مگر جس طرح دل، سر کے تابع ہے اسی طرح عدالتی قوت بھی حکومت کے ماتحت ہوتی ہے۔

دوسری طاقتیں

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ کے فرائض انھیں تین تقسیموں پر ختم ہو گئے ہیں اور آسانی سے یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ کس طرح پر حال کے نظامہائے سلطنت نے انھیں تین پر حصر کیا ہے لیکن زیادہ دقتِ نظر سے کام لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اعضائے فرائض کے دو اور مجموعے بھی ہیں اور وہ دونوں اگرچہ حکومت کے تابع ہیں مگر پھر بھی وہ اُس سے ممیز ہیں کیونکہ وہ تحکم و فرمان کے (جو حکومت کی شرط لازمی ہے) بہت کم متحمل ہو سکتے ہیں یہ دونوں مجموعے حسب ذیل ہیں:۔

ذہنی اور مادی مقاصد کی نگرانی۔

(۳) تمدن کے ذہنی عناصر اور سلطنتی تہذیب کی نگرانی اور خبرگیری۔
(۴) سلطنت کے مادّی اغراض (یعنی اقتصادیات) کا انتظام اور اُنکی خبرگیری۔

ان دونوں اصناف میں حکمرانی کا کوئی سوال نہیں ہے، انسانی تہذیب کے بڑے اجزا یعنی مذہب اور علوم و فنون کہیں بھی سلطنت کی قوت عمل سے متعلق نہیں ہیں اور نہ سلطنت اُنکو متعین اور پورا کر سکتی ہے۔ چنانچہ مذہب اور علوم و فنون کے خارجی تنظیمات یعنی گرجے اور مدرسے سے بھی اصولاً سلطنت کو وہ واسطہ نہیں ہے جو خود اسکے حدود خاص میں حاکم و محکوم کے درمیان ہے۔ اس قسم کے معاملات میں بھی سلطنت کا کام اتنا ہی ہے کہ وہ نفع عام کی معاون ہو اور حیات عامہ کو مضرتوں سے محفوظ رکھے مگر وہ جانتی ہے اور متواتر اُسکو توجہ دلائی جاتی رہتی ہے کہ ان چیزوں کی اصل اُسکی قلمرو سے باہر ہے اس لئے ان امور میں سلطنت کے فرائض صرف نگرانی اور مربیانہ خبرگیری تک محدود ہیں۔ سلطنت کے امر و نہی کو یہاں کچھ دخل نہیں۔

ایسا ہی حال چوتھی صنف یعنی اقتصادیات عامہ کا ہے۔ سلطنت کے مداخل و مخارج کا نظم و نسق، اہل ملک کے کاروبار اور اُنکی اقتصادی بہبود کو تقویت دینا، منافع عامہ کے کاموں کا اہتمام کرنا، مقامی حکومتوں کی نگرانی کرنا، ان سب چیزوں کی مخصوص علت محرکہ سچ پوچھو تو یہ نہیں ہے کہ اقتدار کا نفاذ ہو بلکہ جس طرح تمدنی معاملات کے لئے ذہنی ترقی کی خبرگیری لازم ہے اُسی طرح اقتصادی معاملات کے لئے مادّی مقاصد کی پیروی۔ اقتصادی

انتظامات میں سلطنت کی تحکمانہ خصوصیت کو گویا دخل ہی نہیں ہے، بلکہ اُس سے کہیں زیادہ ان انتظامات کی بنیاد اہل فن کے علم اور تجربے پر ہوتی ہے۔ پس سلطنت کی کارروائی جس حد تک اس معاملے میں ایک جج کے شخص کے مشابہ ہو جاتی ہے اُس قدر کسی اور معاملے میں نہیں ہوتی۔ سلطنت کے املاک کی خرید و فروخت، اسی طرح ہو سکتی ہے جیسے جج کے اشخاص کے املاک کی ہوتی ہے۔ قوم کی مادی بہبود، وہ وسیع بنیاد ہے جس پر سلطنت کا مدار کار ہے اور اگرچہ سیاسی ہستی کے لئے یہ ایک لازمی شرط ہے مگر بنیاد ہونے کے اعتبار سے وہ سب سے نیچے اور حکومت سب سے بلند جگہ پر رہتی ہے۔

سلطنت کے فرائض کا یہ امتیاز صرف حال کے زمانے میں بتدریج تسلیم کیا جانے لگا ہے مگر ہنوز تحکم اور مربیانہ سرپرستی میں ایسا خلط ملط ہے کہ اُس سے بہت سی خرابیاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ بعض وقت ایسے کاموں کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے جن کے لئے صرف رہبری یا نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض وقت مستعدانہ و تحکمانہ عمل کے موقع پر ڈرتے ڈرتے مدد یا نگرانی کی جاتی ہے لیکن با ایں ہمہ سو بلکہ پچاس برس پیشتر جو حالت تھی اُس سے اب بہت بہتر حالت ہے اور بہت سے تنظیمات حکومت کے براہ راست انتظام سے علیحدہ کئے جا چکے ہیں اور اُنکے انتظام میں جبر و زور کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ وہ علمی اور فنی حیثیت سے قوم کی بہبود اور آزادی دونوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عمل میں آتے ہیں۔

---

# آٹھواں باب

## خدمات عامہ اور فرائضِ عامہ

خدمات عامہ کا وسیع اور محدود مفہوم

۱۔ سلطنت جو کچھ خدمت لے، یا برضا و رغبت سلطنت کی جو کچھ بھی خدمت کیجائے وسیع معنی میں یہ سب "خدماتِ عامہ" میں داخل ہے، اس میں سپاہی، جوری (پنچ) وکلائے قوم اور ابتدائی اور ثانوی انتخاب کنندے سب داخل ہیں۔ لیکن صحیح مفہوم میں یہ سب کے سب خدماتِ عام میں شامل نہیں ہیں۔ خدمات عامہ کے مفہوم میں یہ مضمر ہے کہ خاص طور پر وہ کام کسی کے تفویض کیا جائے یا بالتخصیص کوئی اس پر مامور کیا جائے۔ مذہبی حلقوں، کنیساؤں اور دوسری جماعتوں کے کارکن سلطنت کے ملازم نہیں ہیں۔ اُنکی خدمت عام ضرور ہے مگر سلطنت نے اُس خدمت کو اُن پر عائد نہیں کیا ہے اور نہ اُن کا تعلق براہ راست سلطنت سے ہے[۱]

سلطنت کا سرتاج اس اعتبار سے کہ وہ خود ہی صاحبِ اقتدارِ اعلیٰ اور وہی تمام خدمات عامہ کا منبع ہے، ملازمانِ عامہ (سرکاری) میں داخل نہیں ہے، پھر بھی فریڈرک اعظم کا یہ کہنا صحیح تھا کہ بادشاہ سلطنت کا خادمِ اول ہے، کیونکہ اُسکا منصب ہی نظام سلطنت پر مبنی ہے اور اُسکا وجود تمامتر سلطنت ہی کی خدمت کے لئے ہے۔

(۲) تمام سرکاری ملازم سلطنت کے عہدہ دار نہیں ہیں۔

۲۔ محدود معنی میں تمام سرکاری خدمات، فرائض عامہ میں داخل نہیں ہیں اور نہ تمام سرکاری ملازم نظام سلطنت کے عہدہ دار ہیں۔ جسم سیاسی (جماعت عامہ) میں سلطنت کا عہدہ ایک خاص عضو کی حیثیت رکھتا ہے اور اسکے اپنے مخصوص فرائض ہیں۔

ہر ایک فرض عامہ، مخصوص اغراض کے لئے محدود ہے اور عہدہ دار کی ذات اس فرض کی انجام دینے والی ہے، وسیع مفہوم میں سلطنت کے عمال یا کارکن وہ سرکاری ملازم ہیں جو اپنے لئے سرتاج سلطنت کی ماتحتی اور دقعت کو تسلیم ضرور کرتے ہیں مگر وہ

---

[۱] خاص خاص فرائض عامہ ان لوگوں کو سپرد کئے جاسکتے ہیں مگر اس سے انکی اصلی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اپنے عہدوں کے کاموں کو خود اپنی رائے سے انجام دیتے ہیں۔ محدود مفہوم میں یوں کہنا چاہئے کہ یہ وہ افراد ہیں جنھیں خود حکم دینے کا اختیار ہوتا ہے اور یہ اُن لوگوں سے علیحدہ ہیں جنھیں اس قسم کا اقتدار و اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کو پرانے رواج کے مطابق منتظم عامہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ پروفیسر، سرکاری مدرسوں کے معلّم، عام شفاخانوں کے نگرانکار اور طبیب، سرکاری انجنیر اور خزانچی، ناظم املاک شاہی وغیرہ کے ایسے اکثر عہدہ دار اس صنف میں داخل ہیں۔

انتظامی اور عہدہ داروں

صحیح معنی میں کارکنانِ سلطنت وہ لوگ ہیں جو انتظامی یا عدالتی کاموں پر متعین ہوں اول الذکر اقتدار و اختیار سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے حدود اختیار کے اندر جس کام کو رعایا کے لئے مفید سمجھتے ہیں اُسکا حکم دیتے ہیں مگر اُنکا انحصار بالاتر عہدہ داروں پر ہوتا ہے اور وہ اُنکے ہدایات کے تابع ہوتے ہیں۔ برخلاف اسکے، عدالتی عہدہ دار یہ نہیں کر سکتے کہ خود اُنکی رائے میں مفاد عامہ کے لئے جو کام مناسب معلوم ہو اُس پر عمل کریں، وہ مجبور ہیں کہ قانون کو علی حالہ تسلیم کر کے اُس پر کاربند ہوں اور مقررہ قواعد کے بموجب اُسے نافذ کریں۔ مگر اس کام میں وہ خود اپنے فہم و ادراک کے تابع ہیں، حکومت کے خاص احکام کے پابند نہیں ہیں۔ معمولی حالات میں اول الذکر کارکنوں کا میلان، آزادی کی طرف اور ثانی الذکر کا رجحان، استحفاظ کی طرف ہوتا ہے۔

۳۔ سلطنت کے ملازموں اور عہدہ داروں کے مددگاروں کو سلطنت کے ان دونوں قسم کے کارکنوں سے ممیز رکھنا چاہئے۔ ان لوگوں کے ملازم سرکاری ہونے میں کوئی شک نہیں مگر انکا کوئی خاص منصب نہیں ہوتا، نہ انھیں کسی قسم کا اقتدار یا آزادانہ اختیار حاصل ہوتا ہے۔ وہ محض ان عہدہ داروں کے مددگار ہیں جنکی ماتحتی میں وہ کام کرتے ہیں۔ اس زمرے میں، محرر، مفتش، محصّل وغیرہ داخل ہیں۔ چونکہ یہ لوگ سلطنت کے ایک عضو کے طور پر کام کرتے ہیں اس لئے انکا شمار سرکاری ملازموں میں ہے، خاصکر ایسی صورت میں کہ وہ دماغی کام انجام دیتے ہوں گو کہ یہ دماغی کام نہایت بلند درجہ کا نہ ہو، لیکن اگر یہ وصف بھی نہ ہو اور محض دستی خدمت مدنظر ہو تو ایسے لوگ سلطنت کے کام میں ہونے پر بھی سرکاری ملازم نہیں کہے جاسکتے۔ اُنکے لئے زیادہ موزوں یہ ہے کہ انھیں سلطنت کا شخصی یا خانگی ملازم کہئے۔ ہرکارے، دربان، عصابردار، اہل پولس، نقیب، وغیرہ

اسی زمرے میں داخل ہیں۔ اُنکی حالت، خدمات عامہ کے اعلیٰ شرائط کے بجائے شخصی قانون کے تابع ہوتی ہے۔

ملکی اور فوجی عہدوں میں فرق۔

۴۔ ملکی اور فوجی فرائض میں سب سے اول شہنشاہ قسطنطین اعظم نے صاف طور پر فرق قائم کیا اور نئے زمانے کی سلطنت میں اس فرق کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔ فوج میں صرف عہدہ دار ہی خدام عامہ سمجھے جاسکتے ہیں کیونکہ احکام کا تعلق صرف انھیں سے ہوتا ہے۔ باقی تمام سپاہی ایک عام ملکی فرض انجام دیتے ہیں یا ایک شخص معاہد کے طور پر اپنی خوشی سے فوج میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ملکی اور فوجی عہدہ داروں میں خاص امتیاز یہ ہوتا ہے کہ آخر الذکر میں انضباط زیادہ سخت ہوتا ہے اور فوجی اطاعت اُن پر لازم ہوتی ہے لیکن ایک حد تک اس امتیاز کی وجہ یہ بھی ہے کہ فوجی عہدہ داروں کو اختیارات، بالواسطہ حاصل ہوتے ہیں، کیونکہ اُن کا کام عاملانہ ہے اور یہ کام بالطبع دوسرے درجہ پر ہے۔

اجتماعی اور انفرادی عہدوں کا فرق

۵۔ اجتماعی اور انفرادی عہدوں میں بھی ایک طرح کا فرق قائم کیا گیا ہے۔ اول الذکر جس میں بہت سے اشخاص داخل ہوتے ہیں اور جو غور و بحث کے بعد کثرت رائے سے فیصلہ کرتے ہیں۔ صلاح اور مشورے کیلئے زیادہ مناسب ہیں اور ثانی الذکر عمل کیلئے موزوں ہیں۔ بعض وقت اجتماعی غور و بحث اور انفرادی فیصلہ ایک ساتھ ملا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر ایک وزیر دوسرے وزیر کی رائے لیکر خود فیصلہ کرتا ہے۔

جائے عمل کے اعتبار سے عہدوں میں امتیاز

علاوہ اسکے، اعلیٰ اور ادنے ہونیکے لحاظ سے اور جائے عمل کے اعتبار سے بھی عہدوں میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ عہدے مرکزی بھی ہوتے ہیں، درمیانی بھی ہوتے ہیں، جن کا تعلق صوبوں، حکموں اور ضلعوں سے ہوتا ہے اور سب سے کمتر درجے میں مقامی یا مواضعاتی عہدے ہوتے ہیں۔ بعض وقت یہ عہدے متوازی العمل بھی ہوتے ہیں۔ یعنی متعدد عہدہ دار ایک ہی حد کے اندر ایک ہی اختیار، عمل میں لاتے ہیں مگر ہر عہدہ دار بطور خود اُس پر عمل کرتا ہے۔ اسکی مثال قدیم روما کے حکام اور انگلستان کے ناظمان امن ہیں۔

عہدے میں کیا کیا امور شامل ہیں۔

۶۔ عہدے میں بالعموم حسب ذیل چیزیں شامل ہوتی ہیں:-

(الف) اختیارات عامہ اور فرائض عامہ کی ایک مخصوص نوعیت اور انکا ایک معین دائرۂ عمل جسے "حدود اختیار" کہتے ہیں۔

(ب) ایک مرکز یا معین مقام جسے "عہدے کا مستقر" کہتے ہیں اور جہاں بیٹھکر عہدے کا کاروبار عمل میں آتا ہے۔ جو عہدہ دار گشت کرتے رہتے ہیں اُنکے لئے بھی ایک مستقر ضرور ہوتا ہے۔

(ج) عہدے کی وسعت عملی کیلئے ایک حدِ ارضی (یعنی حلقے یا "گزر") کا ہونا۔

سلطنت اور اُسکے ملازموں کے باہمی تعلقات

۷۔ سلطنت اور اُسکے ملازموں کے باہمی تعلقات کا معاملہ شخصی قانون سے متعلق نہیں ہے جیساکہ پہلے لوگوں نے خیال کیا تھا بلکہ یہ ایک خالص سیاسی نوعیت کا معاملہ ہے۔ سلطنت کی خدمت محض ماموری یا حکم برداری نہیں ہے اور اُسے اُجرتی خدمت کہنا تو اور بھی بیجا ہے۔ شخصی قواعد کے معاہدے سے سرکاری ملازموں کے تقرر، اختیارات اور برطرفی کی تشریح نہیں ہوتی۔

سرکاری ملازموں کے تقرر کی بنیاد ایک باضابطہ حکمنامے پر ہوتی ہے جسے سلطنت اپنے ارادے سے عوام کے نفع کیلئے جاری کرتی ہے[1]۔ لوگوں نے اس کارروائی کو "قانون خاص" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے مگر اس لفظ کا ترک بہتر ہے کیونکہ بالعموم تقرر کی کارروائی جماعت واضع قانون

[1] دیکھو گوئنر کی تصنیف: "سلطنت کی ملازمت، قانونی نقطۂ نظر سے" لندس ہوٹ ۱۸۰۸ء اور تسخارے کی کتاب جلد ۲ صفحہ ۲۵ اور آگے۔ اشمٹ ہینر اپنی کتاب "قانون سلطنت" (صفحہ ۵۰۹) میں اُس زمانے کے مقننوں کی حیثیت قانون کے خیال کو تو مسترد کرتا ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ وہ خود اس موقع پر روما کے شخصی قانون کے اصول کو عائد کرنا چاہتا ہے حالانکہ خود اہل روما کو خواب میں بھی یہ خیال نہیں آیا ہوگا کہ اس قانون سے یہ کام لیا جائے گا۔ تاہم اُسکی یہ رائے ہے کہ خدمات عامہ کی بنا معاہدے پر ہے اگرچہ اُس معاہدے کی پابندی لازمی نہیں ہے۔ اس معاہدے کو وہ عہدے پر نصب ہونیکے لئے شرط مقدم قرار دیتا ہے جیسے جاگیر پر قبضہ پانے سے پہلے جاگیری معاہدہ ہوا کرتا تھا مگر یہ غلطی ہے اس قسم کے قبل از نصب معاہدات مستثنیات میں سے ہیں۔ کسی شخص سے یہ استفسار کرنا کہ آیا وہ عہدے کو قبول کرے گا یا نہیں اور اسکا جواب، معاہدہ نہیں قرار دیا جاسکتا یہ ایک موہوم معاہدہ ہوسکتا ہے اور اسکی بھی کوئی دلیل نہیں ہے اگر کسی مستثنیٰ صورت میں کوئی معاہدہ ہو بھی تو اس سے صرف فریقین کے شخصی حقوق پر اثر پڑتا ہے، حقوق عامہ پر اثر نہیں پڑتا اور اسلئے یہاں اس بحث کرنیکی کوئی ضرورت نہیں ہے اسمیں شک نہیں کہ نامزدگی کے قبول کرنے یا اُس سے انکار کرنیکا حق حاصل ہے مگر اس سے اُس حکم کی قطعی اور موثر حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

کی طرف سے عمل میں نہیں آتی بلکہ بادشاہیوں میں بادشاہ کی جانب سے عمل میں آتی ہے اور جمہوریتوں میں کبھی حکومت کی طرف سے اور کبھی عام انتخاب کے ذریعے سے عمل میں لائی جاتی ہے۔ یہ حکم سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کے ارادے کا یکطرفہ فعل ہے بلکہ جن مستثنیٰ حالتوں میں واقعی معاہدہ بھی ہو، جیسے غیر ملکیوں کے خدمات کے حصول میں ہوتا ہے، وہاں بھی یہ کارروائی یکطرفہ ہی سمجھی جاتی ہے۔ اگر نامزدگی کے بعد سلطنت کی طرف سے تقرر عمل میں نہ آئے تو اس قسم کا معاہدہ کسی کو بجبر مقرر کرانے کے لئے عدالتی کارروائی کی بنا نہیں قرار پاسکتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ نقصانات کا مطالبہ کیا جائے جیسا کہ شخصی معاہدہ میں ہوتا ہے۔

خدمات عامہ کے فرائض کا تعین سلطنت کی طرف سے ہوتا ہے اور یہ فرائض عام اور منتظم نوعیت کے ہوتے ہیں۔ عہدے کا قیام سلطنت کی ضروریات کیلئے ہوتا ہے، اُس شخص کے لئے نہیں ہوتا جو اُس پر فائز ہو اس لئے عہدہ نہ کسی خاص شخص کی ملک ہوسکتا ہے اور نہ لوگوں کے لئے حصول زر کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ جہاں کہیں یہ حالت ہوتی ہے (جیسی کہ ازمنۂ وسطیٰ میں عام طور پر اور فرانس میں بعد کو بھی ہوتی رہی)۔ وہاں اس حالت میں سلطنت کیلئے شخصی قانون کے حدود سے نکلنا دشوار ہوجاتا ہے اور اور یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ سلطنت کو ابھی اپنی سیاسی ہستی کا پوری طرح احساس نہیں ہوا ہے۔

۸۔ عہدے کیلئے جو مواجبہ معین ہوتا ہے وہ البتہ ایک ایسا عنصر ہے جسکا واسطہ شخصی قانون سے ہے کیونکہ حقیقتاً اس مواجبے کی غرض یہ ہے کہ عہدہ دار اور اسکے خاندان کے معاشی ضروریات پورے ہوں اور چونکہ عہدہ دار سلطنت کی خدمت بجالاتا ہے اس لئے وہ حق رکھتا ہے کہ سلطنت سے اپنی زندگی کے اخراجات طلب کرے۔ اس قسم کے مطالبوں کی حیثیت سیاسی نہیں ہے بلکہ وہ ایک مالکانہ حق کی سی نوعیت رکھتے ہیں۔ پس مواجبہ کے دعووں کا فیصلہ ایک ملکی جج (یا حاکم دیوانی) بخوبی کرسکتا ہے۔

مگر اس عنصر سے عہدے کی نوعیت عامہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہر زمانے میں ایسے غیر تنخواہ دار یعنی اعزازی عہدہ دار بھی ہوتے رہے ہیں جنکی اہمیت جماعت سیاسیہ میں باقاعدہ تنخواہ دار عہدہ داروں کے مثل رہی ہے۔ انگلستان کے ناظمان امن بلاشبہہ سلطنت کے ویسے ہی عہدہ دار ہیں جیسے پروسیا کے تنخواہ دار صوبہ دار، جو کوتوالی کے خدمات بھی انجام دیتے ہیں۔

# نواں باب

## عہدہ داروں کا تقرر

موروثی عہدے

۱۔ ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کے ہر ملک میں جس طرح موروثی عہدے قائم ہو گئے تھے اب جدید سیاسیات میں ویسے ہی ہمہ گیر طور پر وہ مردود قرار پا رہے ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ موروثی عہدے اپنی اپنی جگہ پر با اقتدار ہو گئے تھے اور اس طرح اُن عہدوں نے سلطنت کی وحدت اور اسکے نظم عمل کو برباد کر دیا تھا۔ علاوہ اسکے ارثیت شخصی قابلیت کی ضامن نہیں ہو سکتی۔

زمانۂ حال کی سلطنتوں میں بھی مستثنیٰ طور پر موروثی عہدے ہوتے ہیں، مگر یہ عہدے بالعموم اعزاز کے طور پر ہوتے ہیں اُنکے ساتھ کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ مثلاً دربار سے متعلق وہ عہدے جو ازمنۂ وسطیٰ سے چلے آرہے ہیں۔

توظیفی اور اعزازی عہدوں کا فرق

۲۔ توظیفی اور اعزازی عہدوں کا فرق اس سے زیادہ اہم ہے۔ توظیفی عہدے میں انسان اپنی تمام قوت صرف کر دیتا ہے اور وہی اُسکا ذریعۂ معاش ہو جاتا ہے۔ اُسکے لئے مختص معلومات کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس اُسکے حاصل کرنیکے لئے اس کے حسب ضرورت تعلیم، امیدواری اور امتحاناً کام کرنیکی حاجت ہے۔ پس اس قسم کے عہدوں کے لئے مواجبے کا ہونا ضروری ہے۔

برخلاف اسکے اعزازی عہدے کے فرائض صرف وقتاً فوقتاً انجام دینا ہوتے ہیں اور اس لئے ایسے خدمات کو وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو اپنا ذاتی کاروبار بجائے خود کرتے ہوں۔ جیسے زمیندار تاجر وغیرہ اور اُن کا ذریعۂ معاش ان کا پیشہ یا ذاتی دولت ہوتی ہے۔ جوری (پنچ) کی خدمت انجام دینا یا نیابتی مجلسوں میں شریک ہونا اسی قسم کے فرائض ہیں جو اس طریقے پر انجام پا سکتے ہیں۔ بظاہر سوسائٹی کا ذی ثروت طبقہ ہی اس قسم کے عہدوں کا کام انجام دے سکتا ہے۔ عوام الناس یا تو تعلیم یافتہ نہیں ہوتے یا اُنکے پاس وقت نہیں ہوتا یا دونوں کی کمی ہوتی ہے۔

جدید سلطنتوں میں توظیفی عہدے، زیادہ اہم ہیں مگر اکثر حالات میں دونوں قسموں کے فوائد متحد کئے جا سکتے ہیں۔ نیابتی اور خود اختیاری حکومتوں میں یہ مواقع ہیں کہ توظیفی عہدہ داروں کی ہدایات کے ساتھ نیابتی اعزازی عہدہ داروں کی مدد بھی شامل کرلیجائے۔

چنانچہ پروشیا میں صوبہ دار کو صوبے کے ارکان کے ساتھ ملادیا ہے۔ بیڈن (بادن) میں ضلع کا پریفکٹ ضلع کے اعزازی ارکان کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ توظیفی جج، جوری اور اسیسر کے ساتھ شریک کردئے گئے ہیں۔

جرمانیا کے عہدہ دار

۳۔ جرمانیا کی سلطنتیں اگرچہ اکثر اعتبار سے سیاسی ترقی میں انگلستان اور فرانس سے پیچھے ہیں مگر وہ اپنے قابل تعریف توظیفی عہدوں کے انتظام میں سب سے آگے ہیں۔ جرمانی طریق کے موافق عہدہ داروں کے ایک لائق اور قابل اطمینان گروہ کی موجودگی یقینی ہے اس طریقے کے اُصول یہ ہیں:۔

(الف) عہدے اُن تمام لوگوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں جن میں اُن عہدوں کے کام کو سرانجام دینے کی قابلیت موجود ہو۔ غریب طلبہ کی امداد کے لئے بہ کثرت وظائف اور اوقاف موجود ہیں مگر فی الاصل زیادہ حصہ ایسے خاندان کے لوگوں کا ہوتا ہے جن میں خود تعلیم کا معیار بلند ہوتا ہے اور وہ خاندانی اخلاق و تربیت کا اثر گھر سے اپنے ساتھ لاتے ہیں اور پھر اُسکا اثر ملازمت کی عام سطح کے بلند کرنے پر پڑتا ہے۔

(ب) بالعموم سرکاری ملازمت کے امیدواروں کے لئے، یہ لازم ہے کہ اُنھوں نے کسی فوقانی مدرسے اور یونیورسٹی میں قدیم ادبیات (یعنی لاتینی اور یونانی) کی تعلیم پائی ہو، ہندسی اور فن تعمیر وغیرہ کے ایسے فنی (ٹکنکل) عہدوں کے لئے مذکورۂ بالا تعلیم کے بجائے عام فنی مدرسوں یا ہندسی مدرسوں کی تعلیم درکار ہوتی ہے۔ نصاب تعلیم کے ختم کرنیکے بعد ایک سرکاری امتحان ہوتا ہے جرمانی یونیورسٹیوں میں علمی روح جاری و ساری ہے وہ اس امر کی مانع ہے کہ تعلیم کی ہمت، کسی خاص پیشے کی عملی تیاری تک محدود کردی جائے اور اُسکی کوشش اسی میں صرف ہو کہ قوانین اور اصول کی گہری معرفت حاصل کیجائے۔ اس طرح پر چینی حکام کے طرز تربیت کے نقائص ترقی پذیر علمی کاموں کے ذریعے سے رفع ہو جاتے ہیں اور سلطنت اور سوسائٹی کو اس بات کی ضمانت ملجاتی ہے کہ اُسکے عہدہ داروں کی ابتدائی تربیت نہایت اچھی ہوگی۔ امتحان کی شرط فریقانہ طرفداری

یا منافرت کا اور درباری سازشوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتی ہے، امتیازی قابلیت رکھنے والے نوجوانوں کے لئے میدان عمل کی راہ کو کھول دیتی ہے اور سخت پیروی کرنیوالے مگر نااہل امیدواروں کو، چاہے وہ کیسی ہی بڑی بڑی سفارشیں یا اثرات رکھتے ہوں پیچھے ہٹا دیتی ہے۔

البتہ اس طریقے پر محض علمی خیال سے آنکھ بند کر کے عمل نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ سلطنت کو لازم ہے کہ چند مناسب مستثنیات کو بھی جگہ دے اور یہ استثنا صرف اُن بغیر ملکیوں ہی کے حق میں نہ ہو جنکی قابلیت بغیر کسی سرکاری امتحان میں شریک ہوئے ظاہر ہو چکی ہو بلکہ اُن ملکیوں کے حق میں بھی ہو جو اپنی قابلیت کے باعث ممتاز ہوں۔ خصوصاً وہی لوگ جن کو قسّام ازل نے نہایت اعلیٰ قابلیتوں سے مالا مال کیا ہے، شارع عام کو چھوڑ کر اپنے لئے ایک نیا راستہ نکال لیتے ہیں اس لئے یہ سخت دیوانگی ہوگی کہ سلطنت اُن کی قابلیتوں سے متمتع ہونے سے ہاتھ دھو بیٹھے، صرف اس بنا پر کہ وہ اُس عام راستے پر نہیں چلے جو پہلے سے بنا دیا گیا تھا گو کہ اُنھوں نے کہیں زیادہ مشکل حالات میں رہ کر اپنی قابلتیوں کو چمکایا ہے۔ اسی کے مصداق وہ عہدے ہیں جنکے لئے اعلیٰ تدبّر اور اعلیٰ علمی قابلیت درکار ہے جیسے وزرا اور مشیران سلطنت یا یونیورسٹیوں کے اساتذہ۔ ایسے مستثنیات کا قائم کرنا آسان ہے اور اس میں یہ خوف ہرگز نہیں کہ عام قاعدہ جو مقرر کیا گیا ہے وہ ٹوٹ جائے گا۔

(ج) نظری (یا علمی) امتحان کے بعد عملی امتحان ہوتا ہے یعنی امیدوار کو کسی عہدہ دار یا قانون پیشہ کے تحت میں کام کرنا ہوتا ہے۔ اس امیدواری کے زمانے کے ختم ہو چکنے کے بعد اور امیدوار کو کوئی عہدہ ملنے سے پہلے بالعموم اُسے ایک اور امتحان دینا ہوتا ہے تاکہ یہ اطمینان ہو جائے کہ اب وہ پختہ کار ہو چکا ہے اور اُسے سلطنت کا کوئی عہدہ دیا جا سکتا ہے۔

(د) جو لوگ ان شرائط کو پورا کرتے ہیں سلطنت اُن میں سے خود اپنی ضرورت کے موافق اُنکا تقرر کرتی ہے۔

اسکے بعد سے ملازموں کو اُنکے زمانۂ ملازمت اور ثبوت قابلیت کے موافق تدریجاً ترقی دیجاتی ہے۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک معین ترتیب کے ساتھ اعزاز، منصب، اور معاوضے میں ترقی دیجائے۔ یہ اصول اکثر و بیشتر تو درست ثابت ہوتا ہے مگر اُس پر نہایت

سمجھ بوجھ کر اور چند قیود کے ساتھ عمل کرنا چاہئے۔ بلند تر اور بلند ترین عہدے کچھ اس لئے تو ہیں نہیں کہ تھکے ہوئے مضمحل بڈھوں کا آخری نصب العین بنیں۔ پس سرکاری ملازموں کی ترقی کو بندھے ٹکے حسابی گر کی طرح اُنکی مدت ملازمت ہی پر لحاظ کر کے عمل میں نہ لانا چاہئے اصل چیز ہے اُنکے کام کی خوبی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بہت اچھے دماغ والے لوگ جب ایک طویل مدت تک ملازمت کے ادنےٰ درجوں میں رہ کے معمولی کام کی چکی میں پڑ جاتے ہیں تو اعلیٰ مدارج پر پہنچنے کے زمانے تک اُنکی کارآمد قوتیں مفلوج اور مردہ ہو جاتی ہیں حالانکہ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب کہ اُن سے بہترین دماغی قابلیتوں کی توقع کیجاتی ہے۔ اس غلط طرز عمل کا ذمہ دار وہ نظام نہیں ہے جس نے ملازموں کی ترقی کے ضابطے کو مقرر کیا ہے بلکہ ارباب دفاتر کے کورانہ طرز عمل سے یہ نوبت آجاتی ہے۔ جو سیاسی عہدے سب سے بلند ہوتے ہیں اُنھیں کے لئے سب سے زیادہ ضرورت اسکی ہے کہ اُن پر ایسے لوگ مامور ہوں جنکی قوتوں میں کسی طرح کی کمی یا خرابی نہ آئی ہو۔ چہ جائے کہ ایسے اہم عہدے فرتوت بڈھوں کے لئے وقف ہو جائیں۔ پس اعلیٰ عہدوں کے لئے قدامت ملازمت بہت کم صورتوں میں دلیل راہ بنادی جاسکتی ہے۔

(ھ) سلطنت جو مواجب عطا کرتی ہے اُس سے عہدہ دار کو اپنی حالت کے موافق اپنی اور اپنے اہل وعیال کی گزر اوقات کی طرف سے اطمینان ہو جاتا ہے۔ اگر تجارت کی آمدنی سے مقابلہ کیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ اکثر جرمانی عہدہ داروں کو بہت کم معاوضہ دیا جاتا ہے مگر اسکے ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ تجارتی نفع نقصان کی غیر متیقن کیفیتوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ اور اگر اپنے مواجب کو کفایت شعاری کے ساتھ اور کوئی اور ذاتی املاک ہو تو اسکے ساتھ ملا کر کام میں لائیں تو معقول طور سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اگر بے شمار توظیفی عہدوں کے بجائے کچھ عہدے اعزازی کر دئے جائیں تو توظیفی عہدوں کے معاوضے میں ترقی ہو سکتی ہے۔

(و) جرمانی عہدہ دار کو کچھ حقوق عامہ (Pragmatio rights) بھی حاصل ہوتے ہیں یعنی ایک مقررہ تنخواہ پانیکا اور جب سلطنت کو اُسکی خدمت کی ضرورت باقی نہ رہے یا جب وہ خود عمر یا بیماری کی وجہ سے کام کے قابل نہ رہے تو وظیفہ پانے کا اُسے قانونی حق ہوتا ہے۔

اس طریق میں جرمانی عہدہ دار یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ایک قابل اطمینان اور قابل عزت حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی قوت اجتماعی کے احساس کے ساتھ ایک حقیقی پیشہ ور جماعت کی ہیئت اختیار کر لیتے ہیں اور انھیں سیاسی قوت کی بھی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ سلطنت کے سرتاج اور رعایا کے نمایندوں کو بھی انھیں میں شامل کرنا پڑتا ہے اور ان لوگوں کو انکے اتحاد عمل کے بغیر مفر نہیں۔

انگلستان کے عہدہ دار

۴۔ انگریزی طریقہ اس سے بالکل مختلف ہے، صوبوں میں پولس کا انتظام اور اختیار غیر تنخواہ دار کارکنوں کو سپرد ہوتا ہے جو طبقۂ امرا سے لئے جاتے ہیں۔ وزرا مستقل عہدہ داروں کے طبقے سے نہیں لئے جاتے بلکہ پارلیمنٹ کے فریقوں میں سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ ملکی عہدوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا تقرر فریقانہ اثر سے ہوتا ہے اور اُن میں سابقہ اہلیت کا کچھ لحاظ نہیں کیا جاتا بلکہ صرف پارلیمنٹ کے ذی اثر ارکان کی سرپرستی اور سفارش سے یہ تقررات عمل میں آتے ہیں۔

لیکن اب انگلستان تک میں امیدواروں کے امتحان لینے کی ضرورت بہ نسبت سابق کے زیادہ محسوس ہوتی جاتی ہے۔ اعلی عدالتی عہدوں کے لئے ایک طویل زمانہ کی قانونی تعلیم کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ تعلیم یونیورسٹیوں میں نہیں ہوتی بلکہ "انز آف کورٹ" میں اور پیشے کے عملی تجربے سے حاصل ہوتی ہے۔ اکثر خصوصی اور فنی عہدوں کیلئے بھی اب امتحان کی ضرورت ہوتی ہے۔ نااہل لوگ خارج کر دئے جاتے ہیں اور مربیانہ اور فریقانہ اثر کم ہوتا جاتا ہے۔ وزارت کے تغیر سے صرف ساٹھ جگہوں پر اثر پڑتا ہے جن میں کچھ تو اعلی سیاسی عہدے ہیں اور کچھ دربار سے متعلق عہدے ہیں۔

ممالک متحدہ ام
کے عہدہ دار

۵۔ ممالک متحدہ کا طریقہ ابتداءً انگریزی طریقے پر مبنی تھا مگر اُسکا عملدرآمد جمہوری اور عمومی انداز پر ہوتا تھا۔ اینڈریو جیکسن کے عہد صدارت میں تغیر کامل کا خطرناک طریقہ جاری ہوا جسے "طریق غنایم" کہنا چاہئے۔ کسی نئے صدر جمہوریہ کے انتخاب پر یعنی ہر چوتھے یا کم سے کم ہر آٹھویں برس، اگر کوئی دوسرا فریق برسر اقتدار ہو جائے تو عہدوں کی ایک کثیر تعداد خالی ہو جاتی ہے اور نئے لوگوں سے معمور کیجاتی ہے۔ اس لئے عہدوں کے حصول کا ایک عام خبط پیدا ہو جاتا ہے اور فریقانہ خواہشوں کے مقابلے میں سلطنت اور سوسائٹی کے اغراض کا بہت کم خیال کیا جاتا ہے۔ پس اس طرح عہدہ داروں کا تمام طبقہ غیر متیقن حالت

اور شدید تغیرات کے خدشے میں رہا کرتا ہے اور اس حالت میں رشوت خواری اور خرابیوں کا روکنا مشکل ہوتا ہے۔ صرف ججوں کی حالت بہتر ہے اور چونکہ عادتاً تجربہ کار وکلا میں سے اُن کا انتخاب ہوتا ہے اسلئے اُنکی قانونی مہارت اور قابلیت کی طرف سے اطمینان ہوتا ہے۔

فرانس کے عہدہ دار

۶ - فرانس میں عہدہ داروں کا ایک طبقہ تو ہے مگر اُنکو بہ حیثیت مجموعی جرمانیا کے عہدہ داروں کی سی آزادی ہے اس لئے کہ سلطنت کے سرتاج یعنی موجود الوقت وزارت کو عہدہ داروں کے تقرر اور برطرفی کا اختیار نسبتاً زیادہ حاصل ہوتا ہے اور نہ اُنکی علمی قابلیت ویسی اطمینانی ہوتی ہے۔ البتہ اکثر فنی اور خصوصی عہدوں کیلئے خاص مدرسوں (یعنی مدارس فنون۔ فوجی تعلیمی مدارس) کی خاص تعلیم کی شرط ہے عدالتی فرائض کیلئے یونیورسٹی کی تعلیم درکار ہے مگر اس قاعدے پر اُس وسعت اور کثرت کے ساتھ عمل نہیں ہوتا جیساکہ جرمانیا میں ہوتا ہے۔ عہدہ دار کا انحصار حکومت پر زیادہ ہوتا ہے عہدے اور سلطنت کی وفاشعاری کے بجائے فریقانہ وفاشعاری کا زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔

جمہوری سلطنتوں میں تقرر بالعموم ایک معین زمانے کیلئے ہوتا ہے

۷ - قدیم زمانے کی جمہوری سلطنتوں میں اور کسی قدر اس زمانے کی جمہوری سلطنتوں میں بھی یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ عہدہ داروں کا تقرر ایک معین مدت اور عموماً چند برسوں کے لئے ہوتا ہے کہیں دوبارہ مقرر ہونیکا امکان رہتا ہے اور کہیں یہ امکان بھی نہیں ہوتا۔ سوئزرلینڈ اور امریکہ وغیرہ میں یہی طریقہ جاری ہے۔ مقامی عہدوں کے لئے یہ طریقہ بخوبی کام دے سکتا ہے کیونکہ اُن عہدوں کے لئے بالعموم زیادہ تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اُس میں کسی شخص کو اپنی پوری قوت صرف کرنیکی ضرورت ہو، مگر جب سلطنت کے عہدوں کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جہاں اس زمانہ کے اعلیٰ ترقی یافتہ ضروریات کے لحاظ سے ایک مدت دراز کی فنی تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے، تو اس سے سخت نقصانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس طریقے میں بکثرت تغیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذاتی حرص وطمع اور فریقانہ سازشوں کے پورا کرنیکا موقع ملتا ہے۔ کارکنوں کو طمانیت نہیں رہتی اور سیاسی کاموں کی پائداری اور استقامت کم ہوجاتی ہے۔ ان نقصانات کے مقابلے میں یہ نفع کوئی چیز نہیں ہے، کہ اس طریقے سے نالائق عہدہ دار اور وہ لوگ جنھوں نے عوام کا اعتماد کھو دیا ہے آسانی کے ساتھ خارج کئے جا سکتے ہیں۔ یہ طریقہ اعیانی حکومت میں اس قدر خطرناک نہیں ہے کیونکہ فطرتاً اسکا میلان استقامت

اور اعتدال کی طرف ہوتا ہے لیکن عمومی حکومت میں یہ زیادہ خطرناک ہوجاتا ہے کیونکہ اس طریق حکومت میں تغیرات کا شوق زیادہ ہوتا ہے اور محض اسی وجہ سے اس کا رجحان کم مدت کے طریقے کی طرف ہوتا ہے ۔ علاوہ اس کے یہ بھی اندیشہ رہتا ہے کہ نہایت اعلیٰ قابلیت کے لوگوں کے خدمات سے سلطنت محروم ہوجائے اور اسکی وجہ یا تو عوام کی خود رائی اور کج فہمی ہوتی ہے یا یہ کہ خود یہ لوگ اس سے زیادہ قابل اطمینان طریق زندگی کو ترجیح دیتے ہیں ۔

عہدے کے قبول کرنے یا اس سے انکار کرنیکی آزادی

۸ ۔ جو شخص کسی عہدے پر مقرر کیا جائے اُس کے قبول کرنے یا اس سے انکار کرنیکے متعلق اُسے آزادی حاصل ہونا چاہئے ۔ اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ سلطنت کی خدمت کی بنیاد معاہدے پر ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ دماغی کام کے لئے قطعی مجبوری کا عاید کرنا دشوار ہے اور ضمنی مجبوری حصول مقصد کے لئے ناکافی ہوتی ہے ۔ تمام مفید کاموں کی انجام دہی کے لئے شخصی آزادی پہلی شرط ہے ۔ کوئی باشندۂ ملک اس امر پر مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ دوسرے کی بہ نسبت زیادہ ایثار کرے ۔ اس زمانے کی تمام سلطنتوں میں خواہ جمہوری ہوں یا شاہی یہ اصول مسلم ہے ۔ مقامی عہدے اس سے مستثنیٰ ہیں ۔ اُن کی تعداد کی کثرت اور کام کی قلت کی وجہ سے ہر باشندے پر اُنکی انجام دہی کا ایک عام فرض عاید ہوجاتا ہے [۱]

تقرر کی ابتدا کس وقت سے ہوتی ہے

یہ سوال معرض بحث میں رہا ہے کہ تقرر کی ابتدا کس وقت سے ہوتی ہے اگر ہم اس امر کا خیال رکھیں کہ تقرر صرف سلطنت کی یکطرفہ کارروائی ہے تو ہم بلا تردد اسکا جواب یہ دے سکتے ہیں کہ جس وقت سے یہ کارروائی عام کردیجائے یعنی درج ہوجائے اور اس پر دستخط ہوجائیں اُسی وقت سے تقرر ہوجاتا ہے ۔ نامزد شدہ شخص کو اس کی اطلاع دینا اور بعد میں اُسکو عہدے پر نصب کرنا یہ سب کامل نامزدگی کے نتائج مابعد ہیں [۲]

[۱] اسکی مثال وہ شہر ہیں جو سلطنت بن گئے ہیں ۔ جیسے کہ "شہنشاہی" کے آزاد شہر تھے یا جہاں نظام سلطنت اس قدر سادہ ہوتا ہے کہ اُسکی حالت ایک ضلع یا قصبے کی حکومت کی سی ہوتی ہے جیسے اپنٹ سل کے کنٹوں کی حالت ہے ۔

[۲] اس مبحث پر صدر جمہوریہ جفرسن اور ممالک متحدہ کی عدالت عالیہ کے درمیان تنازعہ ہوچکا ہے

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ۔ (اسٹوری جلد سوم صفحہ ۲۷) جفرسن کا دعوے یہ تھا کہ نامزدگی سے عہدہ دار کو کوئی حق نہیں پیدا ہوتا جب تک کہ حکم نامزدگی اُسے نہ مل جائے۔ عدالت عالیہ کی رائے یہ تھی کہ محض نامزدگی بھی اس اعتبار سے اثر پذیر ہے کہ جس حکومت نے نامزدگی کی ہے وہ اُسے ساقط کرنیکا حق نہیں رکھتی۔

تسنخارے کا خیال یہ ہے کہ نامزدگی کا اثر قانونی نتائج تک محدود ہے (دیکھو تسنخارے کی کتاب فقرہ ۱۳۶) مگر یہ تحدید نہ تو ضروری ہے اور نہ صحیح ہے۔ نامزدگی کا اثر محض شخصی معاہدے کے طور پر نہیں بلکہ سلطنت کے فعل عامہ کے طور پر ہے اور اگرچہ عہدے پر نصب ہونیکے وقت تک اختیارات عمل میں نہیں لائے جا سکتے مگر اُن اختیارات کے عمل میں لانیکا حق پہلے ہی سے قائم ہو جاتا ہے۔

# دسواں باب

## سرکاری عہدہ داروں کے حقوق اور فرائض

۱۔ سب سے مقدم یہ ہے کہ عہدہ دار کو اپنے فرائض منصبی کے انجام دینے کا حق ہوتا ہے۔ اسے عہدہ دار کا حق قانونی یا اُسکا قانونی حیطۂ اقتدار کہتے ہیں، اور اسکا تعلق تمامتر مفاد عامہ سے ہے۔ اسکے ساتھ یہ فرض بھی مستقلاً وابستہ ہے کہ عہدہ دار اپنے عہدے کے کارہائے منصبی کو اسی طرح انجام دے جس طرح ہونا چاہئے۔ پس اس حق قانونی کا عمل میں لانا نہ لانا عہدہ دار کی شخصی مرضی پر منحصر نہیں ہے۔ سلطنت یہ حق اُسکو اس لئے نہیں دیتی کہ جو اُسکا جی چاہے کرے بلکہ اس لئے کہ وہ خدمت عامہ کا انصرام کرے۔ اسی سبب سے عہدہ دار کو سلطنت سے یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ دوامًا اور ذاتی حیثیت سے اپنے عہدے کے دائرۂ عمل کی وسعت یا اپنی سرکاری کارگزاری کی نوعیت کو معین کرے۔ بلکہ ان دونوں باتوں میں وہ قانون کے اُن احکام کا (جنکی رو سے اُسکے عمل کی وسعت اور طرز کارگزاری میں رد و بدل لازم آتی ہے) اور حکام بالادست کی ہدایتوں کا تابع ہے، چاہے یہ چیزیں اُسکی ذاتی مرضی کے خلاف ہی ہوں۔ پس اُسکے ذمے نئے کام بھی عائد کئے جاسکتے ہیں اور اُسے اُن سے انکار کرنیکی قدرت نہیں۔ البتہ یہ نئے کام بھی وہی ہونگے جو اسکے عہدے سے متعلق ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ عہدوں کی ہستی اور اُن کی نوعیت کلیۃً سلطنت سے متعلق ہے اور اس وجہ سے عہدے کا حق اور عہدے کے فرائض بھی سلطنت ہی کے تابع ہیں۔

۲۔ عہدہ دار کو اُسکے عہدے کے لقب اور درجے کا شخصی حق حاصل تو ہوتا ہے مگر اس حق کی بنا بھی سیاسی اغراض پر ہوتی ہے اور بذریعۂ قانون اُس میں ترمیم کیجا سکتی ہے۔ اسکے ساتھ ہی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی سابق عہدہ دار کا لقب اور درجہ اُسکے شخصی حق کے طور پر قائم رہے۔

۳۔ اغراض سلطنت کے لئے جو اخراجات پیش آئیں یا جو نقصانات برداشت کئے جائیں اُنکے معاوضے کا حق خالصًا شخصی قانون سے تعلق رکھتا ہے اور اس معاملے میں تنخواہدار

اور غیر تنخواہدار دونوں عہدہ داریکساں ہیں۔

تنخواہ۔ (مواجب)

۴۔ لیکن خود خدمات کے معاوضے کا حق اسی کے شامل نہیں ہے۔ اسکا انحصار سلطنت کی رائے پر ہے کہ کسی خاص عہدے کیلئے تنخواہ ہونا چاہئے یا نہیں۔ جس عہدہ دار کو تنخواہ ملتی ہو وہ اپنی تنخواہ کے متعلق شخصی قانون کے حقوق کا تابع ہے۔

یہ ہوسکتا ہے کہ اکثر جرمانی سلطنتوں کی طرح عہدہ داروں کے معاوضے میں امتیاز قائم کردیا جائے۔ یعنی (۱) ایک معاوضہ درجے کا ہو اور (۲) ایک معاوضہ خدمت کا۔ سلطنت کا یہ فرض ہے اور اسکے اغراض کیلئے یہ ضروری ہے کہ جن عہدہ داروں کے پورے وقت اور قابلیت سے وہ کام لیتی ہو اُنکے حسب حال اُنکی گزر اوقات کا سامان کرے لیکن اسکے علاوہ کچھ اخراجات ایسے بھی ہیں جو عہدے کے فرائض ادا کرنے میں لازمی طور پر پیش آتے ہیں یا اُن فرائض سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ امتیاز ان عہدہ داروں کے معاملے میں خاص اہمیت رکھتا ہے جو عملی خدمات سے کنارہ کشی اختیار کرنیوالے ہوں۔ سابق الذکر قسم کے معاوضے کے متعلق اُنکا حق قائم رہتا ہے لیکن موخر الذکر قسم کے معاوضے کے متعلق اُنکا کوئی حق نہیں رہتا۔ اول الذکر ایک بڑی حد تک شخصی قانون کا معاملہ ہے اور موخر الذکر فرائض عامہ کے عملدرآمد سے تعلق رکھتا ہے۔ جن خاص عہدوں کے ساتھ خاص معاوضے یا رسوم وغیرہ شامل ہوتے ہیں وہ آخر الذکر قسم میں سمجھے جاتے ہیں، خواہ اسکا تعلق عہدہ داروں کی مستقل آمدنی ہی سے کیوں نہ ہو۔ سلطنت کو اختیار ہے کہ اس قسم کے رسوم میں تغیر کردے۔ رسوم کی کمی کی تلافی کے لئے اگر معینہ تنخواہ میں اضافہ کردیا جائے تو یہ ایک رعایت ہے ورنہ اس قسم کی تلافی کیلئے کوئی قانونی حق نہیں ہے۔

وظیفۂ تقاعد

وظیفۂ تقاعد کا حق اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ عہدہ دار اگر بغیر اپنے کسی قصور کے عہدے سے ہٹنے پر مجبور ہو تو اُسے اپنی تنخواہ کے متعلق شخصی قانون کے موافق حق حاصل ہوتا ہے۔ وظیفے کا تناسب تنخواہ گزر اوقات کے موافق ہونا چاہئے اور اگر اس قسم کا کوئی امتیاز باضابطہ تسلیم کیا گیا ہو تو وظیفے کے معین کرتے وقت عہدے کے اصلی اخراجات کو وضع کرلینا چاہئے۔ مناسب یہ ہے کہ وظائف کی مقدار اور شرطیں از روئے قانون قطعی طور پر معین کردیجائیں تاکہ کسی قسم کی آزادی رائے سے کام لینے کی ضرورت نہ پڑے۔ وظائف کے عام دستور سے خزانے پر بہت بڑا بار پڑجاتا ہے لیکن سلطنت کو پورا وقت

دینے والے عہدہ داروں کی ضرورت ہو تو پھر اس بار کے برداشت کرنیکے لئے کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ تجارت وحرفت کی آمدنی کے مقابلے میں سرکاری عہدہ داروں کی تنخواہیں اکثر حالتوں میں بہت کم ہوتی ہیں اور ذہنی قابلیت وتعلیم کی انھیں زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس لئے سلطنت کا یہ فرض ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی اسکے لئے وقف کردیتے ہیں انھیں احتیاج کی طرف سے مستغنی کردے۔ اس خرچ کا معاوضہ عوام کو اس طرح ملجاتا ہے کہ بہتر لوگ ملازمت میں داخل ہوجاتے ہیں اور رشوت لینے کی طمع باقی نہیں رہتی۔

سلطنت کے ملازموں کی بیواؤں اور اُنکے یتیم بچوں کو وظیفے کا کوئی قانونی حق نہیں ہوتا۔ تنخواہ موروثی نہیں ہوتی۔ بہت سی سلطنتوں میں یہ عمدہ انتظام جاری ہے کہ وظیفہ کا ایک عام سرمایہ ہوتا ہے اور اسکا قیام زیادہ تر عہدہ داروں کی تنخواہوں کی وضعات پر ہوتا ہے۔

عہدہ دار[...] کے فرائ[...]

۶۔ عہدہ داروں کے فرائض زیادہ تر اُنکے حقوق کے تابع ہوتے ہیں علاوہ اسکے اُن پر اپنے سے اعلیٰ عہدہ داروں کی اطاعت بھی لازم ہوتی ہے۔ سلطنت کے سرتاج اور قوم کے ساتھ انھیں وفاشعاری برتنا پڑتی اور ضرورت ہو تو رازداری کی پابندی بھی کرنا پڑتی ہے۔ عام طور پر عہدے کے لئے جو حلف لیا جاتا ہے اُس سے یہ ذمہ داری پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس سے یہ ذمہ داری مضبوط ہوجاتی ہے۔ یہ عہدہ دار کے فرائض کی کوئی شرط نہیں ہے نہ اس سے فرائض پر کسی قسم کا اثر پڑتا ہے۔

اطاع[...]

مختلف کاموں کی نوعیت کے اعتبار سے اطاعت کی حالت بھی بدلتی رہتی ہے انتظامی اور عدالتی کارکنوں کے لئے اسکی حیثیت مختلف ہوتی ہے۔ بظاہر موخر الذکر کو فی الجملہ آزادانہ حیثیت حاصل ہونا چاہئے مگر اول الذکر بھی اطاعت مطلق یا غلامانہ اطاعت پر مجبور نہیں ہیں۔ قانون واخلاق دونوں طریقوں سے ایک حد معین ہوجاتی ہے۔

خاص خاص صورتوں میں اطاعت کی حد معین کرنا بڑا مشکل مسئلہ ہوجاتا ہے۔

(الف) عہدہ دار یہ کرسکتا ہے کہ اُسے جو حکم دیا جائے اُسکی نسبت وہ یہ دیکھے کہ وہ حسب ضابطہ ہے یا نہیں، یعنی بالادست عہدہ دار کو اپنے عہدے کے اعتبار سے اس حکم کے دینے کا حق ہے یا اس نے محض اپنی ذاتی رائے سے حکم دیدیا ہے۔

نیز یہ کہ اس حکم کی تعمیل خود اُسکے اختیار کے اندر ہے یا نہیں ۔ علاوہ اسکے جس حکم کے لئے دستخط کی ضرورت ہوتی ہے اگر اُس پر دستخط نہ ہوں تو وہ اسکی تعمیل سے انکار کرسکتا ہے۔ وہ سرکاری کارکن ہے کوئی خانگی ملازم نہیں ہے اور اس لئے اُسے یہ حق ہے کہ وہ احکام کے حسب قانون ہونیکے لئے اُنکی نوعیت پر غور کرے ۔

اگر اس قسم کی تحقیق کا سوال مشتبہ ہو اور عہدہ دار بالادست یہ تصدیق کرے کہ اُسے حکم دینے کا حق ہے تو عہدہ دار ماتحت کے لئے اطاعت لازم ہے ۔ اُسکا حق بلکہ اُسکا فرض جو کچھ ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے شکوک کو اپنے بالادست کے سامنے بیان کردے اور دوبارہ حکم دئے جانیکا انتظار کرے ۔

(ب) کسی حالت میں کوئی عہدہ دار اس قسم کی اطاعت پر مجبور نہیں ہے جس سے مذہب و اخلاق کے اعلیٰ اصول شکست ہوتے ہوں، یا جس سے وہ خود کسی جرم میں شریک ہو جاتا ہو ۔ اس قسم کے کام ہرگز اُسکے عہدے کے فرائض میں داخل نہیں ہو سکتے ۔ کسی عہدہ دار سے یہ توقع نہیں کیجاسکتی کہ وہ ایسے کام انجام دیگا جسے دوسرا شخص انسانیت کے خیال سے یا صاحب مذہب، مذہب کے خیال سے یا ایک معمولی شہری ملک کے تعزیری قانون کے لحاظ سے اسکی انجام دہی سے انکار کردیگا (الف)

(ج) ایک ماتحت عہدہ دار کسی ایسے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کرسکتا جسے وہ اپنی

---

(الف) اس موقع پر یقیناً ایک فرد واحد کے اخلاق اور اسکے عہدے کے قانونی فرض میں خلط مبحث ہو گیا ہے ۔ حامی کمالات، ہونے کی حیثیت سے حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اخلاق کا احترام کرے مگر کسی عہدہ دار کا یہ حق نہیں ہوسکتا کہ وہ قانونی اور آئینی وجوہ کے سوا کسی اور وجہ سے مقاومت کرسکے ۔ یہ یقینی ہے کہ اُس سے یہ خواہش نہیں کیجاسکتی کہ وہ ملک کے فوجداری یا دیوانی قانون کی خلاف ورزی کرے لیکن اگر کوئی ایسا حکم دیا جائے جو اسکے مذہب یا اُسکے اخلاق کے مغائر ہو تو وہ یہ نہیں کرسکتا کہ صرف اس بنا پر اس حکم کی تعمیل بھی نہ کرے اور اپنے عہدے پر بھی قائم رہے ۔ آگے کے فقرات (ج) و (د) میں اس امر کو صحیح طور پر بیان کیا ہے مگر بلنچلی نے جو کچھ یہاں بیان کیا ہے اس میں اور مذکورۂ بالا فقروں میں تناقض معلوم ہوتا ہے ۔ انگریزی مترجم)

رائے میں خلاف قانون یا نامناسب سمجھتا ہو، وہ اس معاملے میں صرف اپنے بالادست کے سامنے عذر پیش کر سکتا ہے، اُسے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اُسکے بالادست کی غرض یہ نہیں ہوسکتی کہ وہ قانون کی خلاف ورزی کرے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اُس نے کسی خاص معاملے میں کافی غور نہ کیا ہو اور ممکن ہے کہ ماتحت کی ادب اور صاف دلی کے ساتھ ظاہر کی ہوئی رائے کو سنکر وہ اپنے فیصلے میں ترمیم کردے۔ کسی عہدہ دار کو اپنے بالادست اور اپنی سلطنت کو لغزشوں سے بچانے میں کوتاہی نہ کرنا چاہئے لیکن اگر افسر بالادست اپنے احکام پر مصر ہو تو ماتحت پر اطاعت لازم ہے اور ذمہ داری بالادست پر عائد ہوتی ہے۔ بہ خلاف اسکے اگر ماتحتوں کو مقاومت کا اختیار دیدیا جاوے تو سلطنت کی وحدت عمل برباد ہو جائے گی، اسکی قوت مفلوج ہو جائیگی اور قانون کی ایک منفرد خلاف ورزی کی بہ نسبت جسکا ذمہ دار بالادست افسر ہے کہیں زیادہ مذموم نتائج پیدا ہونگے۔

لہ اکثر نظامہائے سلطنت میں یہ اصول واضح طور پر ظاہر کردیا گیا ہے، مثلاً اگست ۱۸۹۳ء کے ہنیوور کے نظام سلطنت کی دفعہ (۱۶۱) میں یہ کہا گیا ہے کہ جو حکم صحیح صورت میں بالادست عہدہ دار کی طرف سے جاری ہوتا ہے اُس سے اس ماتحت عہدہ دار پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جسے وہ حکم دیا جاتا ہے بلکہ اُسکی ذمہ داری اُس بالادست پر عائد ہوتی ہے جو حکم دیتا ہے۔ اسی طرح مائننگن کے نظام سلطنت کی دفعہ ۱۰۴ میں اور آلٹنبرگ کے نظام سلطنت کی دفعہ (۳۷) میں یہ درج ہے کہ ہر ایک خلاف قانون امر کی ذمہ داری اُس شخص پر ہے جو اسکا حکم دے، بالادست عہدہ دار کے احکام کا عذر صرف اس صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے، جب وہ احکام صحیح صورت میں نافذ ہوں اور اُنکا نافذ کرنیوالا اُنکا اختیار رکھتا ہو، اس صورت میں وہی اُن احکام کا ذمہ دار ہوجاتا ہے جس نے اُنکو جاری کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گونیئر (اپنی کتاب محولۂ بالا کے فقرۂ ۹۷ میں) "شرف اطاعت" کے معنی یہی سمجھا ہے گو کہ اس میں شک نہیں کہ اُس نے عہدہ دار کو ایک "کل" فرض کرکے اپنے استدلال کی بنا کو کمزور کردیا ہے، اسلئے کہ وہ غیر واجبی احکام کے خلاف عذر کرنیکے فرض کو تسلیم کرتا اور اطاعت کے فرض کو صورت اور معنیٰ دونوں کے لحاظ سے محدود کرتا ہے (دیکھو اُس کی کتاب صفحہ ۲۰۸) اسکے علاوہ اس سلسلے میں جو "کل" کا لفظ استعمال ہوا ہے اُس سے رہبانیت کی سی بو آتی ہے۔ (اس نہایت معرکۃ الآرا مسئلے پر دیکھو شلٹسے کا جرمانی قانون سلطنت، جلد ۱، صفحہ ۳۲۵ اور آگے، لابند کی تصنیف، جلد ۱، صفحہ ۴۴۷ اور آگے لوئننگ کا "قانون نظم و نسق" صفحہ ۱۲۲ اور آگے۔)

یہی حال بالادستوں کے خلافِ آئین احکام کا ہے۔ اُنکی مقادمت کر کے ماتحت کو خود آئینی اطاعت کی خلاف ورزی نہ کرنا چاہئے۔

وفاشعاری

۷۔ وفاشعاری کا خیال فرضِ اطاعت سے آگے بڑھا ہوا ہے۔ عہدہ دار کو جو حکم دیا جائے جب وہ لفظاً و معناً اُسکی تعمیل کر دیتا ہے تو وہ اپنے فرض اطاعت سے سبکدوش ہوجاتا ہے لیکن وفاشعاری کا اثر اُسکے تمام اعمال و افعال پر حاوی ہوتا ہے۔ البتہ اب جاگیرداری طریق کی طرح وفاداری نظم معاشرت کی بنیاد خاص نہیں رہی ہے، کیونکہ عہدہ داروں کے فرائض قانوناً معین ہو گئے ہیں۔ اُنکے کاموں پر بادشاہ کی ذات کی وفاشعاری سے زیادہ سلطنت کی ضروریات کا اثر پڑتا ہے۔ بااین ہمہ ملازمت سرکاری کی یکجہتی اور اُسکے اخلاقی ارتباط کی بنیاد ابھی تک وفاشعاری پر ہے۔

اگر کوئی عہدہ دار ایسے منفرد امور میں جو اہم ہوں اپنے بالادستوں کی رائے کے خلاف رائے رکھتا ہو اور وقت ضرورت اُسکا اظہار بھی کرتا رہتا ہو تو اس سے وفاشعاری کے فرض میں کوئی نقص نہیں عائد ہوگا۔ لیکن اگر وہ مستقل اور اساسی اصولوں میں حکومت سے مختلف الرائے اور اُسکے مخالف ہو، مثلاً شاہی حکومت میں وہ اپنی جمہوریت پسندی کا اظہار کرے اور جمہوری سلطنت کے قیام کے لئے کوشش کرتا ہو یا اسکے برعکس جمہوریت میں شاہی کے لئے کوشاں ہو تو اس سے وفاداری کا رشتہ ٹوٹ جائیگا اور وہ جسم حکومت کا ہم آہنگ عضو نہ رہیگا۔ یہی حال اس عہدہ دار کا ہے جو اُس مخالفت میں باقاعدہ اور مسلسل حصہ لیتا ہو جسکا مقصود حکومت کو پلٹ دینا یا اسکے راستے میں دقت حائل کرنا ہو۔ یہ وفاشعاری کے اس درجہ خلاف ہے کہ کوئی حکومت طوائف الملوکی کی حالت میں پڑے بغیر اسے گوارا نہیں کر سکتی[1]۔ کسی خاص کام میں ترک اطاعت نہ بھی کیجائے تو بھی وزارت سے

---

[1] گینز نے واشنگٹن کی سوانح عمری کے دیباچے میں اُسکا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب تک کہ مہام ملکی کی باگ میرے ہاتھ میں ہے، میں دیدہ و دانستہ کسی اہم جگہ پر ہرگز کسی ایسے شخص کو نہیں مقرر کرونگا۔ جسکے سیاسی خیالات حکومت کی عام روش کے خلاف ہوں۔ میری رائے میں ایسا کرنا ایک طرح کی سیاسی خودکشی ہے۔" اشٹائن کے مندرجۂ ذیل پرزور ملفوظات سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جرمانی مدبروں نے اُن خرابیوں کو کس قدر قوی طور پر محسوس کر لیا ہے جو غیر وفادار عہدہ داروں کے باعث

باقاعدہ مخالفت کرنا، وفاشعاری کے خلاف ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی عہدہ دار بالکل مختلف بلکہ مخالف رائے رکھتا ہو اور اس سے اُسکے عہدے کے فرائض کی بجا آوری میں خلل نہ پڑے مگر اُس پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے عہدے کی حیثیت سے اس قسم کے خیالات کا اظہار نہ کرے۔ اگر وہ ایماناً یہ یقین رکھتا ہے کہ اُسے قولاً و فعلاً اپنی مخالفت کا اظہار کرنا لازم ہے تو اُسے چاہئے کہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ججوں کی حالت زیادہ آزادی کی ہے۔ اُن کا عہدہ سیاسی نوعیت کا نہیں ہوتا اور نہ اُسکا انحصار حکومت کی مرضی پر ہوتا ہے۔

عہدے کی وفاشعاری کا ایک لازمہ یہ بھی ہے کہ اپنی حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی عہدہ دار کسی غیر سلطنت کی نہ تو کوئی خدمت اختیار کرے نہ اسکی طرف سے کوئی اعزاز، وظیفہ یا اس قسم کا کوئی اور امتیاز قبول کرے۔

راز داری

۸۔ سرکاری راز داری جو حسب قاعدہ عہدہ داروں پر فرض ہے اُسے کلّی اور مطلق راز داری نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ اُسکا تعلق اُنھیں امور سے ہے جنکا علم عہدہ دار کو اپنے عہدے کی بدولت حاصل ہوا ہو اور جنکے افشا سے سلطنت یا افراد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو یا کسی اعلیٰ تر فریضے کی بنا پر راز داری ضروری ہو۔ دونوں انتہائی حدوں سے بچنا چاہئے۔ نہ تو خلاف آئین اور خلاف قانون افعال کو چھپانے کے لئے بدنیتی یا تقشف سے پراسرار خاموشی اختیار کرنا چاہئے اور نہ بے سمجھے بوجھے فضول گوئی کرنا چاہئے۔

تادیب و

۹۔ سلطنت کو یہ اختیار ہے کہ جو کارکن اپنے فرائض میں غفلت برتیں یا انکے خلاف عمل کریں، انکی تادیب کرے یا انھیں سزا دے۔ جن جرائم کی تحقیقات اور سزا معمولی عدالتوں میں ہو سکتی ہے انھیں ادائے فرائض کی اُس غفلت سے ممیز کر دینا چاہئے

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ۔ سلطنت میں پیدا ہو جاتی ہیں وہ کہتا ہے کہ "اکثر سرکاری عہدہ داروں کے انداز سے جس قسم کی گستاخی اور دقت کا سامنا ہوتا ہے اسکا انسداد اسکے سوا اور کسی طور پر نہیں ہو سکتا کہ جو لوگ اس طرح پر خطرناک رایوں کی اشاعت کریں یا حکومت کے اقتدار کی بیخ کنی کریں اُن کے خلاف سخت کارروائیاں اختیار کیجائیں اور انھیں فوری بر طرفی قید یا جلا وطنی کی سزا دیجائے"

جس میں عہدہ دار کی طرف سے تادیب کیجاتی ہے۔ اول الذکر کا فیصلہ ملک کے معمولی قانون سے ہوتا ہے اور موخر الذکر کا تصفیہ خصوصیت کے ساتھ مفاد عامہ کے نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے۔ یہ فرق ویسا ہی ہے جیسے عدل واحتساب میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابھی ذکر ہوچکا ہے اول الذکر کے متعلق قانون فوجداری کے موافق کارروائی کیجاتی ہے مگر سلطنت نے خود اپنے مفاد کے خیال سے اُس میں کچھ ترمیمیں کردی ہیں (۱) فرانیسی عملدرآمد کے موافق کسی سرکاری جرم کے لئے کسی عہدہ دار پر فوجداری کا مقدمہ اُسوقت چل سکتا ہے جب حکومت یا کوئی اور صاحب اقتدار جسے خاص طور پر اسکا حق دیا گیا ہو اسکی اجازت دے (۲) عہدہ داروں کے مقدمات کی سماعت کیلئے خاص عدالتیں ہوتی ہیں[1] انگلستان کے عملدرآمد میں یہ دونوں مستثنیات خارج کردئے گئے ہیں مگر وہاں کے اعیانی عہدہ دار بیجا حملوں سے دیگر ذرائع سے محفوظ کردئے گئے ہیں[2] سرکاری تادیب اس سے ایک قدم آگے بڑھی ہوتی ہے اور اُسکا نفاذ اُن صورتوں میں بھی ہوتا ہے جنہیں عام قانون کے

---

[1] جرمانی شہنشاہی قانون نظام عدالت (دفعہ ۱۱) کی رو سے جرمانیا کی مختلف سلطنتوں میں وہ قوانین باقی رہ گئے جو اسے لازم قرار دیتے ہیں کہ کسی عہدہ دار پر اسکے بالواسطہ یا بلاواسطہ دوسرے فرائض کے متعلق اگر کوئی دیوانی یا فوجداری کا مقدمہ قائم کیا جائے تو اُس کے لئے سابقہ فیصلے کی ضرورت ہے، لیکن یہ سابقہ فیصلہ صرف اسی قدر تعین کرتا ہے کہ آیا عہدہ دار نے اپنے عہدے کے امتیازات سے تجاوز کیا ہے یا کوئی فرض جو براہ راست اُس پر عائد تھا اُسے ترک کردیا ہے۔ جن جرمانی سلطنتوں میں اعلیٰ انتظامی عدالت موجود ہے وہاں یہی عدالت اُسکا فیصلہ کرتی ہے اور جہاں اس قسم کی عدالت نہیں موجود ہے وہاں شہنشاہی عدالت میں اُسکا تصفیہ ہوتا ہے۔ پروسیا، بویریا، بیڈن، ہیسن وغیرہ میں اس قسم کے قانون جاری ہیں فرانس میں سابقہ فیصلے کی ضرورت ۱۵ ستمبر ۱۸۷۰ء کے حکم کی رو سے منسوخ کردی گئی ہے۔ سزادہی سے علیحدہ ہوکر عہدہ داروں کی تادیب کے متعلق ان دونوں ملکوں میں بہت ہی مختلف و متغائر خیالات پائے جاتے ہیں۔ دیکھو لوئی ننگ کی محولہ بالا کتاب صفحہ ۱۲۷۔

[2] جمیکا میں حبشیوں کی بغاوت سے یہ ثابت ہوگیا کہ اختیارات کے اس قدر خوفناک طور پر ناجائز استعمال کرنیکے باوجود انگلستان تک میں عہدہ داروں پر کامیابی سے مقدمہ چلانا سخت دشوار ہے۔

بموجب الزام عائد کرنیکی کافی بنا نہیں ہوتی بلکہ ایسی صورتوں میں بھی اُسکا نفاذ ہوتا ہے جب کہ عام قانون کی رو سے ملزم رہا ہو جاتا۔ یہ تادیب کارکن کی ہر قسم کی غلطی اور غفلت پر حاوی ہوتی ہے بلکہ اُسکی خانگی زندگی پر بھی اُس حد تک اثر ہوتا ہے جس حد تک اُس سے عہدے کی عزت و اعتماد کو نقصان پہنچتا ہو[1]۔

تادیبی سزائیں یا تو ہلکی ہوتی ہیں جیسے تنبیہ، ملامت، یا خفیف جرمانہ، یا سخت قسم کی ہوتی ہیں جیسے تنزل، تبادلہ، جبری سبکدوشی، یا برطرفی۔ خفیف قسم کی سزاؤں کا دینا ہر عہدہ دار بالادست کے معمولی اختیارات میں داخل ہے اور اسکے لئے کسی خاص قانونی کارروائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ برخلاف اسکے سخت قسم کی سزاؤں کے لئے قانونی کارروائی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ عہدہ دار کے حقوق بالادست کے اختیار کے مطلق العنانانہ استعمال سے محفوظ رہیں۔ بہت سی سلطنتوں میں برطرفی کی سزا صرف عام قانونی عدالت کے ذریعے سے ہو سکتی ہے، لیکن عام عدالت میں ایسا ہوتا ہے کہ قصور پر شخصی حیثیت سے نظر کیجاتی ہے یعنی عہدہ دار کی شخصی حیثیت کا لحاظ زیادہ کیا جاتا ہے اور اُسکی عہدہ دارانہ حیثیت کا لحاظ کم۔ اس طریق میں عہدہ دار کے مقاصد کو، بروقت، سلطنت اور عہدے کے مستقل مقاصد پر فوقیت حاصل ہو جاتی ہے یعنی افراد کے حقوق کو قوم کے حقوق پر ترجیح دیجاتی ہے۔ جو عدالت اس قسم کی عام اہمیت کے معاملے کا فیصلہ کرنیکے لئے مقرر ہو اسکی ترکیب اس طور پر ہونا چاہئے کہ وہ مشترکہ مقاصد کو کماحقہٗ سمجھنے کی قابلیت رکھتی ہو۔ اگر ایسی عدالت نہ موجود ہو تو نااہل اور ناکارہ عہدہ داروں کی برطرفی کا اختیار حکومت ہی کے اعلیٰ عہدہ داروں کے ہاتھ میں رہنا چاہئے[2]۔

---

[1] جرمانی شہنشاہی عہدہ داروں کا قانون ۱۸۷۳ء دفعہ ۱۰۔

[2] ایضاً دفعہ ۷۶۔

# گیارھواں باب

## سرکاری ملازمت کا ختم ہونا

(۱) کسی عہدے کا اٹھا دیا جانا

عہدے کا قیام عہدہ دار کی ضرورت کے لئے نہیں ہوتا بلکہ عہدہ دار عہدے کے لئے مقرر کیا جاتا ہے۔ پس اگر کوئی عہدہ اُٹھا دیا جائے تو جو شخص اس پر متعین تھا اُسکی عہدہ داری کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ عہدے کی نوعیت اور اسکے قائم رہنے کا فیصلہ صرف مفادِ عامہ کے مصالح پر لحاظ کر کے کیا جاتا ہے لیکن عہدے کے اٹھا دینے سے عہدہ دار کی گزارہ کا حق زائل نہیں ہو جاتا۔ اس حق کو اُس مدت تک کیلئے برقرار سمجھنا چاہئے جو عہدے کے نہ اُٹھائے جانے کی صورت میں عہدہ دار کو ہوتا۔

جس طرح سے کہ کسی عہدے کے قبول کرنے یا اُس سے انکار کرنیکے معاملے میں آزادی ہوتی ہے اسی طرح اب استعفا دینے کے حق کو بھی زمانۂ حال کے قانونِ سلطنت نے تسلیم کرلیا ہے گو یہ ضروری ہے کہ آزادی کی ان دونوں صورتوں کی حالت ایک نہیں ہے کیونکہ کسی ذمہ داری کے قبول کرنیکی آزادی کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اُسے ترک کر دینے کی بھی ویسی ہی آزادی حاصل ہو۔ مگر جہاں شخص کارکن کی دماغی قابلیت اور خوشدلی کی اس قدر شدید ضرورت ہو جیسی کہ خدماتِ عامہ میں ہوتی ہے، وہاں کسی کارکن کو محض جبر سے اُسکی خدمت پر کارگزار رکھنا سلطنت کے لئے سفید مطلب بھی نہیں ہو سکتا[۱] برخلاف اسکے جہاں عہدے کا قبول کرنا ایک لازمی ملکی فرض ہے، وہاں کم از کم ایک معین مدت تک اُس پر قائم رہنا بھی لازمی ہے۔

---

[۱] پروسیا کا قانون یہ ہے کہ "کسی عہدے دار کا استعفا صرف اُس حالت میں نامنظور ہوگا جب کہ اُسکے قبول کرلینے سے مفادِ عامہ کو سخت نقصان ہوتا ہو" بویریا کا قانون یہ ہے کہ ہر شخص اپنی خوشی سے بغیر کسی وجہ کے بیان کئے ہوئے استعفا دے سکتا ہے مگر اس صورت میں وہ اپنی تمام تنخواہ نیز اپنے لقب اور عہدے کے جملہ امتیازوں سے محروم ہو جائیگا۔

(۲) استعفا

استعفےٰ کا محض دیدینا عہدے کے فرائض کو ختم نہیں کر دیتا۔ عہدہ دار اگر
اپنی ہی رائے اور ارادے سے عہدے کو چھوڑ دے تو اُسکا ایسا کرنا خدمت سے فرار ہوجانا
کہا جائیگا۔ استعفا صرف ایک وسیلہ ہے اس تحریک کا کہ سلطنت اُس عہدے کو جو
اس نے عہدہ دار کو عطا کیا تھا اس سے واپس لیلے۔ عہدے کے فرائض اُس وقت تک
ختم نہیں ہوتے۔ جب تک کہ سلطنت استعفے کو قبول نہ کرلے اور پھر بھی یہ اختیار حکام بالادست
کو باقی رہتا ہے کہ وہ ضروریات عامہ پر نظر کرکے سبکدوشی کا ایک وقت معین کریں۔
جب کوئی عہدہ دار معمولی استعفے کی بنا پر سبکدوش کر دیا جائے تو اسکی ملازمت کے
ختم ہوتے ہی وہ تمام شخصی اور سیاسی حقوق بھی ختم ہوجاتے ہیں جو اُسے اُسکے عہدے کی
بنا پر حاصل تھے۔

(۳) کنارہ کش

بہ خلاف اسکے اگر کسی سرکاری ملازم کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ کنارہ کش ملازموں کے
زمرے میں شامل کر دئے جانیکا مطالبہ کرسکے تو اُسکا معاملہ دوسری نوعیت رکھتا ہے ایسی
صورت میں عہدہ دار کے منصبی اختیارات عامہ ختم ہوجاتے ہیں مگر اُسکے ذاتی اعزاز جیسے
خطاب اور مرتبہ زائل نہیں ہوتے اور اُسے بعض رقوم کے پانیکا حق بھی باقی رہتا ہے وظیفۂ تقاعد
کی مقدار بالعموم عمر یا مدت ملازمت کے اعتبار سے مقرر ہوتی ہے۔ وظیفۂ تقاعد کا حق کچھ تو
سن کی زیادتی پر مبنی ہے جس میں طول ملازمت کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے جسکی مدت تیس سے
چالیس برس تک ہوتی ہے اور کچھ صحت کی قبل از وقت خرابی وغیرہ کے باعث کام سے
ناقابل ہوجانے پر منحصر ہے (بویریا میں پیرانہ سالی کی حد ستر برس مقرر کی گئی ہے
اور پروسیا، ورٹمبرگ، سکسونیا، بلجیم میں پینسٹھ برس) آخر الذکر حالت میں وظیفے کا
قانونی حق صرف اُس صورت میں خود بخود پیدا ہوتا ہے، جب کہ خود خدمت کی وجہ سے یہ
نقص پیش آیا ہو، کیونکہ ایسی ہی صورت میں سلطنت کا یہ فرض ہے کہ مفوضہ خدمات عامہ کے
عملدرآمد میں جو نقصانات ملازم کو برداشت کرنا پڑے ہوں اُنکی تلافی کرے۔

(۴) بر

ملازم کی خواہش کے خلاف اُسکی خدمت سے علٰحدگی یعنی برطرفی کے قواعد و ضوابط
موجودہ زمانے میں مختلف سلطنتوں میں مختلف ہیں قدیم جرمانی شہنشاہی (مقدس رومی شہنشاہی)
میں مقننوں کے اثر کی وجہ سے عہدہ داروں کے شخصی حقوق کو بہت بڑی اہمیت حاصل
ہوگئی تھی۔ عہدے کی نسبت یہ خیال تھا کہ وہ ایک حق ہے، جو بالعموم مدت العمر کے لئے

عطا کیا جاتا ہے اور اُسکا واپس لینا صرف حکام سلطنت کی مرضی سے ممکن نہ تھا۔ ایسی علیحدگی کا امکان اُسی حالت میں ہوتا تھا جب ملازم سے ادائے فرض میں خطا ہوئی ہو اور عدالتی فیصلہ اُسے خطا تسلیم کرے[1]۔ یہ اعتراض ضرور قائم تھا کہ مفاد عامہ کی بنا پر معزز برطرفی بھی جائز و درست ہے مگر آخری صدی کے اختتام کے قریب پہلی ہی رائے کو زیادہ وسعت حاصل ہوتی جاتی تھی، اور بہت سے جدید نظامہائے سلطنت میں اس اصول کی نسبت بالاعلان یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ یہ آزادی کی ترقی اور خودمختارانہ حکومت کے خلاف ایک ضمانت ہے۔ یہ حالت نہ صرف جرمانیا میں تھی[2 الف] بلکہ زیادہ قریب زمانہ تک سوئٹزرلینڈ میں بھی یہی حالت تھی جہاں عہدے صرف ایک مدت معینہ کیلئے دئے جایا کرتے ہیں۔

اسکے برخلاف انگلستان میں فریقانہ مناقشات نے اس سیاسی احساس کو مدت تک زندہ رکھا کہ عہدے کی خاص غرض سلطنت کا فائدہ ہے افراد کا فائدہ مدنظر نہیں ہے، یہ اصول یہاں تک مسلم ہوگیا ہے کہ سرکردہ سلطنت کو کامل اختیار ہے کہ جس طرح وہ عہدے عطا کر سکتا ہے اسی طرح اُسے واپس بھی لے سکتا ہے۔ ججوں کی آزادی کے تیقن کے خیال سے اُنکی نسبت استثناء قائم کیا گیا تھا۔ ولیم سوم کے عہد میں یہ طے پایا تھا کہ قانون عامہ کے جج حکام اعلیٰ کی مرضی تک کے لئے نہیں بلکہ اطمینان بخش رویے کی بنا پر مقرر کئے جائیں اور پھر بھی اگر اُن سے کوئی ایسی بات سرزد ہو جو اُنکی خوش روئیگی کے خلاف سمجھی جائے تو اُنکے برخاست کرنے نہ کرنیکا فیصلہ صرف بادشاہ اور پارلیمنٹ کے حیطۂ اختیار میں ہو[3]۔ شمالی امریکہ کے ممالک متحدہ کا قانون سلطنت بھی

---

[1] چنانچہ انگلستان میں جو شیرف ایک برس اس عہدے کا کام کر چکتا ہے وہ آئندہ تین برس تک اس عہدے کے قبول کرنے سے آزاد ہے۔

[2] شہنشاہی کی شاہی مجلس کے ارکان کے انتخابی حق بریت کے متعلق باضابطہ یہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ کوئی رکن مجلس شاہی بغیر عدالتی تحقیق کے اور ایسے حکم کے جو اس تحقیق پر مبنی ہو، برطرف نہیں کیا جا سکتا۔

(الف) جرمانیا میں بویریا ہی ایک ملک ہے جس میں صرف معمولی عدالت فوجداری ہی انتظامی عہدہ داروں کو موقوف کر سکتی ہے۔ دوسری سلطنتوں میں برطرفی ایک تادیبی سزا سمجھی جاتی ہے۔ یہی قاعدہ شہنشاہی میں بھی ہے۔

[3] جارج سوم کے وقت تک جج کا عہدہ بادشاہ کے انتقال کے ساتھ ختم ہوجاتا تھا۔

اسی قسم کے اصول پر بنی ہے[۵] فرانس میں بھی قدیم زمانے سے انتظامی عہدہ دار حسب مرضی برطرف کئے جاسکتے اور کہیں پندرھویں صدی میں آکر جج ناقابل برطرفی قرار پائے گئے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ فرانس تک میں انقلابی وقتوں کے سوا عہدہ داروں کو ایک مناسب حد تک اپنی جگہ کی طرف سے اطمینان حاصل ہے۔

جرمانی طریق میں شخصی حقوق کی اہمیت میں مبالغہ ضرور کیا گیا ہے لیکن اگر اس مبالغے سے قطع نظر کر کے اور قانون سلطنت کے نقطۂ خیال کا پورا لحاظ کر کے دیکھئے تو دوسری آئینی سلطنتوں کے خود رایانہ طریق عمل پر جرمانی طریق کی برتری ثابت ہوتی ہے؛ نہ صرف اسلئے کہ اس سے سلطنت کے ملازم کی شخصی ہستی محفوظ ہو جاتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس سے سلطنت کا نظام عضوی فریقانہ ہنگامہ آرائیوں اور اضطراری پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے تہلکوں سے بچا رہتا ہے۔

بہر نوع ہر حالت میں یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ عہدے کا قیام سلطنت کی ضرورت سے ہوتا ہے اور اس لئے سلطنت مفاد عامہ کے لحاظ سے کسی عہدہ دار کو برطرف یا تبدیل کر سکتی ہے۔ یہ دونوں حقوق لازمی طور پر ایک ہی شخص سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی شک کی حالت میں ان کا تعلق سرتاج سلطنت سے ہوتا ہے۔ عہدے سے علٰحدگی کے نتائج جہاں تک شخصی حالت کے بجائے سیاسی حالات سے تعلق رکھتے ہیں وہاں تک اس اصول کو اُن سلطنتوں میں بھی تسلیم کرنا چاہئے جن میں برطرفی کا اختیار صرف عدالت قانونی کو ہوتا ہے[۶]

ان قواعد کی حدبندی کی دو شقیں ہو سکتی ہیں: (۱) ایک ججوں کی آزادی کے متعلق

---

۵ ۱۷۸۹ء کے قانون کے بموجب شمالی امریکہ کے ممالک متحدہ میں عہدہ داروں کے برطرف کرنیکا اختیار صرف رئیس جمہوریہ کو تھا حالانکہ اُسکا تقرر مجلس اعلیٰ کی اتفاق رائے کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ایک بے جوڑ بات تھی مگر ۱۸۶۷ء تک اس میں ترمیم نہیں ہوئی۔

۶ لیکن بعض سلطنتیں ایسی بھی ہیں جو اس اصول کو تسلیم نہیں کرتیں بلکہ وہ یہانتک بڑھی ہوئی ہیں کہ ایک خاص مدت تک کیلئے سرکاری وجوہ سے عہدے کو ناقابل تنسیخ قرار دیتی ہیں۔

اور (۲) دوسری خود کارکنوں کے مفاد کے متعلق۔ زمانۂ حال میں یہ اصول عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ جج نہ تو موقوف کئے جا سکتے ہیں اور نہ ان کی مرضی کے خلاف انکا تبادلہ ہو سکتا ہے۔ اور بغیر پوری تنخواہ کی برقراری کے وہ کنارہ کشی پر مجبور نہیں کئے جا سکتے۔ انگلستان میں جج صرف پارلیمنٹ کے حکم سے علیحدہ کئے جا سکتے ہیں اور جرمانیا میں عدالتی فیصلے کی رو سے ؎

دوسری قسم کی حد بندی کے متعلق مختلف حالات میں فرق کرنا چاہئے۔ کسی عہدہ دار کے علیحدہ کرنیکے اسباب حسب ذیل ہو سکتے ہیں۔

(الف) کوئی جرم ایسا سرزد ہو جس سے اخلاقاً وہ عہدے کے ناقابل ثابت ہو۔

(ب) کوئی حقیقی جرم نہ سرزد ہو مگر ایسی غفلت، بزدلی یا کوئی اور اخلاقی خطا ظاہر ہوئی ہو جو عہدہ دار کو عہدے کے ناقابل ثابت کرے۔

(ج) دماغی ناقابلیت مثلاً حافظے کا جاتا رہنا، دیوانگی وغیرہ۔

(د) خارجی اسباب ایسے پیدا ہو جائیں جن کو عہدہ دار کی ذات سے واسطہ نہ ہو مگر جن سے اسکی کارگزاری کی قوت میں فتور پڑ جائے یا جن سے وہ عوام کے اعتماد سے محروم ہو جائے اضطرابی زمانے میں یا غیر ملکی پیچیدگیوں کے باعث ایسے عہدہ داروں کے متعلق بھی یہ صورت پیش آسکتی ہے جنھوں نے نہ صرف اپنا فرض ادا کیا ہو بلکہ جن کو یہ دشواری صرف اسی وجہ سے پیش آئی ہو کہ انھوں نے اپنا فرض ادا کیا۔ چنانچہ وزیر اشٹائن، نپولین اول کے خوش کرنیکے لئے برطرف کر دیا گیا تھا۔

ان تمام صورتوں میں سلطنت کے پاس ایسے ذرائع ہونا چاہئیں جن سے وہ عہدہ داروں کو علیحدہ کرکے خود کو نقصان سے بچا سکے۔ اس میں سے صرف پہلی صورت (الف) میں قانونی عدالتیں اپنے معمولی طریق کارروائی سے فیصلہ کرنیکے لئے موزوں ہو سکتی ہیں۔

---

؎ بویریا کے نظام سلطنت میں یہ قرار پایا ہے کہ جج بغیر عدالتی فیصلے کے اپنی تنخواہ سے محروم کرکے اپنے عہدے سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ بلجیم کے نظام سلطنت کی دفعہ ۱۰۰ حسب ذیل ہے۔ "ججوں کا تقرر با دام الحیات ہوتا ہے کوئی جج عدالتی فیصلے کے بغیر نہ اپنی جگہ سے محروم کیا جا سکتا اور نہ معطل کیا جا سکتا ہے۔ کسی جج کا تبادلہ نئی نامزدگی اور اسکی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔"

عدالتی طور پر برطرف کئے جانے سے لقب، عہدہ، تنخواہ، حق وظیفہ سب زائل ہو جاتا ہے۔

دوسری صورت (ب) میں معمولی عدالتوں میں معاملات کے پیش کرنے سے یہ بہتر ہے کہ خود محکمہ کی طرف سے تادیبی کارروائی کیجائے، مگر اس حالت میں عہدہ دار کو ہمیشہ اس امر کا موقع حاصل رہنا چاہئے کہ وہ اپنی حفاظت کر سکے۔ اُسکے قصور کے سخت یا خفیف ہونیکے اعتبار سے یہ ہوسکتا ہے کہ اُسکی موقوفی کے ساتھ اسکی تنخواہ کا تمام حق زائل ہو جائے مگر اُسکے بقیہ سیاسی حقوق کو نقصان نہ پہنچے بلکہ وہ مناسب وظیفہ دیکر کنارہ کشی پر مجبور کیا جائے، یہ ظاہر ہے کہ آخر الذکر صورت میں حکومت زیادہ آزادی کے ساتھ کارروائی کر سکتی ہے کیونکہ اس سے عہدہ دار کے شخصی حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

تیسری صورت (ج) میں بالعموم عہدہ دار کو کنارہ کشی پر مجبور کرنا درست ہے مگر اسکی برطرفی روا نہیں کیونکہ اس میں خود عہدہ دار کا کوئی قصور نہیں ہے۔

چوتھی صورت (د) کی تدبیر یہ ہوسکتی ہے کہ یا تو عہدہ دار جبراً کنارہ کشی پر مجبور کیا جائے، یا اُسی نوعیت، اعزاز اور آمدنی کی دوسری جگہ پر تبدیل کر دیا جائے۔ یہ دونوں آخری صورتیں حکومت کے سب سے اعلیٰ صاحب اقتدار کے روبرو پیش ہونا چاہئیں اور جس صورت میں کہ تقرر، سرتاج سلطنت کی طرف سے ہوتا ہو اُس صورت میں برطرفی کے لئے بھی اُسکی منظوری اور حکم کی ضرورت ہو۔

بعض بعض سلطنتوں میں اب بھی بغیر کسی وجہ کے بیان کئے ہوئے اور بغیر اسکے کہ عہدہ دار کو مدافعت کا موقع دیا جائے، خود رایانہ طور پر برطرفی عمل میں آتی ہے مگر یہ دستور ایک منتظم حالت کے موافق نہیں ہے۔

۵۔ تعطّل

عارضی تعطّل سزا کے طور پر یا احتیاط کی نظر سے عمل میں آسکتا ہے، اول الذکر صورت میں حکم یا تو قانونی عدالت سے ہونا چاہئے یا تادیبی طور پر کسی بااختیار اعلیٰ عہدہ دار کی جانب سے ہونا چاہئے۔ اس صورت میں بالعموم زمانۂ تعطل میں یا تو کل تنخواہ ضبط ہو جاتی ہے یا اُس میں کمی کر دیجاتی ہے۔

بعض صورتوں کے لئے مثلاً جرمانہ الزام کی حالت میں از روئے قانون ایک عارضی کارروائی کے طور پر تعطّل کے شرائط پہلے سے معین کئے جاسکتے ہیں لیکن کسی

غیر بہبود لعزیزِ عہدہ دار کو اسکی پیدا کردہ شورش سے بچانیکے لئے بھی حکام بالادست اس طریق سے کام لے سکتے ہیں۔ معطلی جب تک سزا کے طور پر نہ ہو اُس سے شخصی حقوق زائل نہیں ہوتے۔ عہدہ دار کو اُسکی آمدنی کا وہ حصہ جو شخصی نوعیت رکھتا ہو، ملتا رہیگا۔ بالخصوص اُسکا گزارہ۔ اگر کسی مجرمانہ الزام پر وہ معطل کیا جائے تو بھی اس کے یہ شخصی حقوق قائم رہیں گے مگر عدالت یہ حکم دے سکتی ہے کہ بطور ضمانت کے اُسکی تنخواہ روک دیجائے تاکہ اگر اُس پر جرمانہ ہو یا اُسپر کوئی تاوان عائد کیا جائے تو تنخواہ سے اُسکی ادائی ہو سکے مگر جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے اُسکا آئندہ کی تنخواہ کا حق ختم نہیں ہوتا۔

تتمہ
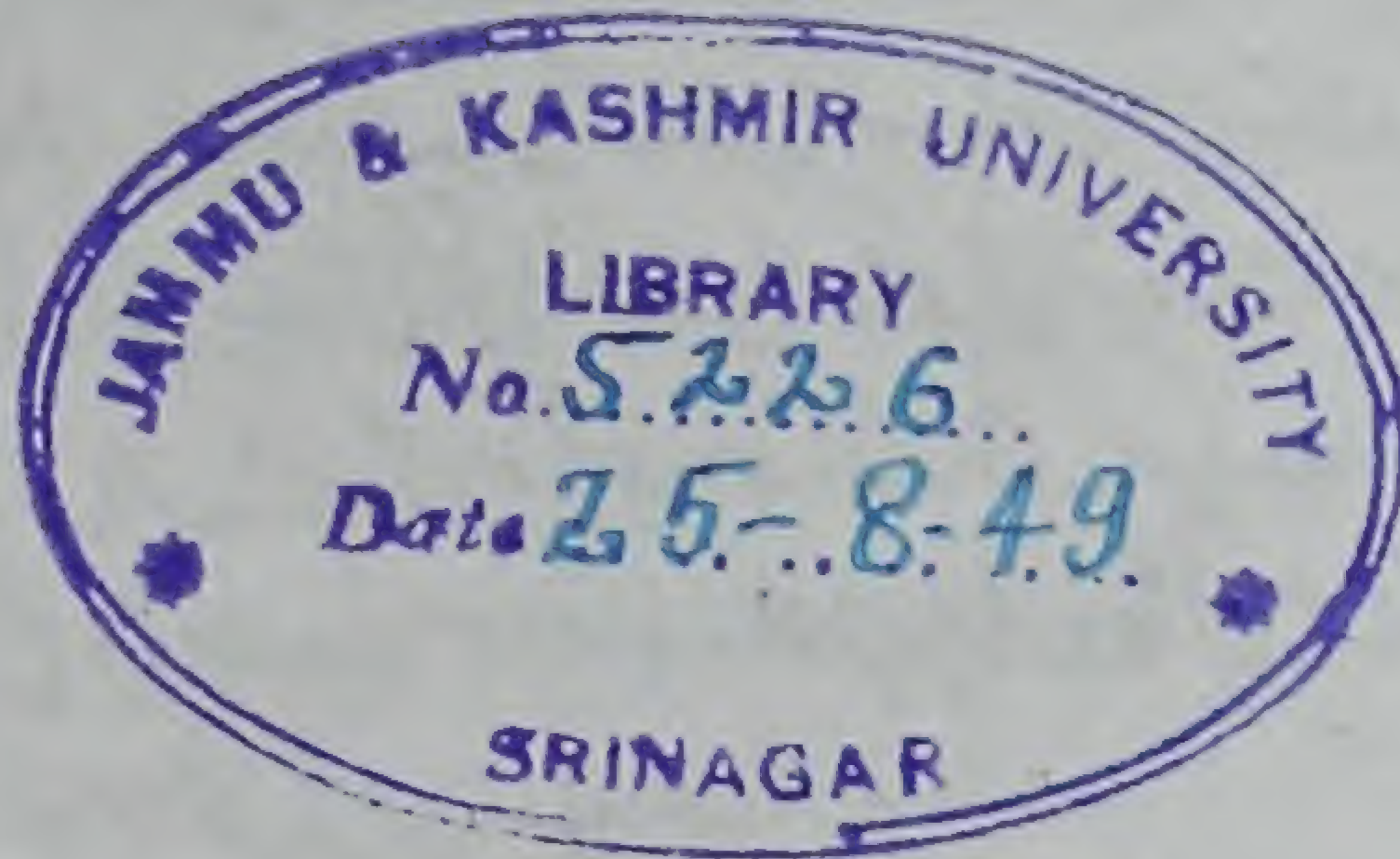
# صحت نامہ نظریۂ سلطنت

| صفحہ | سطر | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|
| ۱ | ۲ | ۳ | ۴ |
| ۳۰ | ۱۴ | قوقیت | فوقیت |
| ؍؍ | ۲۰ | سپہ سالار | سپہ سالار |
| ۳۵ | ۱۷ | قوت کو خود کو | قوت خود کو |
| ۳۷ | ۱۳ | معدلت فرض | معدلت کا فرض |
| ۴۵ | ۷ | جزیات | جزئیات |
| ؍؍ | ۲۴ | رومیوں نے قانون | رومیوں کے قانون |
| ۵۲ | ۲۱ | اعتقدات | (معتقدات) |
| ۶۸ | ۱۸ | انستاں | انسان |
| ۷۱ | ۲۵ حاشیہ | قانونی | قانون |
| ۷۸ | ۲۱ | سنہ ۵۳۰-۱۵۵۱ | سنہ ۵۳-۱۵۵۱ |
| ۸۳ | ۱۱ | یورپینوں | یورپینوں |
| ۹۰ | ۱۲ | قلسطین | فلسطین |
| ۱۲۸ | ۲۴ حاشیہ | قانونی ملکی | قانون ملکی |
| ۱۲۹ | ۷ | علامتیں | علامات |
| ؍؍ | ۱۱ | بنیاد تھے | بنیاد ہیں |
| ۱۳۰ | ۳ | طبقہ تھا | طبقہ ہے |
| ۱۳۰ | ۱۳ | کرتا تھا | کرتا ہے |
| ؍؍ | ؍؍ | کہتے تھے | کہتے ہیں |

| صفحہ | سطر | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|
| ۱ | ۲ | ۳ | ۴ |
| ۱۳۰ | ۱۶ | نہیں ہوتے تھے | نہیں ہوتے |
| ؍؍ | ؍؍ | کم ہوتی تھی | کم ہوتی ہے |
| ؍؍ | ۱۷ | دستکاری تھی | دستکاری ہے |
| ؍؍ | ۱۸ | داخل ہو جاتے تھے | داخل ہو جاتے ہیں |
| ؍؍ | ۲۴ | تاریح | تاریخ |
| ۱۳۶ | حاشیہ متن | × | اصلاح |
| ۱۳۷ | ۴ | ۲۰ منیں | ۲۰ بیس |
| ؍؍ | ۲۵ | ملکتی | مملکتی |
| ۱۳۸ | ۱ | کی نسبت | کے بہ نسبت |
| ؍؍ | ۸ | کی نہیں | کی تھیں |
| ؍؍ | حاشیہ سطر ۲ | روھانی | روحانی |
| ۱۳۹ | ۴ | امرا | امرار |
| ؍؍ | ۵ | طفہ | طبقہ |
| ۱۳۹ | ۱۵ | حاصل کی ہوتی | حاصل کی ہے |
| ؍؍ | ۱۶ | جمہوری دور میں | اور جمہوری دور میں |
| ۱۴۰ | ۱ | Prineipate | Principate |
| ۱۴۱ | ۲۰ | روسا | رؤسا |
| ۱۴۲ | ۸ | مقابلے میں ٹیوٹنی | مقابلے میں ٹیوٹنی |

| صفحہ | سطر | غلط | صحیح | صفحہ | سطر | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ١ | ٢ | ٣ | ۴ | ١ | ٢ | ٣ | ۴ |
| ١۴٢ | حاشیہ متن | ٩٨٧ — ٢٢ | ٩٨٧ — ١٢٢٦ھ | ١٩٦ | ١٠ | دواسار | دواساز |
| " | ٢١ | تسلیم کرنا پڑا | تسلیم کرنا پڑا | ٢٠٢ | ١٧ | کے لازمی | کے لئے لازمی |
| " | حاشیہ سطر ٢ | Gnizot | Guizot | ٢٢۵ | ١١ | وجود | وجوہ |
| " | حاشیہ سطر | Frauce | France | ٢٣٢ | ١٩ | جبس | جسم |
| ١۴٦ | ١۴ | نہری چہارم | ہنری چہارم | ٢۴٠ | ٢٢ | دوک | روک |
| ١۵١ | ٣٠ | گرچہ | اگرچہ | ٢۴٨ | ١۵ | حداولی | حدادنی |
| ١۵٣ | ٨ | جوماٹیا | جرمانیا | ٢٦٢ | ١٦ | متداعوبہ | متدعویہ |
| ١۵۴ | ١٨ | وارثتنا | ورانتنا | ٢٧٣ | ١٠ | رنیتوں | زیتون |
| ١۵٧ | ١۵ | صورتہبائے | صورتہائے | ٢٧٨ | ٢٣ | محزوج | ممزوج |
| ١٦١ | ۵ | یادریوں | پادریوں | ٢٨٠ | ٣ | اعضا | اعضائے کار |
| ١٦١ | ١٢ | اشوالتس | اشوائتس | " | ١۵ | سویز | سوئیزر |
| " | ١٣ | اشولتسی | اشوائتسی | ٢٩٨ | ٧ | مرسنی | مرضی |
| ١٦٢ | ٢٠ | آزاواد | آزادانہ | ٣٠۴ | ٣ | چاپا | چاہا |
| ١٦٣ | ١٧ | آتا | آنا | ٣١٦ | ٢ | ہوسیوقودے | ہوسیو فوئے |
| ١٦۴ | ٧ | مشترکیات | حلقی مشترکیات | ٣٣٣ | ١٠ | دل ہیلم | ولہیلم |
| ١٦٦ | ١٩ | ہابس برگ | ہابس برگ کے | ٣٣٩ | | جھولی | چھوٹی |
| ١٦٨ | ۵/١١/١٢٢ | اعالیا | اطالیا | " | " | انے | جانے |
| ١٦٩ | ٢٣ | غلاقوں | علاقوں | ٣۴٣ | ١٦ | واضع | × |
| ١٨۴ | ١۴ | نئی | ہی | ٣۵٩ | ١٨ | مداثت | مداثت |
| ١٨۵ | ٢۴ | شماکی | شمالی | ٣٦٩ | ٩ | گردبیاں | گروبی |
| ١٩۵ | ٨ | زیادوتر | زیادہ تر | ٣٧٦ | ١٧ | نہیں | تھیں |

| صفحہ | سطر | غلط | صحیح | صفحہ | سطر | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ١ | ٢ | ٣ | ۴ | ١ | ٢ | ٣ | ۴ |
| ٣٨٨ | ٢٢ | تسہنشاہوں | شہنشاہوں | ۵٠٦ | ٦ | گیرکی | گیرکے کی |
| ٣٩۵ | ١۴ | اسافقہ | اسأقفہ | ۵٠٨ | ١٢ | ملت - | قوم |
| " | ٦ | صوامعہ | صوامع | " | ١٣ | میں قوم | × |
| ۴٠٨ | ١٩ | نہیں | میں | ۵١٠ | ٦ | commentarjas | commentaries |
| ۴٢۵ | ٨ | مطتق | مطلق | ۵١٢ | " | داعل | داخل |
| ۴٣٢ | ١٦ | دائینا | وائنیا | ۵١٣ | حاشیہ سطر ٢ | ہونیکے | ہونے کے |
| ۴٣٣ | ١٢ | ہے | ہیے | " | " ۴ | خواہ | دل خواہ |
| ۴۴٦ | ٢١ | دو | وہ | ۵٢۵ | ١٣ | Inperium | Imperium |
| ۴۵۴ | ١٧ | انھوں سیاسی | انھوں نے سیاسی | ۵٢٧ | حاشیہ سطر ١ | Espoit | Esprit |
| ۴٦٦ | ٧ | رہتا ہے | رہنا ہے | ۵٢٨ | ۵ | کہ | کہ اس کے |
| ۴٧٦ | ١٢ | نہ رکھ سکتے | نہ رکھ سکے | " | ٩ | توحد | وحدت |
| ۴٨٠ | ٢۵ | بیکسن ہی قوم ہی | سیگسن قوم ہی | ۵٢٩ | حاشیہ سطر ١ | مونٹسکو | مونٹیسکیو |
| ۴٨٨ | ١۵ | قوی مؤتمر | قومی مؤتمر | ۵٣١ | حاشیہ جدول | اصطلاح | اصلاح |
| ۴٩٧ | ١۴ | مولڈیویہ | مولڈیویا | ۵٣١ | " | بیشر | بیشتر |
| ۴٩٩ | ۴ | پروشی | پروسی | ۵٣٧ | " | × | عہدہ داروں کے مددگار |
| ۵٠٠ | ١ | پروشیا | پروسیا | " | ١٣ و ١۴ | اور اور | اور |
| " | ١١ | مستثنٰی | مستثنیٰ | " | حاشیہ جدول | × | مواجبہ |
| " | حاشیہ سطر ١ | تیرس | تبیرس | ۵۴٢ | ۴ | پروشیا | پروسیا |
| ۵٠٣ | ١ | und | and | ۵۴٣ | ١٣ | کے | کا |
| " | | Statgewalt | Statsgewalt | ۵۴۴ | ٣ | اگر | اگرچہ |
| ۵٠٦ | حاشیہ سطر ١ | لاٴتینس | لاتنیس | " | ٢٢ | Pragmatis | Pragmatic |

| صفحہ | سطر | غلط | صحیح | صفحہ | سطر | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | ۲ | ۳ | ۴ | ۱ | ۲ | ۳ | ۴ |
| ۵۵۴ | ۱۳ | مختلف یا لرائے | مختلف الرائے | ۵۵۸ | ۱۳ | کر دیے | کر دینے |
| ۵۵۷ | ۵ | خھیف | خفیف | ۰ | ۰ | ۰ | ۰ |